سورۂ براءۃ

آیاتہا ۱۲۹ ۹ سورۃ التوبۃ مدنیۃ ۱۱۳ رکوعاتہا ۱۶

یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

" یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا مشرکوں میں سے "۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ پہلا مسئلہ اس کے اسماء کے بارے میں ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورت براءت کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ فاضحہ (برائیاں ظاہر کرنے والی ہے) (حکم) مسلسل نازل ہوتا رہا کچھ ان کے بارے اور کچھ ان کے بارے، یہاں تک کہ ہم ڈرنے لگے کہ یہ کسی ایک کو نہیں چھوڑے گی (1)۔ ابونصر عبدالرحیم قشیری نے کہا: یہ سورت غزوہ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے بعد نازل ہوئی، اور اس کی ابتدا میں کفار کا ان کے ساتھ معاہدوں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ اور اس سورت میں منافقین کے مخفی اور پوشیدہ رازوں کو کھولا گیا ہے۔ اور اس کا نام الفاضحہ اور البحوثہ رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ منافقین کے رازوں کے بارے بحث کرتی ہے۔ اور اس کا نام مبعثرہ اور بعثرہ بھی ہے اور اس کا معنی بھی البحث ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے اس سورت کے اوّل سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ساقط ہونے کے سبب میں اختلاف کیا ہے اس بارے میں پانچ اقوال ہیں۔ (۱) یہ کہا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب ان کے درمیان اور کسی دوسری قوم کے درمیان معاہدہ ہوتا تو جب وہ اسے توڑنے کا ارادہ کرتے تو ان کی طرف ایک تحریر لکھتے اور اس میں بسم اللہ نہ لکھتے تھے۔ پس جب اس معاہدہ کو توڑنے کے بارے میں سورت براءت نازل ہوئی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس کے ساتھ بھیجا اور آپ نے حج کے دنوں میں یہ سورت ان پر جا کر پڑھی اور اس میں بِسْمِ اللّٰهِ نہ پڑھی گئی اس بنا پر کہ عہد توڑنے کی صورت میں بسم اللہ ترک کرنا ان کی عادت جاریہ تھی۔

اور دوسرا قول یہ ہے: امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا انہوں نے کہا ہمیں محمد بن المثنی نے یحییٰ بن سعید سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عوف نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں یزید الرقاشی نے بیان کیا ہے انہوں

1۔ تفسیر ابن عباس، سورۂ توبہ، جلد 1، صفحہ 449

نے کہا ہمیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: تمہیں کس شے نے اس طرف برانگیختہ کیا کہ تم نے ''الانفال'' کا اور یہ مثانی میں سے ہے۔ اور براءت کا قصد کیا ہے اور یہ مئین میں سے ہے اور تم نے ان دونوں کو ملا دیا ہے اور تم نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی سطر نہیں لکھی اور تم نے اسے سات طویل سورتوں میں رکھا ہے۔ پس تمہیں کس شے نے اس پر ابھارا ہے؟ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی شے (آیت) نازل ہوتی تو آپ اپنے پاس کاتبین وحی میں سے کسی کو بلاتے اور فرماتے: ''اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں جگہ پر رکھو (یعنی لکھ دو)'' اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیات نازل ہوتیں تو آپ فرماتے: ''ان آیات کو اس سورت میں لکھ دو جس میں اس طرح کا ذکر کیا جاتا ہے'' (1)۔

اور ''انفال'' پہلے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے اور ''براءت'' آخر قرآن میں سے ہے اور اس کا قصہ اس کے قصہ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہو گیا اور ابھی آپ نے ہمارے لیے یہ وضاحت نہ کی تھی کہ یہ اس میں سے ہے تو میں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ (براءت) اس (الانفال) میں سے ہے۔ پس اسی وجہ سے ان دونوں کو ملا دیا گیا ہے اور ان کے درمیان بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی سطر نہیں لکھی گئی۔ اسے ابوعیسیٰ ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے: اور یہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں کہا ہے جسے ابن وہب، ابن قاسم اور ابن عبدالحکم نے روایت کیا ہے کہ جب اس کا اوّل حصہ ساقط ہوا تو اس کے ساتھ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بھی ساقط ہو گئی۔ اور اسے ابن عجلان سے روایت کیا گیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ سورۃ براءۃ، سورۂ بقرہ کے برابر تھی یا اس کے قریب تھی۔ پس اس میں سے کچھ حصہ ختم ہو گیا، پس اس وجہ سے ان دونوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (2) نہیں لکھی گئی۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: یہ سورۂ بقرہ کی مثل تھی۔

اور چوتھا قول ہے: یہ خارجہ اور ابوعصمہ وغیرہما نے کہا ہے۔ انہوں نے کہا: جب انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصحف لکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں اختلاف ہوا، ان میں سے بعض نے کہا: سورۂ براءت اور الانفال ایک سورت ہے۔ اور بعض نے کہا: یہ دو سورتیں ہیں۔ پس ان دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا گیا ان کے قول کے مطابق جنہوں نے کہا کہ یہ دو سورتیں ہیں۔ اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ چھوڑ دی گئی ان کے قول کے مطابق جنہوں نے کہا: یہ دونوں ایک سورت ہے۔ پس دونوں فریق ایک ساتھ راضی ہو گئے اور دونوں کی حجت مصحف میں ثابت ہو گئی۔

اور پانچواں قول یہ ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: سورت براءت میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کیوں نہیں لکھی گئی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ امان ہے۔ اور سورت براءت تلوار کے ساتھ نازل ہوئی اس میں امان نہیں ہے۔ اور مبرد سے اس کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ ایضاً، حدیث نمبر 3011، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابی داؤد، باب من جهر بها، حدیث نمبر 668، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 891

انہوں نے کہا: اسی لیے ان دونوں کو جمع نہیں کیا گیا کیونکہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ رحمت ہے اور سورت براءت ناراضگی کے ساتھ نازل ہوئی۔ اور اس کی مثل سفیان سے بھی مروی ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: اس سورت کی ابتداء میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ نہیں لکھی گئی کیونکہ تسمیہ رحمت ہے اور رحمت امان ہے اور یہ سورت منافقین کے بارے میں اور تلوار کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اور منافقین کے لیے امان نہیں ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس کے شروع میں تسمیہ نہیں لکھا گیا، کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سورت میں تسمیہ کے ساتھ نازل ہی نہیں ہوئے۔ یہ علامہ قشیری نے کہا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور آپ نے ہمارے لیے یہ بیان نہیں فرمایا کہ یہ اس میں سے ہے، یہ اس پر دلیل ہے کہ تمام سورتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور آپ کے بیان کے ساتھ مرتب ہوئیں اور یہ کہ اکیلے براءت کو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سورۂ انفال کے ساتھ ملایا گیا۔ اس لیے کہ اس بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے سے پہلے ہی موت آپ کو جلدی آ گئی۔ اور ان دونوں کو قرینتین پکارا جاتا ہے، پس واجب ہے کہ ان دونوں کو جمع کیا جائے اور ان میں سے ایک کو دوسری کے ساتھ ملایا جائے، اس وصف اقتران کی وجہ سے جو ان دونوں کو لازم تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باحیات تھے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (1) نے کہا ہے: یہ اس پر دلیل ہے کہ قیاس دین میں اصل (اور حجت) ہے، کیا آپ حضرت عثمان اور مقتدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف دیکھ نہیں رہے کہ انہوں نے نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس الشبہ کی طرف کیسے پناہ لی اور انہوں نے دیکھا کہ "براءت" کا قصہ "الانفال" کے قصہ کے مشابہ ہے پس انہوں نے اسے اس کے ساتھ ملا دیا؟ تو جب اللہ تعالیٰ نے تالیف قرآن میں دخول قیاس کو بیان کر دیا ہے تو دیگر تمام احکام میں تیرا کیا خیال ہے (یعنی قیاس حجت شرعیہ تسلیم کیا جائے گا)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: بَرَآءَةٌ آپ کہتے ہیں: برئت من الشیٔ ابرأ براءۃ فأنا منہ بریٔ جب تو اپنی ذات سے کسی شے کو زائل کر دے اور تیرے اور اس کے درمیان جو سبب ہے اسے قطع کر دے۔ اور بَرَآءَةٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے ھذہ براءۃ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسے مبتدا ہونے کے سبب رفع دیا جائے اور خبر قول باری تعالیٰ الی الذین میں ہو۔ اور نکرہ کو مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ یہ نکرہ موصوفہ ہے اور یہ من وجہ معرفہ ہو چکا ہے لہٰذا اسے اخبار عنہ بنانا جائز ہے۔ اور عیسیٰ بن عمر نے براءۃ نصب کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے التزموا براءۃ پس اس میں اغراء کا معنی پایا گیا۔ اور یہ فعالۃ کے وزن پر مصدر ہے، جیسا کہ شناءۃ اور دناءۃ مصدر ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ یعنی ان لوگوں کے ساتھ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کیا تھا، کیونکہ آپ عقد کرنے کے والی اور عقار تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام اس کے ساتھ راضی تھے، تو گویا انہوں نے باہمی عقد اور معاہدہ کیا پس یہ عقد ان کی طرف منسوب ہوا۔ اور اسی طرح کفار کے ائمہ اپنی قوم کی طرف سے جو معاہدہ کریں گے وہ ان کی طرف منسوب ہوگا وہ تمام کو شامل ہوگا اور اس کے ساتھ ان کا مواخذہ کیا جائے گا، جب کہ اس کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 893

سوا کچھ ممکن نہیں، کیونکہ تمام سے رضامندی حاصل کرنا متعذر رہے (1)، پس جب امام وقت کسی ایسے امر کے بارے معاہدہ کر لے جس میں وہ مصلحت دیکھتا ہے تو وہ تمام رعایا پر لازم ہو جائے گا (اور اس کی پابندی تمام پر لازم ہوگی)

فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝

"(اے مشرکو!) پس چل پھر لو ملک میں چار ماہ اور جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَسِيْحُوْا یہ خبر سے خطاب کی طرف رجوع ہے، ای قل لھم سیحوا تم ان مشرکوں سے کہہ دو تم زمین میں چل پھر لو درآنحالیکہ تم آتے جاتے رہو، محفوظ و مامون ہو تمہیں مسلمانوں میں سے کسی سے جنگ، مال چھیننے، قتل کرنے اور قید کرنے کا کوئی خوف نہیں۔ کہا جاتا ہے: ساح فلان فی الأرض یسیح سیاحۃ و سیوحا و سیحانا (فلاں نے زمین میں سیر کی) اور اسی سے السیح فی الماء الجاری المنبسط (پھیلے ہوئے جاری پانی میں تیرنا) ہے۔ اور اس معنی میں طرفہ بن عبد کا قول ہے:

لو خفتُ ھذا منك ما نِلْتَنِي　　حتى ترى خیلا أمامی تَسِیحُ

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے تاجیل اور مہلت کی کیفیت میں اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں (اختلاف کیا ہے) جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع تعلق کا اعلان کیا ہے۔ پس محمد بن اسحاق وغیرہ نے کہا ہے: یہ مشرکین کی دو قسمیں ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جن کے معاہدہ کی مدت چار ماہ سے کم تھی پس انہیں چار ماہ مکمل کرنے کی مہلت دی گئی اور دوسری وہ ہے جن کے معاہدہ کی کوئی معین اور محدود مدت نہ تھی پس اسے چار ماہ میں محصور کر دیا تاکہ وہ اپنے آپ کو پابند کر لیں۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی طرف سے اعلان جنگ ہے، جہاں کوئی پایا گیا وہیں قتل کر دیا جائے گا اور قیدی بنا لیا جائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔ اور اس مدت کی ابتداء حج اکبر کے دن سے ہے اور اس کا اختتام دس ربیع الآخر کو ہوگا۔ اور رہے وہ جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تو ان کی مدت چار اشہر حرام کے گزرنے تک ہے۔ اور وہ پچاس دن ہیں: بیس ذوالحجہ اور محرم میں سے ہیں۔

اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ چار مہینے ان کے لیے تھے جن کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ چار ماہ سے کم تھا اور جن کا معاہدہ چار مہینوں سے زیادہ تھا تو وہ وہ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ (توبہ: 4) کے ساتھ حکم فرمایا کہ ان کا عہد مکمل کیا جائے۔ اور یہی موقف علامہ طبری وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔

محمد بن اسحاق اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اہل مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال قریش کے ساتھ صلح کی، اس شرط پر کہ دس سال تک جنگ نہیں ہوگی، اس عرصہ میں لوگ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 893

پر امن رہیں گے۔ اور ایک دوسرے پر (حملہ وغیرہ کرنے) سے باز رہیں گے۔ پس بنو خذاعہ رسول اللہ ﷺ کے معاہدہ میں داخل ہو کر آپ کے حلیف ہو گئے اور بنو بکر قریش کے عہد میں داخل ہو کر ان کے حلیف بن گئے، پھر بنو بکر نے خزاعہ پر زیادتی کی اور انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا۔ اور اس کا سبب وہ دم تھا جو بنی بکر کا اسلام سے کچھ مدت پہلے خزاعہ پر لازم ہوا تھا (یعنی خزاعہ نے ان کا آدمی قتل کیا تھا اور اس کا بدلہ ابھی باقی تھا) پس جب حدیبیہ کے مقام پر صلح واقع ہو گئی، تو لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پر امن ہو گئے، تو بنو بکر میں سے بنو دیل نے اسے غنیمت جانا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا دم واجب تھا۔

یعنی انہوں نے اس فرصت اور خزاعہ کی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بنی اسود بن رزن کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور یہی وہ ہیں جنہیں خزاعہ نے قتل کیا تھا، پس نوفل بن معاویہ الدیلی ان لوگوں کے ہمراہ نکلا جنہوں نے بنی بکر بن عبد منات میں سے ان کی اتباع و پیروی کی (اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوئے) یہاں تک کہ انہوں نے رات کے وقت خزاعہ پر حملہ کر دیا اور وہ قتل ہو گئے اور قریش نے ہتھیاروں کے ساتھ بنی بکر کی معاونت کی اور قریش کی ایک جماعت نے تو بنفس نفیس ان کی مدد کی، پس خزاعہ نے شکست خوردہ حالت میں حرم میں پناہ لی جیسا کہ یہ مشہور واقعہ لکھا ہوا ہے۔ پس یہ اس صلح کو توڑنا ہے جو حدیبیہ میں واقع ہوئی تھی، چنانچہ عمرو بن سالم، بدیل بن ورقاء الخزاعی اور بنی خزاعہ کی ایک جماعت یہ سب لوگ رسول اللہ ﷺ سے مدد طلب کرنے کے لیے اس معاملہ میں جو انہیں بنو بکر اور قریش کی طرف سے پیش آیا۔ اور عمرو بن سالم نے اسے شعر کی صورت میں اس طرح کہا:

یا ربّ إنّي ناشدٌ محمّدا　حِلفَ أبينا وأبيه الأتْلدا

اے میرے رب میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اپنے اور ان عظیم آباء و اجداد کے درمیان قائم معاہدہ کو یاد دلاتا ہوں۔

كنتَ لنا أبًا و كنّا وَلَدًا　ثُمّتَ أسلمنا ولم ننزِعْ يَدًا

آپ ہمارے لیے باپ ہیں اور ہم اولاد ہیں پھر ہم نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا ہاتھ نہیں کھینچا۔

فانصرْ هداكَ الله نصرًا عَتَدًا　وادْعُ عبادَ الله يأتوا مَدَدًا

اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی فرمائے آپ فوراً مدد فرمائیے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو بلائیے کہ وہ مدد کو آئیں۔

فيهم رسولُ الله قد تجرّدا　أبيضُ مثلَ الشمس ينمُو صُعُدًا

ان (لشکر) میں رسول اللہ ﷺ ہوں جو مقام و مرتبہ میں منفرد اور یکتا ہیں مثل آفتاب روشن ہیں بلندیاں چڑھ رہے ہیں۔

إن سِيمَ خَسْفًا وجهُه تَربّدا　في فَيلَقٍ كالبحر يجري مُزْبِدًا

اگر ان پر زیادتی کی جائے تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے ایسے عظیم لشکر میں جو سمندر کی جھاگ اچھالتے ہوئے چلتا ہے۔

إنّ قريشًا أخلفوك الموعِدًا　و نقضوا ميثاقَك المؤكّدًا

بے شک قریش نے آپ کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے اور انہوں نے آپ کے ساتھ کیا ہوا پختہ وعدہ توڑ دیا ہے۔

وزعموا أن لست تدعو أحدًا وهم أذلّ و أقلّ عددًا

اورانہوں نے یہ گمان کیا کہ آپ کسی کو نہیں بلائیں گے اور وہ خود ذلیل (کمزور) اور تعداد میں تھوڑے ہیں۔

هم بيّتونا بالوتير هُجّدًا وقتلونا رُكّعًا و سُجّدًا

انہوں نے وتیر کے مقام پر رات کے وقت حملہ کیا جب کہ ہم سوئے ہوئے تھے یا نماز پڑھ رہے تھے اور انہوں نے ہمیں رکوع و سجود کرتے ہوئے (اسلام کی حالت میں) قتل کیا۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں غالب نہیں آسکتا اگر میں بنی کعب کی مدد نہیں کرتا''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادل کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''بے شک یہ بھی بنی کعب کی مدد کے لیے رو رہا ہے''۔ بنی کعب سے مراد خزاعہ ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدیل بن ورقاء اور ان کے ساتھیوں کو فرمایا: ''بے شک ابوسفیان عنقریب آئے گا تا کہ معاہدہ کو پختہ کرے اور صلح میں اضافہ کرے اور وہ بغیر مقصد اور حاجت (حاصل کیے) واپس لوٹ جائے گا''۔ قریش نے جو کیا وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہوئے، پس ابوسفیان مدینہ طیبہ کی طرف نکلا تا کہ معاہدہ کو برقرار رکھے اور صلح میں اضافہ کرے، لیکن وہ بغیر حاجت کے لوٹ آیا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ اور آپ کی یہ خبر معروف ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کی تیاری شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتح فرما دیا۔ اور یہ 8 ہجری میں ہوا۔ پس جب ہوازن میں فتح مکہ کی خبر پہنچی تو مالک بن عوف النصری نے انہیں جمع کیا، جیسا کہ غزوۂ حنین کے بارے میں مشہور و معروف ہے۔ اور اس کا کچھ حصہ عنقریب آئے گا۔ اور کافروں کے خلاف مسلمانوں کو فتح و کامرانی اور مدد و نصرت حاصل ہوئی۔ حنین کے دن غزوۂ ہوازن یکم شوال 8 ہجری کو پیش آیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم میں سے اموال اور عورتوں کی تقسیم چھوڑ دی۔ آپ نے اسے تقسیم نہ کیا یہاں تک کہ آپ طائف میں آگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس سے کچھ زائد راتیں ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ اور اس کے سوا بھی کہا گیا ہے اور آپ نے ان کے خلاف منجنیق نصب کی اور ان پر اس کے ساتھ پتھر برسائے، جیسا کہ اس غزوہ میں یہ معروف ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ کی طرف واپس تشریف لائے اور حنین کے مال غنیمت کو وہاں تقسیم فرمایا، جیسا کہ اس کے بارے امر و خبر سب مشہور ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اور الگ الگ ہو گئے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال لوگوں کے لیے حضرت عتاب بن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا۔ اور آپ پہلے امیر ہیں جنہوں نے اسلام میں حج ادا کروایا۔ مشرکوں نے اپنے طریقہ پر حج کیا۔ اور حضرت عتاب بن اسید انتہائی نیکوکار، فضیلت رکھنے والے، متقی، زاہد تھے۔ کعب بن زہیر بن ابی سلمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کی مدح بیان کی اور آپ کے سامنے اپنا وہ قصیدہ پڑھا جس کا آغاز اس طرح ہے:

بانت سعاد فقلبي اليوم متبول

(میری سعاد جدا ہو گئی جس کی وجہ سے آج میرا دل ہلاک ہوا چاہتا ہے) اور اس نے آخر تک یہ قصیدہ کہہ دیا اور اس میں مہاجرین کا ذکر بھی کیا اور ان کی تعریف کی۔ اور اس سے پہلے اس کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ہجو محفوظ تھی۔ پس انصار

نے اس پر نکتہ چینی کی اور اعتراض کیا جب اس نے ان کا ذکر نہ کیا، تو وہ دوسرے دن ایک اور قصیدہ لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں آیا اور اس میں وہ انصار کی مدح کرتا ہے۔ پس اس نے کہا:

من سَرَّہ کرمُ الحیاۃ فلا یزل فی مِقْنَب من صالحی الأنصار

جسے زندگی کی شرافت خوش کرتی ہو تو وہ انصار کی صالح جماعت کے ساتھ رہے۔

وَرِثُوا المکارمَ کابرًا عن کابرٍ إنّ الخیار ھُمُ بنو الأخیار

یہ نسل در نسل بزرگی کے وارث چلے آ رہے ہیں، بہترین لوگ تو صرف بہترین لوگوں کی اولاد ہوتے ہیں۔

المُکْرِھین السَّمھرِیَّ بأذرع کسوافل الھِنْدِی غیرِ قِصار

وہ اپنے ہاتھوں سے سمہری نیزے چلاتے ہیں ہندی تلواروں کی طرح جو لمبی ہیں چھوٹی نہیں۔

والناظرین بأعینٍ محمرّۃ کالجَمْر غیرِ کَلِیلۃ الأبصار

وہ سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہیں گویا وہ آگ کے انگارے ہیں ان کی آنکھیں تھکی ماندی ہیں۔

والبائعین نفوسَھم لنبیّھم للموت یوم تَعانُقٍ و کِرَار

یہ اپنے نبی کی خاطر اپنے نفوس کو موت کے عوض بیچنے والے ہیں اس روز جو لشکروں کے ملنے کا دن ہے اور بار بار حملے کا دن ہے۔

یتطھّرون یرونہ نُسُکاً لھم بدماءِ مَن عَلِقوا من الکفار

یہ پاکیزگی حاصل کرتے ہیں اور اسے اپنی عبادت خیال کرتے ہیں ان کے خونوں سے جنہیں وہ کفار میں سے قتل کرتے ہیں۔

دَرِبوا کما دَرِبت ببطنِ خَفِیّۃ غُلْبُ الرّقابِ من الأسود ضَوارِ

یہ عادی ہو گئے ہیں جس طرح خفیہ وادی میں موٹی گردنوں والے اور چیر پھاڑ کرنے والے شکاری شیر عادی ہو گئے ہیں۔

وإذا حَللت لیمنعوک إلیھمُ أصبحت عند معاقل الأغفار

جب تو ان کے پاس اترے تا کہ وہ تیری حفاظت کریں تو گویا تو پہاڑی بکروں کی پناہ گاہ میں پہنچ گیا ہے۔

ضربوا علیًّا یوم بدرٍ ضربۃً دانت لوقعتھا جمیعُ نِزار

انہوں نے بدر کے دن قریش پر ایسا وار کیا جس کے پڑنے سے قبیلہ نزار کے تمام افراد نے اطاعت اختیار کر لی۔

لو یعلم الأقوامُ عِلمِی کلّہ فیھم لصَدّقنی الذین أماری

اگر لوگ ان کے بارے میں میرے علم جیسا علم رکھیں تو وہ بھی میری تصدیق کریں جو میرے بارے میں شک رکھتے ہیں۔

قومٌ إذا خَوَت النجوم فإنھم للطارقین النازلین مَقارِی

وہ ایسی قوم ہیں جب ستارے غروب ہونے لگیں تو یہ رات کے وقت آنے والے مہمانوں کی خوب میزبانی کرتے ہیں۔

پھر طائف سے واپس لوٹنے کے بعد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحجہ، صفر، ربیع الاول، ربیع الآخر، جمادی الاولی اور جمادی

الآخرہ میں مدینہ طیبہ مقیم رہے، اور رجب 9 ہجری میں مسلمانوں کا لشکر ساتھ لے کر غزوۂ روم، غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے گئے۔ یہی وہ آخری غزوہ ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا پھر فرمایا کہ ''وہ بیت اللہ شریف میں حاضر ہوں ننگے بدن مشرک بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے ہوں تو میں پسند نہیں کرتا کہ میں حج کروں یہاں تک کہ اس طرح نہ ہو'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سورۂ براءت کی ابتدائی چالیس آیات بھیجیں تاکہ آپ انہیں حاجیوں کے سامنے پڑھیں۔ جب وہ چلے گئے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: ''سورۂ براءت کی ابتدا سے اس قصہ کو لے کر جاؤ اور اس کے بارے لوگوں میں اعلان کر دو جب وہ جمع ہوں'' پس حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ناقہ عضباء پر سوار ہو کر نکلے یہاں تک کہ مقام ذوالحلیفہ پر انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پا لیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا: ''أمیر أو مأمور''؟ (کیا امیر ہو یا مامور (تابع) ہو) تو انہوں نے جواب دیا: بلکہ میں تو مامور ہوں، پھر دونوں اٹھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج کے لیے ان مراتب پر کھڑا کیا جن پر وہ دور جاہلیت میں تھے (1)۔ نسائی کی کتاب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم ترویہ (آٹھویں ذی الحجہ کا دن) سے ایک دن قبل لوگوں پر سورت براءت پڑھی یہاں تک کہ اسے ختم کیا۔ (یعنی مکمل سورت براءت پڑھ کر سنائی) اور یوم عرفہ اور یوم نحر (نویں اور دسویں ذی الحجہ کے دن) میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خطبہ ختم ہونے کے بعد تین دنوں میں (اسے پڑھا) اور جب وہاں سے واپس لوٹنے کا پہلا دن تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور انہیں بتایا وہ کیسے واپس چلیں گے اور کیسے رمی کریں گے، آپ انہیں ان کے مناسک سکھاتے رہے۔ پس جب آپ فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں پر پوری سورت براءت پڑھی (2)۔

سلیمان بن موسیٰ نے کہا ہے: جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عرفات میں خطبہ سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: اے علی! اٹھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دو، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور وہ عمل کیا (یعنی سورت براءت پڑھ کر سنائی) فرمایا: میرے دل میں یہ بات آئی کہ تمام لوگ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں حاضر نہیں، چنانچہ میں نے یوم نحر کو خیموں کی تلاش شروع کر دی (اور وہاں جا کر انہیں پیغام پہنچایا)۔ ترمذی نے زید بن یثیع سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کون سی شے کے ساتھ آپ کو حج پر بھیجا گیا؟ تو انہوں نے فرمایا: چار چیزوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے کہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے اور وہ جن کے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین معاہدہ ہے تو وہ اپنی پوری مدت تک ہے اور جن کا کوئی عہد نہیں تو ان کے لیے مدت چار ماہ ہے اور جنت میں سوائے مومن نفس کے کوئی داخل نہ ہوگا اور اس سال کے بعد مسلمان اور مشرک اکٹھے نہ ہوں گے (3)۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور نسائی نے اسے نقل کیا ہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899 2۔ سنن نسائی، کتاب المناسک، جلد 2، صفحہ 42

3۔ جامع ترمذی، کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 106۔ ایضاً، حدیث نمبر 3017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور کہا ہے کہ آپ نے فرمایا: پس میں اعلان کرتا رہا یہاں تک کہ میری آواز بیٹھ گئی۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تا کہ آپ ہر عہد والے کے ساتھ اس کا عہد توڑ دیں۔ اور ان سے یہ عہد لیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا اور اس سال 9 ہجری میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کروایا۔ پھر آئندہ سال حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وہ حج ادا فرمایا جس کے بغیر آپ نے مدینہ طیبہ سے کوئی حج نہیں کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حج ذوالحجہ میں ادا ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک زمانہ گردش کناں ہے'' الحدیث۔ اس کا بیان آیۃ النسیٔ میں آئے گا۔ اور حج یوم قیامت تک ذوالحجہ میں ثابت اور پختہ ہو گیا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے 9 ہجری میں ذوالقعدہ میں حج ادا کیا تھا۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سورت ''براءۃ'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ براءت اس نقض عہد کو متضمن ہے جس کا عقد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور عربوں کا عمل اور طریقہ یہ تھا کہ عقد کوئی نہیں کھول سکتا تھا مگر وہی جس نے وہ عقد کیا ہوتا یا پھر اس کے خاندان میں سے کوئی آدمی ایسا کر سکتا تھا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجت کے ساتھ عربوں کی زبانوں کو بند کرنے کا ارادہ فرمایا اور اپنے اہل بیت میں سے اپنے عم زاد ہاشمی کو نقض عہد کے اعلان کے لیے بھیجا تا کہ ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی باقی نہ رہے (1)۔ اس مفہوم کو زجاج نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے کہا ہے: یہ آیت ہمارے اور مشرکین کے درمیان عہد توڑنے کے جواز کو متضمن ہے۔ اور اس کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان مدت گزر جاتی ہے تو ہم انہیں جنگ کے بارے آگاہ کرتے ہیں۔ ایذان کا معنی اختیار دینا ہوتا ہے۔ اور دوسری حالت یہ ہے: ہمیں ان کی طرف سے دھوکہ دہی کا خوف ہوتا ہے، تو ہم ان کے ساتھ معاہدہ توڑ دیتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کیا پھر آپ نے عہد توڑ دیا جب آپ کو قتال کا حکم دیا گیا۔

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ۝

''اور اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں کے لیے بڑے حج کے دن کہ اللہ تعالیٰ بری ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی، اب بھی اگر تم تائب ہو جاؤ تو یہ بہتر ہے تمہارے لیے۔ اور اگر تم منہ پھیرے رہو تو خوب جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور خوشخبری سنا دو کافروں کو دردناک عذاب کی''۔

اس میں تین مسئلے ہیں:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَذَانٌ، الأذان کا لغوی معنی بغیر کسی اختلاف کے الاعلام (اطلاع کرنا، اعلان کرنا) ہے اور یہ براءۃ پر معطوف ہے۔ اِلَى النَّاسِ یہاں الناس سے مراد ساری مخلوق ہے۔ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ یہ ظرف ہے اور اس میں عامل أذان ہے اگرچہ اس کی صفت مِّنَ اللّٰهِ کے قول سے لگائی گئی ہے، کیونکہ اس میں فعل کی بو باقی ہے اور یہ ظروف میں عمل کر سکتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں عامل مخزی ہے۔ اور أذان کا عمل کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی صفت لگائی گئی ہے اور یہ فعل کے حکم سے خارج ہو گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حج اکبر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس بعض نے کہا ہے: اس سے مراد یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا دن) ہے یہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم، حضرت طاؤس اور حضرت مجاہد سے مروی ہے۔ اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن ابی اوفیٰ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ حج اکبر یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) ہے اور اسے ہی علامہ طبری نے پسند کیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال حج کے دوران جس میں آپ نے حج ادا فرمایا دسویں کے دن وقوف کیا اور فرمایا: ''یہ کون سا دن ہے؟''۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی: یوم نحر ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ حج اکبر کا دن ہے'' (1)۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے ان لوگوں میں بھیجا جو دسویں ذی الحجہ (یوم نحر) کو منیٰ میں اعلان کریں گے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا اور حج اکبر کا دن یوم نحر ہے۔ اور اسے لوگوں کے اس قول کی وجہ سے حج اکبر کہا گیا ہے: (کہ وہ) حج اصغر بولتے ہیں۔ پس اس سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے معاہدے توڑ دیئے۔ پس حجۃ الوداع کے سال جس میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج ادا فرمایا کسی مشرک نے حج نہیں کیا (2)۔

اور ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یوم نحر ہی حج اکبر کا دن ہے، اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اس میں بال کٹوائے جاتے ہیں (یعنی حلق وغیرہ کیا جاتا ہے) اس میں میل کچیل اتاری جاتی ہے اور اس میں احرام کھل جاتے ہیں۔ اور یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کیونکہ اس میں مکمل حج یوم نحر میں ہے، کیونکہ وقوف اس کی رات کو ہے، رمی جمار، قربانی، حلق اور طواف اس کی صبح کے وقت ہیں۔

فریق اوّل نے حدیث مخرمہ سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''حج اکبر کا دن یوم عرفہ ہے'' (3)۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 2
سنن ابن ماجہ، باب الخطبۃ یوم النحر، حدیث نمبر 3048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 451
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 899

اسے قاضی اسماعیل نے روایت کیا ہے اور امام ثوری اور ابن جریج رحمہما اللہ نے کہا ہے: حج اکبر تمام کے تمام ایام منیٰ ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: یوم صفین، یوم الجمل اور یوم بعاث وغیرہ۔ پس اس سے مراد مطلق وقت اور زمانہ ہوتا ہے صرف وہ دن مراد نہیں ہوتا۔

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: حج اکبر سے مراد حج قران ہے۔ اور حج اصغر حج مفرد ہے۔ اس آیت میں ان میں سے کوئی شے مراد نہیں ہے۔ اور انہیں سے اور حضرت عطا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حج اکبر وہ ہے جس میں وقوف عرفات ہو اور حج اصغر عمرہ ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد تمام ایام حج ہیں۔ اور حسن اور عبد اللہ بن حارث بن نوفل نے کہا ہے: اسے یوم الحج الاکبر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اس سال مسلمانوں اور مشرکوں نے حج کیا (1) اور اس میں اس وقت کئی دینوں کی عیدیں اکٹھی اور متفق ہوئیں، مثلاً یہود، نصاریٰ اور مجوسی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس لیے اسے اکبر کی صفت سے متصف کرے۔ اور حسن سے بھی مروی ہے: بے شک اس حج کا نام اکبر رکھا کیونکہ اس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کیا اور اس میں معاہدے توڑ دیئے گئے (2)۔ اور یہ وہ ہے جو حسن کے نظریہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور ابن سیرین نے کہا ہے: یوم الحج الاکبر وہ سال ہے جس میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا۔ اور اس میں آپ کی معیت میں امتیوں نے بھی حج ادا کیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ اس میں أن ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے بأن اللہ ہے اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس طرح تقدیر ذکر کی ہے قال إن اللہ، بری یہ ان کی خبر ہے۔ وَرَسُوْلُهٗ یہ محل پر معطوف ہے اور اگر آپ چاہیں تو بریء میں ضمیر مرفوع پر عطف کر لیں۔ یہ دونوں حسن ہیں، کیونکہ کلام طویل ہو گیا ہے۔ اور اگر چاہیں تو اسے مبتدا پر معطوف کر لیں اور خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام ہو: ورسولہ بریء منھم اور جنہوں نے ورسولہ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وہ حسن وغیرہ ہیں۔ انہوں نے اس کا عطف اسم جلالت لفظ اللہ پر کیا ہے۔ اور شواذ میں سے یہ ہے کہ ورسولہ قسم کی بنا پر مجرور بھی ہے۔ تقدیر عبارت ہے وحق رسولہ (اور اس کے رسول کے حق کی قسم) اور یہ حسن سے مروی ہے۔ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ اول کتاب میں گزر چکا ہے۔ فَاِنْ تُبْتُمْ پس اگر تم توبہ کر لو شرک سے۔ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو وہ تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ اور اگر تم منہ پھیرے رہو ایمان سے۔ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ تو خوب جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، کیونکہ وہ تمہارا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ اپنی سزا تم پر اتارنے والا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

”بجز ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے نہ کمی کی تمہارے ساتھ ذرہ بھر اور نہ انہوں

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 3، صفحہ 146 2۔ ایضاً

نے مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک، بے شک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے پرہیزگاروں کو"۔

قولہ تعالیٰ: اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ یہ استثنا متصل ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بری ہے سوائے ان کے جو ایک معینہ مدت تک معاہدہ کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے، یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ان سے بری ہے لیکن وہ جن سے تم نے معاہدہ کیا اور وہ اس عہد پر ثابت قدم رہے پس تم ان کا معاہدہ مدت مقررہ تک مکمل کرو۔ اور قول باری تعالیٰ ثُمَّ لَمۡ یَنۡقُصُوۡكُمۡ اس پر دلالت کرتا ہے کہ معاہدہ کرنے والوں میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور بعض وہ ہیں جو اسے پورا کرنے پر ثابت قدم رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے معاہدہ کو توڑنے کی اجازت عطا فرمائی جنہوں نے معاہدہ میں خلاف ورزی کی اور ان کے معاہدہ کو پورا کرنے کا حکم دیا جو معینہ مدت تک اپنے عہد پر باقی رہے (1)۔ اور لَمۡ یَنۡقُصُوۡكُمۡ کا معنی ہے کہ انہوں نے معاہدہ کی شرائط میں ذرہ بھر کمی نہیں کی۔ وَلَمۡ یُظَاهِرُوۡا اور انہوں نے (تمہارے خلاف) کسی کی مدد اور معاونت نہیں کی۔ حضرت عکرمہ اور عطا بن یسار رحمۃ اللہ علیہما نے ثُمَّ لَمۡ یَنۡقُضُوۡكُمۡ ضاد کے ساتھ مضاف کو حذف کر کے پڑھا ہے تقدیر عبارت ہے ثم لم ینقضوا عهدهم کہا جاتا ہے: بے شک یہ (حکم) مخصوص ہے اور اس سے خاص کر بنوضمرہ مراد لیے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا: فَاَتِمُّوۡۤا اِلَیۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰی مُدَّتِهِمۡ پس تم ان کے عہد کی معینہ مدت پوری کرو اگرچہ وہ چار ماہ سے زیادہ ہو۔

فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِیۡنَ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ ۚ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝

"پھر جب گزر جائیں حرمت والے مہینے تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں اور گرفتار کرو انہیں اور گھیرے میں لے لو انہیں اور بیٹھو ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ یعنی جب نکل جائیں حرمت والے مہینے اور سلخت الشهر جب تو مہینے کے آخری ایام میں پہنچ جائے (تو یہ جملہ کہتا ہے) تسلخه سلخا و سلوخا بمعنی خرجت منه (یعنی میں اس سے نکل گیا) اور شاعر نے بھی کہا ہے:

إذا ما سلختُ الشهرَ أهللتُ قبله   كفى قاتلا سلخي الشهور و إهلالي

اور انسلخ الشهر (مہینہ گزر گیا، نکل گیا) اور انسلخ النهار من الليل المقبل (آنے والی رات سے دن نکل گیا)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 900

اور سلخت المرأۃ درعھا (عورت نے اپنی قمیص اتار دی) اور قرآن کریم میں ہے: وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ (یٰسین: 37) (اور دوسری نشانی ان کے لیے رات ہے، ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو) اور نخلۃ مسلاخ یہ وہ درخت ہوتا ہے جس کی سبز خشک کھجوریں بکھر جائیں۔

الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ معروف مہینے ہیں، تین مہینے لگاتار ہیں اور ایک مہینہ الگ اور مفرد ہے۔ اصم نے کہا ہے: مراد وہ ہیں جن کا مشرکوں سے کوئی عقد نہیں پس ان پر لازم ہے کہ وہ ان کے قتال سے رکے رہیں یہاں تک کہ حرمت والے مہینے گزر جائیں۔ اور یہ پچاس دنوں کی مدت ہے جیسا کہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے، کیونکہ اس کے بارے اعلان یوم نحر کو ہوا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ معاہدہ کے چار مہینے ہیں۔ یہ مجاہد، ابن اسحاق، ابن زید اور عمرو بن شعیب نے کہا ہے۔ اور انہیں حرم کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر ان میں مشرکوں کا خون اور ان کے ساتھ تعرض کرنا سوائے سبیل خیر کے حرام قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ یہ حکم عام ہے اور ہر مشرک کے بارے میں ہے، لیکن سنت نے اسے خاص کر دیا ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ عورت، راہب اور بچے وغیرہ کا قصہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے: حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ (التوبہ: 29) (یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں)

مگر یہ جائز ہے کہ مشرکین کا لفظ اہل کتاب کو شامل نہ ہو اور یہ بتوں کی پوجا کرنے والوں اور دوسروں سے جزیہ لینے کے منع کا تقاضا کرتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ جاننا چاہیے کہ مطلق ارشاد باری تعالیٰ: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ ان کے قتل کے جائز ہونے کا تقاضا کرتا ہے وہ کسی وجہ سے بھی مشرک ہوں، مگر مثلہ سے نہی کے بارے احادیث موجود ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ جائز ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس وقت مرتدوں کو آگ کے ساتھ جلا کر، پہاڑوں کی چوٹیوں سے پتھر اور تیر مار کر اور کنوؤں میں الٹا لٹکا کر قتل کیا یہ آیت کے عموم کے ساتھ متعلق ہے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتدوں کی ایک جماعت کو جلا دینا بھی جائز قرار دیتا ہے کہ آپ اسی مذہب کی طرف مائل ہیں۔ اور اس کا اعتماد لفظ کے عموم پر ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ یہ ہر جگہ کے بارے عام ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد حرام کو خاص کیا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ پھر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسین بن فضل نے کہا ہے: اس نے قرآن کریم کی ہر اس آیت کو منسوخ کر دیا ہے جس میں دشمنوں کی اذیت پر صبر کرنے اور ان سے اعراض کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت ضحاک، سدی اور عطا رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (محمد: 4) اور یہ کہ کسی قیدی کو پکڑ کر قتل نہیں کیا جائے گا، (بلکہ) یا تو اس پر احسان کیا جائے گا (یعنی بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا جائے گا) یا پھر اس سے فدیہ لیا جائے گا۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلکہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لیے ناسخ ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً اور یہ کہ مشرک قیدیوں میں سوائے قتل کے اور کوئی شی جائز نہیں۔ اور ابن زید نے کہا ہے: دونوں آیتیں محکم ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ احسان کرنا، قتل کرنا اور فدیہ لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان

میں اس پہلی جنگ سے مسلسل جاری رہا جو آپ نے ان کے ساتھ لڑی اور وہ غزوۂ بدر ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ خُذُوْهُمْ اس پر دلالت کرتا ہے اور اخذ کا معنی قید کرنا، گرفتار کرنا ہے۔ اور گرفتاری قتل کے لیے ہوتی ہے یا فدیہ کے لیے یا احسان کرنے کے لیے جس پر امام وقت کی رائے قائم ہو جائے۔ اور احْصُرُوْهُمْ کا معنی ہے جو کوئی تمہارے شہروں میں تصرف کرنے اور تمہارے پاس آنے کا ارادہ کرے تو تم اسے روک لو، مگر یہ کہ تم انہیں اجازت دو اور وہ تمہارے پاس امان لے کر داخل ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ، المرصد سے مراد وہ جگہ ہے جس میں دشمن کی تاک میں بیٹھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رصدتُ فلانا أرصده یعنی میں فلاں کی تاک میں بیٹھا (1)۔ یعنی تم ان کے لیے ایسی مخفی اور پوشیدہ جگہوں میں بیٹھو جہاں سے انہیں تا کا جا سکتا ہو۔ عامر بن طفیل نے کہا ہے:

ولقد علمت وما إخالك ناسيا أن المنيّة للفتى بالمَرْصَد

اور عدی نے کہا ہے:

أعاذل إنّ الجهل من لذة الفتى وإن المنايا للنفوس بمرصد

ان دونوں میں مرصد تاک میں بیٹھنے کی جگہ کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس میں انہیں دعوت اسلام دینے سے پہلے بھی قتل کرنے اور انہیں پکڑنے کے جواز پر دلیل ہے (2)۔ اور کل ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ زجاج کی پسند ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ذهبت طريقا و ذهبت كلّ طريق یا یہ حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہے اور تقدیر عبارت ہے: فی کل مرصد و علی کل مرصد اور مرصد کو طریق کا اسم بنایا جائے گا۔ اور ابوعلی نے زجاج کو اس بارے میں غلط قرار دیا ہے کہ انہوں نے الطریق کو ظرف بنایا ہے اور کہا: طریق مخصوص جگہ ہوتی ہے جیسا کہ بیت اور مسجد (مخصوص مقام ہیں) پس اس سے پہلے حرف جر کو حذف کرنا جائز نہیں ہوگا سوائے ان مقامات کے جن میں حذف سماعی ہو، جیسا کہ سیبویہ نے بیان کیا ہے: دخلتُ الشام و دخلتُ البيت اور جیسا کہ کہا گیا ہے:

كما عسل الطريق الثعلب

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَابُوْا پس اگر وہ شرک سے توبہ کر لیں۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اس آیت میں تامل اور غور و فکر ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قتل کو شرک پر معلق کیا ہے، پھر فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا اور اس میں اصل یہ ہے کہ قتل جب شرک کے سبب ہے تو وہ اس کے زوال کے سبب زائل ہو جائے گا۔ اور یہ صرف توبہ کے ساتھ قتل کے زوال کا تقاضا کرتا ہے، اس میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اور اسی لیے نماز اور زکوٰۃ کا وقت آنے سے پہلے صرف توبہ کے ساتھ قتل ساقط ہو جاتا ہے اور یہ اس معنی میں بین اور واضح ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے توبہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ دوسری دو شرطیں ذکر کی ہیں۔ اور انہیں لغو قرار دینے کا کوئی ذریعہ اور

1۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

سبب نہیں۔ اس کی نظیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کروں یہاں تک کہ وہ کہنے لگیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ ایسا کریں تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے بچا لیے، محفوظ کر لیے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے''۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں اسے ضرور قتل کروں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے وہ کتنے عظیم فقیہ تھے۔ اور علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: پس قرآن و سنت دونوں منتظم ہیں اور دونوں پر عمل جاری ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے نماز اور تمام فرائض حلال سمجھ کر ترک کیے وہ کافر ہے اور جس نے غفلت اور سستی کرتے ہوئے سنن کو ترک کر دیا وہ فاسق ہو گیا اور جس نے نوافل کو چھوڑ دیا تو اس کے لیے کوئی حرج نہیں، مگر یہ کہ اگر وہ ان کی فضیلت کا انکار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ اس طرح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جس کے بارے آپ نے خبر دی وہ اسے رد کرنے والا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جس نے نماز کو ترک کر دیا لیکن نہ اس کا انکار کیا اور نہ اسے حلال سمجھا۔

یونس بن عبدالاعلیٰ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: میں نے ابن وہب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی اور نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور یہی ابوثور اور تمام اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور یہی قول حماد بن زید، مکحول اور وکیع کا بھی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے قید کر دیا جائے گا اور مارا جائے گا (لیکن) اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی قول ابن شہاب کا ہے اور اسی طرح داؤد بن علی کہتے ہیں۔ اور ان کی حجت اور دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: أمرت أن أقاتل النّاس حتی یقولوا لا اله إلا الله فإذا قالوا ذالك عصموا منی دماء هم و أموالهم إلا بحقها۔(1) اور انہوں نے کہا: ان کا حق وہ تین چیزیں ہیں جن کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین چیزوں میں سے ایک کے پائے جانے کے ساتھ: ایمان کے بعد پھر کفر کرنا یا احصان کے بعد زنا کا ارتکاب کرنا یا کسی آدمی کو بغیر قصاص کے قتل کرنا'' (2)۔ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جس نے ایک نماز جان بوجھ کر بغیر عذر کے چھوڑی یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور اس نے اسے ادا کرنے اور قضاء کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: میں نماز نہیں پڑھوں گا، تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا خون اور مال دونوں حلال ہوں گے، اس کے مسلمان ورثا میں سے کوئی اس کا وارث نہیں بنے گا اور اسے توبہ کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ پس اگر اس نے توبہ کر لی (تو بہتر) ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کے مال کا حکم مرتد کے مال کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور یہی قول اسحاق کا ہے۔ اسحاق نے کہا ہے:

1۔ سنن النسائی، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم، حدیث نمبر 3903، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، حدیث نمبر 2523، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس سے لے کر ہمارے اس زمانے تک اہل علم کی رائے اسی طرح رہی ہے۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے تارک نماز کو کب قتل کیا جائے گا؟ پس بعض نے کہا ہے: مختار وقت کے آخر میں۔ اور بعض نے کہا ہے: وقت ضرورت کے آخر میں۔ اور اس میں سے یہی صحیح ہے۔ اور وہ یہ کہ عصر کے وقت میں چار رکعتیں سورج کے غروب ہونے تک اور رات کے وقت چار رکعتیں عشاء کے وقت کی انتہا تک اور صبح کے وقت دو رکعتیں سورج طلوع ہونے سے پہلے تک (وقت ضرورۃ) باقی ہوتا ہے۔ اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ذهاب الوقت (وقت نکل جانا) سے مراد یہ ہے کہ ظہر کی نماز کو غروب آفتاب تک موخر کر دیا جائے اور مغرب کی نماز کو طلوع فجر تک موخر کر دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے کہا: میں نے توبہ کر لی ہے، تو اس کا یہ قول کافی نہ ہوگا یہاں تک کہ توبہ کو ثابت کرنے والے اس کے افعال اس کی طرف منسوب ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں توبہ کے ساتھ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط ذکر کی ہے تا کہ ان کے ساتھ وہ توبہ کو ثابت کر سکے۔ اور آیت ربا میں فرمایا: وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (البقرہ: 279) (اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال) اور مزید فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا (البقرہ: 160) (البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ظاہر کر دیں) اس کا معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

”اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے، تو پناہ دیجئے اسے تا کہ وہ سنے اللہ کا کلام پھر پہنچا دیجئے اسے اس کی امن گاہ میں۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو (قرآن کو) نہیں جانتے“۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ یعنی ان میں سے جنہیں قتل کرنے کے بارے میں آپ کو حکم دیا ہے۔ اسْتَجَارَكَ یعنی آپ سے پناہ طلب کرے، یعنی آپ کی امان اور آپ کی ذمہ داری کا مطالبہ کرے، تو اسے وہ امان عطا فرما دیجئے تا کہ وہ قرآن کریم کو سنے، یعنی اس کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کو سمجھے۔ پس اگر اس نے ایک امر بھی قبول کر لیا تو یہ اچھا ہے اور اگر وہ انکار کر دے تو پھر اسے ان کی امن گاہ تک پہنچا دو (1) اور یہ وہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ واللہ اعلم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مسلمان ملکوں کے راستے میں کوئی حربی پایا گیا اور اس نے کہا: میں امان طلب کرنے کے لیے آیا ہوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ مشتبہ امور ہیں (2) اور میری رائے یہ ہے کہ اسے اس کی امان گاہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: اسی طرح وہ ہے جو پایا جائے درآنحالیکہ وہ تجارت کے لیے ہمارے ساحل پر اترا ہو اور کہتا ہو: میرا گمان یہ تھا کہ تم اس کے ساتھ تعرض نہیں کرو گے جو تجارت کے لیے آئے یہاں تک کہ وہ (سامان) بیچ لے۔ ظاہر آیت بلاشبہ اسی کے بارے میں ہے جو قرآن کریم سننے اور دین اسلام میں نظر و فکر کا ارادہ رکھتا ہے۔ رہا اس کے علاوہ کسی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 891
2۔ ایضاً

کو پناہ دینا تو یہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر ہے اور ان امور میں نظر وفکر کے اعتبار سے جن کی منفعت اور فوائد اس کے سبب انہیں پہنچیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ تمام علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ سلطان وقت کی امان جائز ہے، کیونکہ وہ نظر وفکر اور مصلحت کو پیش نظر رکھنے کے اعتبار سے تمام سے آگے اور مقدم ہے۔ اور منافع کے حصول اور نقصانات کو دور کرنے میں تمام کا نائب ہے، البتہ غیر خلیفہ کی امان میں اختلاف ہے۔ پس تمام علماء کے نزدیک آزاد آدمی کی امان قبول اور نافذ ہوتی ہے۔ مگر ابن حبیب نے کہا ہے: اس میں امام وقت غور وفکر کرے گا۔ اور رہا غلام تو مشہور مذہب میں اس کی امان جائز ہے۔ امام شافعی اور آپ کے اصحاب امام احمد، اسحاق، اوزاعی، ثوری، ابوثور، داؤد اور محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: غلام کی امان جائز نہیں ہے اور یہی ہمارے علماء کا دوسرا قول ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے: کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مسلمانوں کے خون کی نگرانی اور دفاع کیا جائے گا اور ان کے ادنی ان کے ذمہ کے بارے کوشش کریں گے''۔ انہوں نے کہا ہے: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے أدناھم فرمایا ہے (تو یہ اس طرف اشارہ ہے) کہ غلام کی امان جائز ہے۔ اور آزاد عورت اس کے زیادہ لائق اور مناسب ہے اور اس علت کا کوئی اعتبار نہیں کہ ''اس کے لیے (یعنی غلام کے لیے) وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا''۔ اور عبد الملک بن ماجشون نے کہا ہے: عورت کی امان جائز نہیں ہوتی مگر یہ کہ امام وقت اس کی اجازت دے اور یہ اپنے اس قول کے ساتھ جمہور سے الگ اور جدا ہیں۔ اور جہاں تک بچے کا تعلق ہے تو جب وہ قتال کی طاقت رکھتا ہو تو اس کی امان جائز ہے، کیونکہ وہ بھی من جملہ قتال کرنے والوں سے ہوتا ہے اور حفاظت کرنے والے گروہ میں داخل ہے۔ اور حضرت ضحاک اور سدی رحمہما اللہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ: **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ** کے ساتھ منسوخ ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور قیامت تک ثابت ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت کا حکم ان چار ماہ کی مدت باقی رہا جو مدت ان کے لیے بیان کی گئی اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ مشرکوں میں سے ایک آدمی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اگر ہم میں سے کوئی آدمی چار ماہ گزرنے کے بعد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آنے کا ارادہ کرلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے یا کسی حاجت کے لیے آپ کے پاس آئے تو وہ قتل کر دیا جائے گا؟ تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: **وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ** اور یہی صحیح ہے اور آیت محکم ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ **وَ اِنْ اَحَدٌ**، احد مرفوع ہے اسی طرح کے فعل مضمر کے سبب جو اس کے بعد ہے اور یہ ان میں تو اچھا ہے لیکن اس کے اخوات میں قبیح ہے۔ ان اور اس کے اخوات کے درمیان فرق کے بارے میں سیبویہ کا مذہب ہے کہ یہ جب حروف شرط کی اصل ہے تو اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ (وصف) اس کے علاوہ میں نہیں ہوتا۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ ان کا قول لأنها لا تكون فی غیرہ یہ غلط ہے، کیونکہ یہ (ان) بمعنی ما ہوتا ہے اور ثقیلہ سے

مخفف ہوتا ہے لیکن یہ مبہم ہے۔ اور اس کے سوا دوسرے اس طرح نہیں۔ اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

لَا تَجْزَعِي إِنْ مُنْفِسًا أَهْلَكْتُه　　وإذا هلكتُ فعند ذالكِ فَاَجْزَعِي

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ میں اس پر دلیل ہے کہ الله تعالیٰ کا کلام قاری کی قرأت کے وقت سنا جائے۔ یہ شیخ ابوالحسن، قاضی ابوبکر، ابوالعباس القلانسی، ابن مجاہد اور ابواسحاق الاسفرائنی رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے علاوہ نے کہا ہے، کیونکہ الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ پس یہ اس پر نص ہے کہ الله تعالیٰ کا کلام اس کا کلام ہونے کی وجہ سے قاری کو قراءت کے وقت سنا جائے۔ اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بھی دلالت کرتا ہے کہ قاری جب فاتحۃ الکتاب یا کوئی سورت پڑھتا ہے تو کہتے ہیں: ہم نے الله تعالیٰ کا کلام سنا۔ اور انہوں نے الله تعالیٰ کا کلام پڑھے جانے اور امرء القیس کا شعر پڑھے جانے کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور کلام الله تعالیٰ کے معنی سورۂ بقرہ میں گزر چکے ہیں اور یہ کہ نہ اس کے حرف ہیں اور نہ آواز۔ والحمدلله

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"کیونکر ہو سکتا ہے (ان عہد شکن) مشرکوں کے لیے کوئی معاہدہ الله کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے مسجد حرام کے پاس۔ تو جب تک وہ قائم رہیں تمہارے معاہدہ پر تم بھی قائم رہو ان کے لیے، بے شک الله تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے"۔

قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یہاں کیف تعجب کے لیے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: کیف یسبقنی فلان (کیونکر فلاں مجھ سے سبقت لے جائے گا) یعنی اسے نہیں چاہیے کہ وہ مجھ پر سبقت لے جائے۔ اور عہد یکون کا اسم ہے۔ اور آیت میں اضمار ہے، ای کیف یکون للمشرکین عہد مع اضمار الغدر (1) (یعنی کیونکر مشرکین کے لیے عہد ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کہ غدر اور دھوکہ دہی مخفی ہو) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

خبرتمانی إنما الموت بالقُرى　　فكيف وهاتا هَضْبَةٌ و كَثِيبُ

تقدیر عبارت ہے: فکیف مات، یہ زجاج سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کیونکہ ان مشرکوں کے لیے الله تعالیٰ کے نزدیک کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کہ وہ کل اس کے سبب اس کے عذاب سے پر امن اور محفوظ ہو جائیں اور کیونکر ان کے لیے الله تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے سبب دنیا کے عذاب سے پر امن اور محفوظ ہو جائیں، پھر استثنیٰ کی اور فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ محمد بن اسحاق نے کہا ہے: وہ بنو بکر ہیں۔ یعنی معاہدہ نہیں مگر ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نہ معاہدہ توڑا اور نہ اسے فسخ کیا۔

1۔ تفسیر الرازی

قولہ تعالیٰ: فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ یعنی جب تک تمہارے عہد کو پورا کرنے پر وہ قائم رہیں تو تم بھی ان کے لیے اسی کی مثل پر قائم رہو۔ ابن زید نے کہا ہے: پس وہ قائم نہیں رہے تو ان کے لیے چار مہینے مدت مقرر کر دی گئی۔ اور رہے وہ جن کے لیے کوئی عہد نہیں تو تم انہیں قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ مگر یہ کہ وہ توبہ کر لیں۔

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾

''کیونکر (ان کے معاہدہ کا لحاظ رکھا جائے) حالانکہ اگر وہ غالب آجائیں تم پر تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا، راضی کرنا چاہتے ہیں تمہیں (صرف) اپنے منہ (کی باتوں) سے اور انکار کر رہے ہیں ان کے دل اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ اس پر تعجب کا اعادہ فرمایا کہ ان کے لیے ان کے خبث اعمال کے باوجود عہد ہو، یعنی کیونکر ان کے لیے معاہدہ ہو سکتا ہے حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا۔ کہا جاتا ہے: ظهرت علی فلان یعنی میں اس پر غالب آگیا اور ظهرت البیت میں مکان پر چڑھا۔ اور اسی سے ہے: فما اسطاعوا أن یظهروہ پس انہوں نے طاقت نہ رکھی کہ وہ اس پر غالب آئیں۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً، يَرْقُبُوْا وہ محافظت کریں۔ اور رقیب حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِلًّا اس سے مراد عہد ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس کا معنی قرابت اور رشتہ داری ہے۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی جوار اور پڑوس ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد حلف (دوستی یا قسم) ہے اور ذِمَّةً سے مراد عہد ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: مراد قسم، یمین ہے۔ اور ان سے یہ بھی منقول ہے الا العهد اور الذمة بمعنی التذمم (بچنا) ہے۔ ازہری نے کہا ہے: یہ عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا اسم ہے۔ اور اس کی اصل الأليل سے ہے اور اس کا معنی ہے چمکدار، روشن۔ کہا جاتا ہے: ال لونه يؤل الا یعنی اس کا رنگ صاف اور چمک دار ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل الحدة سے ہے (تیز دھار ہونا) اور اسی سے الألة للحربة (تیز دھار نیزہ) اور اسی سے أُذُنٌ مُؤَلَّلَةٌ (تیز کان) اور اسی سے طرفہ بن العبد کا قول ہے وہ اپنی ناقہ کے کانوں کی تیزی اور کھڑے ہونے کا وصف بیان کرتا ہے:

مُؤَلَّلَتَانِ تَعْرِفُ الْعِتْقَ فِيْهِمَا كَمَا مِعْتَقَيْ شَاةٍ بِحَوْمَلَ مُفْرَدِ

پس جب عہد، جوار اور قرابت کو ال کہا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ کان ان جہتوں کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں، یعنی ان کے لیے تیز کر لیے جاتے ہیں۔ اور عہد کو اس کے صاف و شفاف اور ظاہر ہونے کی وجہ سے ال کہا جاتا ہے۔ اور اس کی جمع قلت آلال آتی ہے۔ اور جمع کثرت الال آتی ہے۔ اور جوہری وغیرہ نے کہا ہے: الال کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور الال کا معنی عہد اور قرابت بھی ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

لعمرك إنّ إلّك من قريش كإلّ السّقب من رَأل النّعام

قولہ تعالیٰ: ولا ذمۃً یعنی وہ کسی عہد کا لحاظ نہ رکھیں گے۔ اور اس سے مراد ہر وہ حرمت ہے جو تجھ پر لازم ہو جب تو اسے ضائع کرے تو گناہ ہو۔ حضرت ابن عباس، ضحاک اور ابن زید نے کہا ہے: الذمۃ کا معنی عہد ہے۔ اور جنہوں نے الإلّ سے مراد بھی عہد لیا ہے تو پھر یہ تکرار دو مختلف لفظوں کے سبب ہے۔ اور ابو عبید معمر نے کہا ہے: الذمۃ سے مراد التذمم ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں ذمہ سے مراد امان ہے: ويسعى بذمتهم أدناهم اور ذمہ کی جمع ذمم ہے۔ اور بئر ذمۃ (ذال کے فتحہ کے ساتھ) تھوڑے پانی والا کنواں۔ اور اس کی جمع ذمام ہے۔ ذوالرمہ نے کہا ہے:

على حِمْيَرِيّات كأنّ عيونها ذِمامُ الرّكايا أنكزتها المواتحُ

اس میں انکزتھا کا معنی ہے اس نے اپنے پانی کو ختم کر دیا، کم کر دیا۔ اور اھل الذمہ اہل عقد ہوتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یعنی وہ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جس کا ظاہر راضی اور خوش کر دیتا ہے۔ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ یعنی وہ عہد توڑنے والے ہیں۔ اور ہر کافر فاسق ہے، لیکن یہاں مراد وہ ہیں جو اعلانیہ برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اور عہد توڑنے والے ہیں۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

"انہوں نے بیچ دیں اللہ کی آیتیں تھوڑی سی قیمت پر (مزید برآں) روکا انہوں نے (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے، بے شک وہ بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے"۔

یعنی مشرکوں نے چند لقموں کے عوض معاہدے توڑ دیئے جو انہیں ابو سفیان نے کھلائے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہوں نے قرآن کے بدلے دنیوی ساز و سامان لے لیا۔ فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی انہوں نے اعراض کر لیا اور صدوا، الصدود سے ماخوذ ہے۔ یا انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ سے (لوگوں کو) روکا۔ اس صورت میں یہ الصد سے ماخوذ ہے۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝

"نہیں لحاظ کرتے کسی مومن کے حق میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی وعدہ کا۔ اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں"۔

نحاس نے کہا ہے: یہ تکرار نہیں ہے، بلکہ پہلا ارشاد تمام مشرکوں کے لیے اور یہ دوسرا یہودیوں کے لیے خاص ہے۔ اور اس پر دلیل اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ہے یعنی یہودیوں نے اللہ عزوجل کے دلائل اور اس کے بیان کو طلب ریاست اور دیگر چیزوں کے طمع اور حرص کے عوض بیچ دیا۔ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ یعنی وہ معاہدہ توڑنے کے ساتھ حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۝۱۱

''پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) آیتیں اس قوم کے لیے جو علم رکھتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنۡ تَابُوۡا یعنی اگر وہ شرک سے توبہ کرلیں اور احکام اسلام کو لازم پکڑلیں۔ فَاِخۡوَانُكُمۡ تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ فِی الدِّیۡنِ (دین میں)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت نے اہل قبلہ کے خون حرام کردیئے ہیں۔ اور یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ دونوں فرض کی ہیں اور اس سے منع کیا ہے کہ کوئی ان دونوں کے درمیان فرق کرے اور اس کا بھی انکار کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے بغیر نماز کو قبول کرے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: تمہیں نماز اور زکوٰۃ کے بارے حکم دیا گیا ہے پس جس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کی نماز بھی نہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے تین چیزوں کے درمیان فرق کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے اور اپنی رحمت کے درمیان فرق کردے گا، جس نے کہا: میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہوں اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا''۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ (المائدہ:92) اور جس نے کہا: میں نماز قائم کروں گا اور زکوٰۃ نہیں دوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ:43) اور جس نے اللہ تعالیٰ کے شکر اور اپنے والدین کے شکر کے درمیان فرق کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اَنِ اشۡكُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡكَ (لقمان:14) (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا)

قولہ تعالیٰ: وَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ یعنی ہم اپنی آیات کھول کر بیان کرتے ہیں۔ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ اللہ تعالیٰ نے ذکر میں اہل علم کو خاص کیا ہے کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرسکتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَیۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَ طَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَىِٕمَّةَ الۡكُفۡرِ ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَیۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ یَنۡتَهُوۡنَ ۝۱۲

''اور اگر یہ لوگ توڑ دیں اپنی قسمیں اپنے معاہدہ کے بعد اور طعن کریں تمہارے دین پر تو جنگ کرو کفر کے پیشواؤں سے، بے شک ان لوگوں کی کوئی قسمیں نہیں ہیں (ایسوں سے جنگ کرو) تا کہ یہ لوگ (عہد شکنی سے) باز آجائیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ نَّكَثُوۡۤا، النکث کا معنی توڑنا ہے اور اصل میں یہ ہر اس شے کے لیے ہے جسے پہلے بٹا جائے اور پھر کھول دیا جائے۔ اور یہ قسم اور معاہدوں میں مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

وان حَلَفَتْ لا ینقض النائی عهدها فلیس لمخضوب البنان یَمِینُ

اس میں یمین بمعنی عہد (معاہدہ) ہے اور قولہ: وَ طَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِكُمۡ اور وہ تمہارے دین میں طعن کریں معاہدے توڑ کر،

جنگ کے ساتھ اور دیگر ایسے امور کے ساتھ جو شرک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: طعنه بالرمح (اس نے اسے نیزے کے ساتھ کچوکا لگایا) اور طعن بالقول السیء فیه، یطعن (اس نے برے قول کے ساتھ طعنہ دیا) اس میں وہ طعنہ زنی کرتا ہے، دونوں مثالوں میں یہ لفظ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یطعن بالرمح (یہ عین کے ضمہ کے ساتھ ہے) اور یطعن بالقول (یہ عین کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور یہ یہاں استعارۃ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ قول ہے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا۔ ”اگر تم ان کی امارت پر طعن کرو گے تو تحقیق اس سے پہلے تم نے ان کے باپ کی امارت پر طعن کیا اور اللہ کی قسم بلاشبہ وہ امارت کے لیے انتہائی موزوں اور اہل تھے“(1)۔ اسے صحیح نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ دین میں طعن کرنے والے ہر آدمی کو قتل کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ کافر ہے۔ اور طعن کا معنی یہ ہے کہ اس کی طرف ایسی شے کی نسبت کرنا جو اس کے لائق اور مناسب نہ ہو یا کسی امر دینی کو حقیر سمجھتے ہوئے اس پر اعتراض کرنا، جب کہ اس کے اصول کا صحیح ہونا اور اس کے فروع کا درست ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کی اس کی سزا قتل ہے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے ان میں سے امام مالک، لیث، احمد اور اسحاق ہیں اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اور حضرت نعمان (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) سے بیان ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: اہل ذمہ میں سے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی گلوچ دی اسے قتل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

اور روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کسی آدمی نے کہا: کعب بن اشرف کو قتل نہیں کیا گیا مگر دھوکے کے ساتھ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اور ایک دوسرے آدمی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کہا تو حضرت محمد بن مسلمہ اٹھے اور کہا: کیا آپ کی مجلس میں یہ کہا جا رہا ہے اور آپ خاموش ہیں؟ قسم بخدا! میں آپ کو اس چھت کے نیچے ہمیشہ نہیں رہنے دوں گا اور اگر مجھے اس کے ساتھ علیحدہ موقع ملا تو میں اسے ضرور قتل کروں گا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اسے قتل کیا جائے گا اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اگر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غدر کی نسبت کی۔ اور یہی وہ مفہوم ہے جو حضرت علی اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما اس کہنے والے کے قول سے سمجھے، کیونکہ یہ زندقہ ہے۔ اور اگر اس نے اس کے قتل کی نسبت مباشرین (عملاً قتل کرنے والے) کی طرف کی ہے اس حیثیت سے کہ وہ کہتا ہے: بے شک انہوں نے اسے امن اور اعتماد دیا پھر اسے توڑ دیا تو یقیناً یہ نسبت کذب محض ہے، کیونکہ اس کے ساتھ ان کی گفتگو میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ انہوں نے اسے امن اور اعتماد دیا ہو اور نہ انہوں نے اسے یہ صراحتاً کہا ہے اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ امان نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کے قتل کی طرف متوجہ کیا نہ کہ اسے امان دینے کی طرف۔ اور آپ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں اجازت دی کہ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرے۔ اور اسی بنا پر اسے قتل کرنے کے بارے میں نظر اور تردد ہے جس نے اس کی نسبت ان کی طرف کی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کیا ان کی طرف غدر کی نسبت کرنے سے اس کی نسبت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 11-12

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا لازم آتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فعل کو درست قرار دیا اور اس کے ساتھ راضی ہوئے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ غدر کے ساتھ راضی ہوئے اور جس نے صراحۃً ایسا کیا وہ قتل کر دیا جائے گا یا ان کی طرف غدر کی نسبت کرنے سے اس کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف لازم نہیں آتی پس وہ قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور جب ہم کہتے ہیں: اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ تو وہاں اس قائل کو قابل عبرت سزا دینا، اسے جیل میں قید کرنے کی سزا دینا، شدید مارنا اور بہت زیادہ ذلیل ورسوا کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور رہا ذمی تو جب وہ دین کے بارے میں طعن کرے تو اس کا عہد توڑ دیا جائے گا یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ، الآیہ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا ہے (1)۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں کہا ہے: بے شک اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا اور بے شک صرف طعن کے ساتھ معاہدہ نہیں ٹوٹتا مگر جب عملاً ٹوٹنے کا وجود پایا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دو شرطوں کے ساتھ انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے، ان میں سے ایک ہے ان کا معاہدہ کو توڑنا اور دوسری ہے ان کا دین میں طعن کرنا۔ ہم نے کہا ہے: اگر انہوں نے ایسا عمل کیا جو معاہدہ کے خلاف ہو تو ان کا عہد ٹوٹ جائے گا اور دو امروں کا ذکر اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ اس کا قتل ان دونوں کے پائے جانے پر موقوف ہے، کیونکہ معاہدہ توڑنا ہی انفرادی طور پر ان کے لیے قتل کو عقلاً وشرعاً مباح کر دے گا۔ اور ہمارے نزدیک تقدیر آیت اس طرح ہے: فان نكثوا عهدهم حلّ قتالهم وان لم ينكثوا بل طعنوا في الدين مع الوفاء بالعهد حلّ قتالهم (پس اگر وہ اپنا معاہدہ توڑ دیں تو ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال ہے اور اگر معاہدہ نہ توڑیں بلکہ عہد کو پورا کرنے کے باوجود دین میں طعن کریں (تب بھی) ان کے ساتھ جنگ کرنا حلال ہے) تحقیق روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک ذمی کو پیش کیا گیا جس نے ایک جانور کو کیل (یا نوک دار لکڑی) چبھویا اس پر ایک مسلمان عورت سوار تھی پس سواری اچھلی اور اس نے اسے گرا دیا اور اس کی کچھ شرمگاہ ننگی ہوگئی۔ تو آپ نے اسی جگہ اسے سولی دینے کا حکم دیا (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب ذمی نے جنگ میں حصہ لیا تو اس کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا اور اس کا مال اور اس کی اولاد اس کے ساتھ مال فے بن جائیں گے۔ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کے سبب اس کی اولاد کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس اکیلے نے عہد توڑا ہے۔ اور فرمایا: جہاں تک اس کے مال کا تعلق ہے تو وہ لے لیا جائے گا۔ اور یہ ایسا تعارض ہے جو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے منصب کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ اس کا معاہدہ تو وہی ہے جس نے اس کے مال اور اس کی اولاد کو محفوظ کیا ہے۔ تو جب اس سے مال نکل گیا تو پھر اس سے اس کی اولاد بھی نکل جائے گی (یعنی دونوں میں سے کوئی شے بھی محفوظ نہ ہوگی) اور اشہب نے کہا ہے: جب ذمی نے اپنا عہد توڑ دیا تو وہ اپنے عہد پر ہی رہے گا اور کبھی بھی غلامی کی طرف نہیں لوٹے گا۔ اور یہ تعجب خیز ہے، گویا کہ اس نے عہد کو معنیٰ اور محسوسات دیکھ لیا۔ بلاشبہ اقتضاء عہد کا حکم برائے نظر وفکر ہے اور مسلمانوں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی والمحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، زیر آیت ہذہ

اس کے لیے اس کا التزام کیا ہے، تو جب اس نے عہد توڑ دیا تو وہ دیگر تمام عقود کی طرح ٹوٹ گیا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اکثر علماء اس پر متفق ہیں کہ اہل ذمہ میں سے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیں یا آپ سے تعرض کیا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت یا آپ کے وصف کو کسی ایسی وجہ کے بغیر حقیر سمجھا جس سے وہ کافر ہو جائے تو اسے قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ ہم نے اس پر اس سے عقد ذمہ یا معاہدہ نہیں کیا۔ مگر امام اعظم ابو حنیفہ، ثوری اور اہل کوفہ میں سے ان دونوں کے متبعین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ وہ قتل نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ جس نظریہ پر ہے وہ شرک سے بڑھ کر نہیں ہے، لیکن اسے ادب ضرور سکھایا جائے گا اور اسے تعزیز لگائی جائے گی۔ اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا (اور اگر وہ توڑ دیں) الآیہ

اور بعض نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف کو قتل کرنے کے بارے حکم ارشاد فرمایا حالانکہ اس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے اصحاب میں سے ایک آدمی پر غصے اور ناراض ہوئے تو حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کیا میں اس کی گردن نہ مار دوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے اس کی اجازت نہیں (1)۔ اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ایک اندھا آدمی تھا اس کی ایک ام ولد (لونڈی) تھی، اس کے موتیوں کی مثل اس سے دو بیٹے تھے۔ پس وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھی اور وہ اس طرح کا فعل کرتی رہتی تھی تو وہ اسے منع کرتا تھا لیکن وہ باز نہ آئی اور وہ اسے جھڑکتا اور ڈانٹتا تھا لیکن وہ اس کا اثر قبول نہ کرتی تھی۔ پس جب ایک رات حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا تو اس کا آقا صبر نہ کر سکا پس وہ کلہاڑے کی طرف اٹھ کر گیا اور اس کے پیٹ پر رکھ دیا پھر اس پر زور لگایا یہاں تک کہ اسے آر پار کر دیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار گواہ رہو بے شک اس کا خون رائیگاں ہے''۔ (2)

اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: پس اس نے اسے قتل کر دیا، جب صبح ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے بتایا گیا۔ پس وہ نابینا شخص اٹھا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا مالک ہوں، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھیں اور آپ کے بارے میں الزام تراشی کرتی تھی، میں اسے اس سے منع کرتا لیکن وہ نہ رکتی اور میں اسے جھڑکتا اور وہ اس سے باز نہ آتی اور میرے اس سے موتیوں کی مثل دو بیٹے ہیں۔ اور وہ میرا ساتھی تھی، پس جب گزشتہ رات آئی تو وہ آپ کو گالیاں دینے شروع ہوگئی اور آپ کے بارے میں الزام تراشیاں کرنے لگی تو میں نے اسے قتل کر دیا۔

تب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار سنو! تم گواہ رہو بلاشبہ اس کا خون رائیگاں ہے''۔

مسئلہ نمبر 6۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ جب کوئی گالیاں دے پھر قتل سے بچنے کے لیے اسلام قبول کرے، تو بعض نے کہا ہے: اس کا اسلام لانا اس کے قتل کو ساقط کر دے گا اور یہی مشہور مذہب ہے، کیونکہ اسلام اپنے ماقبل ہر شے کو مٹا دیتا ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ جب اس نے سب و شتم کیا اور پھر توبہ کر لی۔ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال: 38) (فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ (اب بھی) باز آ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، حدیث نمبر 3797، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 3795

جائیں تو بخش دیا جائے گا انہیں جو کچھ ہو چکا)

اور بعض نے کہا ہے: اسلام اس کے قتل کو ساقط نہیں کرے گا۔ یہ قول عتبیہ میں ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہاء حرمت اور اس نقص اور عیب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ ملانے کے قصد کی وجہ سے واجب اور ثابت ہے۔ لہٰذا اس کا اسلام کی طرف رجوع کرنا ایسا نہیں ہے جو اسے ساقط کر سکے۔ اور نہ ہی وہ کسی مسلمان سے احسن اور بہتر حالت میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ اس میں ائمۃ امام کی جمع ہے۔ بعض علماء کے قول کے مطابق مراد صنادید قریش ہیں مثلاً ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف۔ اور یہ قول بعید از حقیقت ہے، کیونکہ یہ آیت سورت براءۃ میں ہے اور جس وقت یہ سورت نازل ہوئی اور لوگوں پر پڑھی گئی تو اللہ تعالیٰ قریش کی قوت وطاقت کو پامال کر چکا تھا پس اب سوائے اسلام لانے یا صلح کرنے کے کچھ باقی نہ تھا۔ پس یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ سے مراد ہو، جو معاہدہ توڑنے اور دین میں طعن کرنے کا اقدام کرے وہی کفر میں اصل اور سردار ہوگا۔ پس اس بنا پر وہ ائمہ کفر میں سے ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان کے متقدمین اور رؤساء ہوں اور یہ کہ انہیں قتل کرنا ان کے متبعین کو قتل کرنا ہے اور یہ کہ ان کے لیے کوئی حرمت (اور عزت) نہیں ہے۔ اور ائمۃ اصل میں أأمِمة ہے جیسے مثال اور أمثلة ہے، پھر میم کو میم میں مدغم کیا گیا اور حرکت کو ہمزہ کی طرف منتقل کر دیا گیا اب دو ہمزے جمع ہو گئے اور پھر دوسرے ہمزہ کو یا سے بدل دیا گیا۔ اور اخفش کا خیال ہے کہ تو کہتا ہے: هذا أيم من هذا یعنی یہ یا کے ساتھ ہے۔ اور مازنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: أوم من هذا یعنی واؤ کے ساتھ۔ اور حمزہ نے ائمۃ پڑھا ہے۔ اور اکثر نحوی اس طرف گئے ہیں کہ یہ غلطی ہے، کیونکہ انہوں نے دو ہمزے ایک کلمہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ بے شک ان کا کوئی معاہدہ نہیں، یعنی ان کے معاہدے سچے نہیں ہیں جنہیں وہ پورا کریں گے۔ ابن عامر نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ لَآ اِيْمَانَ لَهُمْ پڑھا ہے یہ ایمان سے ہے، یعنی ان کا کوئی اسلام (اور دین) نہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آمنته ایمانًا کا مصدر ہو اور یہ اس امن سے ہو جس کی ضد خوف ہے، یعنی وہ امن میں نہیں ہوں گے۔ یہ آمنته ایمانًا سے ہے یعنی میں نے اسے پناہ دی۔ پس اسی لیے فرمایا: فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ۔

لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ تا کہ وہ شرک سے باز آجائیں۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ سے ایک سال معاہدہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں تھے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ شریف سے روک لیا، پھر انہوں نے اس شرط پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی کہ آپ واپس لوٹ جائیں، پس وہ اپنے معاہدہ پر قائم رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف خزاعہ کی بنی امیہ کی حلفاء جو کنانہ سے تھے، کے ساتھ جنگ ہو گئی اور بنو امیہ نے ہتھیاروں اور خوراک کے ساتھ اپنے حلیفوں کی امداد کی، تو خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی پس یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے حلفاء کی امداد کریں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور بخاری میں حضرت زید بن وہب سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ہم حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے تو انہوں نے فرمایا: اس آیت فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ کے مصداق سے سوائے تین کے کوئی باقی نہیں۔ اور منافقین

میں سے سوائے چار کے کوئی باقی نہیں۔ تو ایک اعرابی نے کہا: بے شک تم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو تم ایسی خبریں دیتے ہو کہ ہم نہیں جانتے وہ کیا ہیں؟ تم گمان کرتے ہو کہ سوائے چار کے کوئی منافق نہیں، تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہے جو ہمارے گھروں میں گھس آتے ہیں اور ہمارا قیمتی اور عمدہ سامان چوری کر لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ فاسق لوگ ہیں، ہاں ان میں سے سوائے چار کے کوئی باقی نہیں۔ ان میں سے ایک شیخ کبیر ہے کہ اگر وہ ٹھنڈا پانی پیے تو اس کی ٹھنڈک کو نہیں پاتا۔ قولہ تعالیٰ: لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ تا کہ وہ اپنے کفر سے اپنے باطل (عقائد) سے اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے سے باز آجائیں۔ اور یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کے ساتھ قتال اور جنگ کرنے سے غرض اور مقصود ان کے ضرر اور نقصان کو دور کرنا ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ جنگ کرنے سے رک جائیں اور وہ ہمارے دین میں داخل ہو جائیں۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾

"کیا نہیں جنگ کرو گے تم اس قوم کے ساتھ جنہوں نے توڑ ڈالا اپنی قسموں کو اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکال دینے کا اور انہی نے آغاز کیا تھا تم پر (زیادتی کا) پہلی مرتبہ، کیا تم ڈرتے ہو ان سے (سنو!) اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر ہو تم (سچے) ایمان دار"۔

قولہ تعالیٰ: أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ یہ زجر و توبیخ ہے اور اس میں تحضیض کا معنی ہے۔ یہ آیت کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ یعنی نکلنے کا سبب ان کی طرف سے تھا۔ پس نکالنے کی نسبت ان کی طرف کی گئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے اہل مکہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکالا اس معاہدہ کو توڑنے کی وجہ سے جسے انہوں نے توڑا۔ یہ حسن سے مروی ہے۔ وَهُم بَدَءُوكُمْ اور انہوں نے ہی تم سے لڑنے کا آغاز کیا۔ أَوَّلَ مَرَّةٍ یعنی انہوں نے معاہدہ توڑا اور بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کر دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدر کے دن انہوں نے تمہارے ساتھ جنگ کرنے کا آغاز کیا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو قافلے کے لیے نکلے تھے اور جب انہوں نے اپنا قافلہ بچا لیا تو ان کے لیے واپس لوٹنا ممکن تھا، لیکن انہوں نے بدر تک پہنچنے اور وہاں شراب پینے کے بغیر واپس جانے سے انکار کر دیا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ تم ان کے ساتھ قتال ترک کرنے کی صورت میں اس کی سزا سے ڈرو، اس سے کہ تم ان کے ساتھ لڑنے کی صورت میں کسی تکلیف اور ضرر کے پہنچنے سے ڈرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالنے سے مراد ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج، عمرہ اور طواف سے روکنا ہے اور یہی ان کی طرف سے ابتدا تھی۔ واللہ اعلم

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٥﴾

''جنگ کرو ان سے عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے اور رسوا کرے گا انہیں اور مدد کرے گا تمہاری ان کے مقابلے میں اور (یوں) صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے۔
اور (یوں) دور فرما دے گا غصہ ان کے دلوں کا اور اپنی رحمت سے توجہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوْهُمْ یہ امر ہے (یعنی تم ان سے جنگ کرو) یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ یہ جواب امر ہے۔ اور اس کی جزم بمعنی مجازات ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: ان تقاتلوهم یعذبهم الله...... الآیہ (اگر تم ان سے جنگ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں عذاب دے گا اور انہیں رسوا کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور یوں صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے۔ وَیُذْهِبْ غَیْظَ قُلُوْبِهِمْ یہ اس پر دلیل ہے کہ ان کا غصہ انتہائی شدید تھا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد خزاعہ قبیلے والے ہیں جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے اور یہ سب معطوف ہے۔ اور اس میں یہ بھی جائز ہے کہ پہلی کلام سے منقطع ہونے کی وجہ سے یہ سب مرفوع ہوں۔ اور اس میں اَنْ کو مضمر ماننے کی وجہ سے نصب بھی جائز ہے کوفیوں کا موقف یہی ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

فإن یَهلِك أبو قابوس یَهلِك ربیعُ الناس والشهرُ الحرامُ
و نأخذ بعده بِذِناب عیش أجبّ الظهر لیس له سَنام

اس میں اگر آپ چاہیں تو وناخذ کو رفع دیں اور اگر چاہیں تو اسے نصب دیں۔ (1)

اور قول باری تعالیٰ: وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ میں مراد بنو خزاعہ ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے، کیونکہ قریش نے ان کے خلاف بنی بکر کی مدد کی اور بنی خزاعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ بنی بکر کے کسی آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو بیان کی، تو خزاعہ میں سے کسی نے اسے کہا: اگر تو نے دوبارہ ایسا کیا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ چنانچہ اس نے اس کا اعادہ کیا اور اس نے اس کا منہ توڑ دیا اور ان کے درمیان جنگ بھڑک اٹھی۔ اور انہوں نے خزاعہ قبیلے کے کئی افراد قتل کر دیے۔ پس عمرو بن سالم خزاعی ایک جماعت کے ہمراہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے اطلاع دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر داخل ہوئے اور فرمایا: ''مجھ پر پانی انڈیلو''۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کرتے رہے اور یہ کہنے لگے: ''میری مدد نہیں کی جائے گی اگر میں نے بنی کعب کی مدد نہ کی''۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری کی اور مکہ مکرمہ کی طرف خروج کا حکم ارشاد فرمایا نتیجۃً مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔

قولہ تعالیٰ: وَیَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ رفع کے ساتھ قراءت استیناف کی بنا پر ہے، کیونکہ یہ پہلی کلام کی جنس میں سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جزم کے ساتھ ویتب نہیں کہا۔ کیونکہ جنگ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کو ان کے لیے ثابت نہیں کرتی، بلکہ یہ تو ان کے لیے عذاب اور رسوائی ہے اور مومنین کے سینوں کے لیے شفا اور ان کے دلوں سے غصے کو نکالنے اور دور

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 205

کرنے کا موجب ہے۔ اور اس کی نظیر یہ ہے۔ فَإِنْ يَشَإِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ (الشوریٰ:24) کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ (الشوریٰ:24) (اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو)

اور وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے توجہ فرمائی مثلاً ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل اور سلیم بن ابی عمرو کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور ابن ابی اسحاق نے ویتوب نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح عیسیٰ الثقفی اور اعرج سے مروی ہے۔ اور اس بنا پر توبہ جواب شرط میں داخل ہوگی، کیونکہ معنی یہ ہے: ان تقاتلوھم یعذبھم اللہ اور اسی طرح وہ ہیں جو اس پر معطوف ہیں۔ پھر فرمایا: وَيَتُوبُ اللّٰهُ، ای إن تقاتلوھم (اگر تم ان سے جنگ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر توجہ فرمائے گا) پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھوں کے ساتھ انہیں عذاب دینے، تمہارے سینوں کو شفا دینے، تمہارے دلوں سے غصہ دور کرنے اور تم پر توجہ دینے کو جمع کر دیا۔ اور رفع پڑھنا احسن ہے، کیونکہ توبہ کا سبب قتال نہیں ہے، کیونکہ کبھی یہ بغیر قتال کے بھی پایا جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اس پر ہر حال میں توجہ دے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

"کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تک پہچان نہیں کرائی اللہ نے ان کی جو جہاد کریں گے تم سے اور جنہوں نے نہیں بنایا بغیر اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے (کسی کو اپنا) محرم راز، اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو تم کرتے ہو"۔

قولہ تعالیٰ: أَمْ حَسِبْتُمْ ایک شے سے دوسری شے کی طرف خروج ہے۔ أَنْ تُتْرَكُوا یہ سیبویہ کے قول کے مطابق دو مفعولوں کے محل میں ہے۔ اور مبرد کے نزدیک دوسرا مفعول حذف کر دیا گیا ہے(1)۔ اور کلام کا معنی ہے: أم حسبتم أن تتركوا من غير أن تبتلوا بما يظهر به المؤمن والمنافق الظهور الذي يستحق به الثواب والعقاب (کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں اس کے بغیر ہی چھوڑ دیا جائے گا کہ تم ایسی شے کے ساتھ آزمائے جاؤ جس کے ساتھ مومن اور منافق اس طرح ظاہر ہو جاتے ہیں جس کے سبب وہ ثواب و عقاب کے مستحق بنتے ہیں) یہ معنی کئی مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اس کی جزم لما کے سبب ہے اگرچہ ما زائدہ ہے، کیونکہ سیبویہ کے نزدیک یہ تیرے اس قول کا جواب ہوتا ہے: قد فعل، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ دیا گیا ہے۔ ولیجۃ ہمراز، اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے والا۔ یہ دلوج سے ہے اور اس کا معنی داخل ہونا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کچھار جس میں وحشی جانور داخل ہوتے ہیں اس کا نام تولج رکھا گیا ہے۔ ولج یلج ولوجا جب وہ داخل ہو۔ اور معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بغیر کسی کی محبت و مودت میں داخل ہونے والا۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے: ہر وہ شے جسے تو ایسی شے میں داخل کرے جو اس میں سے نہ ہو تو وہی ولیجہ ہے۔ اور آدمی کسی قوم

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 206

میں شامل ہو حالانکہ وہ ان سے نہ ہو تو وہ ولیجة ہوتا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ولیجہ کا معنی دخیلہ (اندرونی معاملات میں داخل ہونے والا) ہے اور الولجاء کا معنی الدخلاء ہے۔ پس ولیجة الرجل وہ ہوتا ہے جو عام لوگوں کے سوا کسی کے اندرونی معاملات کے لیے مختص ہو یعنی محرم راز۔ تو کہتا ہے: ھو ولیجتی (وہ میرا محرم راز ہے) اور ھم ولیجتی اس میں واحد اور جمع دونوں برابر ہیں۔ ابان بن تغلب رحمہ اللہ نے کہا ہے:

فبئس الولیجة للهاربین والمعتدین واهل الرِّیَب

پس بھاگنے والوں اور ظلم و زیادتی کرنے والوں اور شک کرنے والوں کی نیت اور ان کا اندر کتنا برا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ وَلِيْجَةً کا معنی بطانة ہے۔ اور دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ اس کی نظیر لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (آل عمران: 118) ہے (نہ بناؤ اپنا رازدار غیروں کو) اور فراء نے کہا ہے: وَلِيْجَةً سے مراد مشرکین میں سے محرم راز جنہیں وہ بتاتے ہیں اور وہ ان کے اسرار و رموز ان کے پاس افشاء کر دیتے ہیں اور ان کے معاملات کے بارے انہیں آگاہ کر دیتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۖۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۱۷

”نہیں ہے روا مشرکوں کے لیے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو حالانکہ وہ خود گواہی دے رہے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کی یہ وہ (بدنصیب) ہیں ضائع ہو گئے جن کے تمام اعمال اور (دوزخ کی) آگ میں ہی یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ، اَنْ يَّعْمُرُوْا سے جملہ محل رفع میں کان کا اسم ہے۔ شٰهِدِيْنَ حال ہے۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد ان کے لیے کوئی حج نہیں جب ان میں مسجد حرام سے روکنے کے بارے اعلان کر دیا گیا ہے۔ اور بیت اللہ شریف کے امور مثلاً خدمت کرنا، پانی پلانا اور نیابت کی ذمہ داری ادا کرنا مشرکین کے سپرد تھے، تو یہ بیان کر دیا کہ وہ اس کے اہل نہیں، بلکہ اس کے اہل مومن ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو (اسلام قبول کرنے سے قبل غزوہ بدر میں) جب قید کیا گیا اور انہیں کفر اور قطع رحمی کی عار دلائی گئی تو انہوں نے کہا: تم ہماری برائیاں تو ذکر کرتے ہو اور ہمارے محاسن اور خوبیاں ذکر نہیں کرتے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمہارے محاسن بھی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں بے شک ہم مسجد حرام کو آباد کرتے ہیں، کعبہ معظمہ کی خدمت اور دربانی کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور مشقت میں پھنسے ہوئے اور تکلیف زدہ کو رہائی دلاتے ہیں۔ تو یہ آیت اس کے رد میں نازل ہوئی۔

پس تب مسلمانوں پر مساجد کے احکام کی تولیت واجب ہو گئی اور مشرکوں کو ان میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ اس میں عام قراءت یعمر یا کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے یہ عمر یعمر سے ماخوذ ہے۔ ابن السمیقع نے یا کو ضمہ اور میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی (مشرکین کے لیے نہیں کہ) وہ اسے آباد کرنے والے یا اس کی آبادی اور تعمیر پر معاونت کرنے والے

ہوں۔ اور مَسْجِدَ اللّٰهِ واحد کی صورت میں بھی قراءت کی گئی ہے۔ مراد مسجد حرام ہے۔ اور یہ قراءت حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، ابن کثیر، ابوعمرو، ابن محیصن اور یعقوب رحمہم اللہ کی ہے۔ اور باقیوں نے مَسٰجِدَ تعمیم کی صورت میں قراءت کی ہے۔ اور یہی ابوعبید کی پسند ہے، کیونکہ اعم اور اخص عام کے تحت داخل ہوتے ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جمع کی قراءت سے بھی صرف مسجد حرام مراد ہو۔ اور یہ ان میں جائز ہے جو اسماء جنس میں سے ہو، جیسے کہا جاتا ہے: فلان یرکب الخیل اگرچہ وہ سوار تو صرف ایک گھوڑے پر ہو۔ اور مساجد پڑھنا زیادہ درست ہے، کیونکہ یہ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ میں جمع کی قراءت پر قراء نے اجماع کیا ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: بے شک مساجد کہا ہے اور مراد مسجد حرام ہے، کیونکہ وہ تمام مساجد کا قبلہ اور ان کی امام ہے۔ (1)

قولہ تعالیٰ: شٰهِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ مراد وھم شاھدون بہ (درآنحالیکہ وہ شہادت دیتے ہیں) اور جب ھم کو گرا دیا گیا تو اسے (یعنی شاھدین) کو منصوب پڑھا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کی اپنے نفسوں پر کفر کی گواہی ان کا اپنے بتوں کو سجدہ کرنا ہے (2) اور ان کا یہ اقرار کرنا ہے کہ وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کی کفر کے بارے شہادت یہ ہے کہ تو نصرانی کو کہتا ہے تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: نصرانی اور یہودی سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے: یہودی اور صابی سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے: صابی۔ اور کسی مشرک کو کہا جائے: تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے: مشرک۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِی النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴿۱۸﴾

"صرف وہی آباد کر سکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور قائم کیا نماز کو اور ادا کیا زکوٰۃ کو اور نہ ڈرتا ہو اللہ کے سوا کسی سے پس امید ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں ہدایت پانے والوں سے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ یہ اس پر دلیل ہے کہ مساجد کو آباد کرنے والوں کے لیے ایمان کی شہادت دینا صحیح ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے اس کے ساتھ ہی مربوط کیا ہے اور اسی کے بارے مساجد کو لازم پکڑنے کی خبر دی ہے۔ اور بعض سلف نے کہا ہے: جب تم کسی آدمی کو دیکھو وہ مسجد آباد کر رہا ہے تو تم اس کے ساتھ حسن ظن رکھو۔ ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم کسی آدمی کو دیکھو وہ مسجد کے اہتمام کا عادی ہے تو تم اس کے لیے ایمان کی شہادت دو"۔ (3) (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ

1۔ تفسیر بغوی 2۔ ایضاً
3۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی حرمۃ الصلاۃ، حدیث نمبر 2542، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب لزوم المساجد وانتظار الصلاۃ، حدیث نمبر 793، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ اور ایک روایت میں ہے "وہ مسجد کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتا ہے" فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ظاہر اور درست اور صحیح ہونے کے بارے میں ہے شہادت کے قطعی مقام کے بارے میں نہیں ہے، کیونکہ عارفین کے نزدیک شہادت کے مختلف احوال ہیں، کیونکہ ان میں کوئی انتہائی ذہین وفطین ہوتا ہے وہ ایسی شے کو حاصل کر لیتا ہے جس سے اسے کسی چیز کے اعتقاد اور خبر کا علم ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سے بعض اس سے عاری ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے مقام اور مرتبہ پر ہوتا ہے اور اپنے وصف پر قائم ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ اگر کہا جائے: کوئی مومن نہیں ہے مگر وہ غیر اللہ سے ڈرتا ہے۔ اور مومنین اور انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اپنے سواد شمن سے ڈرتے رہے۔ تو جواب یہ دیا جائے گا کہ اس کا معنی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان میں سے کسی سے نہ ڈرتا ہو جن کی عبادت کی جاتی ہے، کیونکہ مشرکین بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان سے ڈرتے بھی ہیں اور ان سے امیدیں بھی وابستہ رکھتے ہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ دین کے باب میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈرتا ہو۔(1)

مسئلہ نمبر 3۔ اور کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آیت میں ان کے لیے ایمان ثابت کیا ہے جنہوں نے مساجد کو نماز کے ساتھ، ان کی صفائی اور ان کی کسی بوسیدہ چیز کی مرمت اور اصلاح کر کے آباد کیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا۔ اور اس میں ایمان بالرسول کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس کا کوئی ایمان نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان نہیں لایا۔ تو اسے یہ کہا جائے گا: آیت میں جو اقامت صلوٰۃ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے وہی ایمان بالرسول پر دلیل ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ پس نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا بلا شبہ اس کی طرف سے صحیح ہوتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو۔ پس اسی لیے اسے علیحدہ ذکر نہیں کیا اور عسیٰ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ واجب (اور ثابت) کے معنی میں ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے(2) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عسیٰ بمعنی خلیق ہے اسی خلیق۔ اَنْ یَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (پس لائق اور مناسب ہے کہ وہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں)

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۞

"کیا تم نے ٹھہرا لیا ہے حاجیوں کو پانی پلانے (والے) کو اور مسجد حرام کے آباد کرنے (والے) کو اس شخص کی مانند جو ایمان لے آیا اللہ پر اور روز قیامت پر اور جہاد کیا اس نے اللہ کی راہ میں۔ وہ نہیں یکساں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ان لوگوں کو جو ظالم ہیں"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ عربی میں تقدیر یہ ہے: أجعلتم أصحاب سقاية الحاج أو أهل سقاية الحاج، مثل من آمن باللہ و جاهد في سبيله (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والوں کو ان کی مثل بنا لیا ہے جو اللہ

1۔ معانی القرآن للزجاج، جلد 2، صفحہ 436

2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 376

تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا) اور صحیح یہ ہے کہ من امن میں حذف کو مقدر مانا جائے یعنی أجعلتم عمل سقی الحاج کعمل من آمن (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے کے عمل کو ایمان لانے والے کے عمل کی مثل بنا لیا ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر کلام ہے کایمان من آمن (یعنی اس کے ایمان کی مثل جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا) السقایۃ یہ مصدر ہے جیسا کہ السعایۃ اور الحمایۃ مصدر ہیں۔ اور اسم کو مصدر کے محل میں رکھا گیا ہے، کیونکہ اس کا معنی معلوم ہے، جیسے کہا جاتا ہے: انما السخاء حاتم، وانما الشعر زھیر (بلاشبہ سخاوت تو حاتم کی ہے اور شعر زہیر کا ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ عمارۃ المسجد الحرام، واسأل القریۃ کی مثل ہے۔ ابو وجزہ نے أجعلتم سقاۃ الحاج وعمرۃ المسجد الحرام پڑھا ہے۔

سقاۃ، ساق کی جمع ہے۔ اور اصل میں یہ سقیۃ ہے یہ فُعلتہ کے وزن پر ہے، اس سے معتل کی جمع اسی طرح بنائی جاتی ہے، جیسے قاض کی جمع قضاۃ اور ناس کی جمع نساۃ ہے۔ اور اگر یہ معتل نہ ہو تو فعلۃ کے وزن پر جمع بنائی جائے گی جیسے ناسی کی جمع نساۃ ہے، یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو مہینوں میں نسی کا عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح ابن زبیر اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے سقاۃ وعمرۃ پڑھا ہے، مگر ابن جبیر نے عمرۃ میں تنوین کے ارادہ پر المسجد کو نصب دی ہے۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سقایۃ سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور الحاج، الحجاج کی اسم جنس ہے۔ اور عمارۃ المسجد الحرام سے مراد اس کی حفاظت، دیکھ بھال اور اس کے مصالح کا اہتمام کرنا ہے۔

اس آیت کا ظاہر بلاشبہ اس کے قول کو باطل کرتا ہے مشرکین میں سے جس نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے پر فخر کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام اور جہاد کے ساتھ اظہار فخر کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصدیق کر دی اور ان دونوں کو جھٹلا دیا اور یہ خبر دے دی کہ مسجد کی آبادی کفر کے ساتھ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ایمان، عبادت اور طاعت و فرمانبرداری کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور یہ اتنا بین اور واضح ہے جس پر کوئی غبار نہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ مشرکوں نے یہودیوں سے سوال کیا اور کہا: ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور مسجد حرام کو آباد کرتے ہیں، کیا ہم افضل ہیں یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے اصحاب؟ تو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عناد رکھنے کی وجہ سے انہیں کہا: تم افضل ہو۔ اور یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ وہ ہے جو صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر شریف کے پاس تھا تو ایک آدمی نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں اسلام کے بعد کوئی عمل نہ کروں مگر یہ کہ میں حاجیوں کو پانی پلاؤں۔ اور دوسرے نے کہا: مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں اسلام کے بعد کوئی عمل نہ کروں مگر یہ کہ میں مسجد حرام کو آباد کرتا رہوں۔ اور ایک تیسرے نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا اس سے افضل ہے جو تم نے کہا ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جھڑکا اور فرمایا: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر کے پاس اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ اور وہ جمعہ کا دن تھا۔ لیکن جب جمعہ کی نماز پڑھ لی گئی تو میں آپ کے پاس داخل ہوا اور آپ سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا جس میں تم نے اختلاف کیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ الی آخر الآیہ

اور یہ سیاق تقاضا کرتا ہے کہ بے شک یہ آیت مسلمانوں کے ان اعمال میں سے افضل کے بارے اختلاف کے وقت نازل ہوئی۔ اور اس وقت یہ مناسب نہیں کہ ان کے لیے آیت کے آخر میں یہ کہا جائے: وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ پس اشکال متعین ہو گیا۔ اور اس کا ازالہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے گا: بے شک بعض راویوں سے اپنے اس قول فانزل اللہ الآیۃ (پس اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی) میں تسامح ہوا ہے۔ بلاشبہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس وقت یہ آیت پڑھی جس وقت انہوں نے آپ کے سامنے عرضداشت پیش کی تو اس سے راوی کو یہ گمان ہوا کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی۔ اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جہاد اس سے افضل ہے جو ان لوگوں نے کہا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا اور ان کے لیے فتویٰ طلب کیا اور تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ پر وہ آیت تلاوت فرمائی جو آپ پر نازل کی گئی تھی، نہ یہ کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم

پھر اگر یہ کہا جائے کہ اس بنا پر تو مسلمانوں پر استدلال کرنا اس سے جائز ہوا جو کافروں کے بارے نازل کیا گیا اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اس کے احکام مختلف ہیں۔ تو کہا جائے گا: یہ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مشرکوں کے بارے میں نازل کیا ہے اس سے وہ احکام نکال لیے جائیں جو مسلمانوں کے لائق اور مناسب ہوں۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک اگر ہم چاہیں تو ہم بھنا ہوا گوشت لے لیں اور اسے بڑے بڑے ... لے لیں، کھ دیا جائے اور دوسرے کو پیش کر دیا جائے، لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن رکھا ہے: اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (الاحقاف: 20) (تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھا لیا تھا تم نے ان سے) اور یہ آیت ... کے بارے میں نص ہے اور اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے اس زجر و توبیخ کے حکم کو سمجھ لیا جو من وجہ ان کے احوال سے مناسبت رکھتا تھا اور صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ پس یہ ممکن ہے کہ یہ آیت اسی نوع سے ہو۔ اور یہ انتہائی عمدہ اور نفیس ہے اور اس سے اشکال زائل ہو جاتا ہے اور ابہام اٹھ جاتا ہے، واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰

"جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، بہت بڑا ہے (ان کا) درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ اور یہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور اس کی خبر اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ اور دَرَجَةً بیان (اور تمیز) ہونے کی بنا پر منصوب ہے (1)، یعنی (ان کا درجہ ان کی نسبت بہت بڑا ہے) جنہوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کو آباد کرنے کے ساتھ فخر کیا۔ اور کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی درجہ نہیں کہ کہا جائے: المومن اعظم درجۃ (کہ مومن درجہ کے اعتبار سے بہت بڑا ہے) اور مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لیے مسجد کو آباد کرنے اور حاجیوں

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 207

کو پانی پلانے کے سبب ایک درجہ اور رتبہ کا اندازہ لگایا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر خطاب کیا جو انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں اندازہ لگایا اگرچہ وہ اندازہ مقرر کرنا غلطی اور خطا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا (الفرقان: 24) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَعْظَمُ دَرَجَةً، من کل ذی درجة یعنی ان کا درجہ ہر صاحب درجہ سے زیادہ اور بلند رتبہ ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ اور یہی ہیں جو اس کے سبب کامیاب ہونے والے ہیں۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

”خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی اور (ایسے) باغات کی کہ ان کے لیے ان میں دائمی نعمت ہوگی۔ ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ اس میں تا ابد، بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہی اجر عظیم ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں بتا رہا ہے اس بہت بڑے ثواب اور ہمیشہ رہنے والی نعمت کے بارے جو آخرت میں ان کے لیے ہوگی۔ اور نعیم سے مراد زندگی کا پرسکون اور خوشحال ہونا ہے۔ خٰلِدِيْنَ یہ حال کی بنا پر منصوب ہے۔ اور الخلود کا معنی مقیم رہنا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے دار کرامت میں وہ ثواب تیار کر رکھا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

”اے ایمان والو! نہ بنالو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دلی دوست اگر وہ پسند کریں کفر کو ایمان پر اور جو دوست بناتا ہے انہیں تم میں سے تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں“۔

اس آیت کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خطاب تمام کے تمام مومنوں کے لیے ہے اور مومنوں اور کافروں کے مابین ولایت کو منقطع کرنے والا یہ حکم یوم قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ اور ایک جماعت نے یہ روایت کیا ہے کہ یہ آیت بلاشبہ ہجرت پر ابھارنے کے لیے اور کافروں کے شہروں کو چھوڑنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر یہ خطاب ان مومنوں کے لیے ہے جو مکہ مکرمہ اور اس کے علاوہ بلاد عرب میں سے دیگر شہروں میں رہتے تھے۔ انہیں خطاب کیا گیا کہ وہ باپوں اور بھائیوں کو والی اور دوست نہ بنالیں کہ وہ بلاد کفر میں رہائش کے دوران ان کے تابع ہوجائیں۔ (1)

اِنِ اسْتَحَبُّوا یعنی اگر وہ پسند کریں: (اس میں استحبوا بمعنی احبوا ہے) جیسے کہا جاتا ہے: کہ استجاب بمعنی اجاب ہے۔ یعنی تم ان کی اطاعت نہ کرو اور نہ تم انہیں خاص کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آباء اور بھائیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ ان سے بڑھ کر اور کوئی قریب تر قرابت نہیں۔ پس ان کے درمیان موالات اور دوستی کی نفی ایسی ہی ہے جیسے لوگوں کے درمیان اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 17

تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ اس کی نفی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ (المائدہ: 51)
تاکہ وہ یہ بیان کر دے کہ بے شک حقیقی قرب ادیان کا قرب ہے نہ کہ ابدان کا قرب۔ اور اس کی مثل میں صوفیہ کہتے ہیں:

يقولون لي دار الأحبة قد دنت وأنت كئيبٌ إنّ ذا لعجيب

وہ مجھے کہتے ہیں محبوبوں کی بستی قریب ہے اور تو غمگین ہے بے شک یہ عجیب بات ہے۔

فقلت وما تغني ديارٌ قريبة إذا لم يكن بين القلوب قريب

تو میں نے کہا: گھروں کا قریب ہونا کیا فائدہ دے سکتا ہے جب دلوں کے درمیان قرب اور نزدیکی نہ ہو۔

فكم من بعيد الدار نال مُرادَه و آخر جارُ الجَنْب مات كئيب

پس کتنے دور رہنے والے ہیں کہ اس نے اپنا مقصود پا لیا ہے اور دوسرا پہلو میں رہنے والا پڑوسی غمزدہ حالت میں مایوس ہو کر مر گیا۔

اس آیت میں بیٹوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ انسانوں میں اغلب یہی ہے کہ بیٹے باپوں کے تابع ہوتے ہیں (1)۔ اور احسان اور ہبہ ولایت سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک میری ماں انتہائی رغبت رکھتے ہوئے میرے پاس آئی اور وہ مشرک ہے کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صلی أمك تو اپنی ماں سے مل (حسن سلوک سے پیش آ) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (2)۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (اور جو تم میں سے انہیں دوست بناتا ہے) وہ انہی کے مثل مشرک ہے، کیونکہ جو شرک کے ساتھ راضی ہوا تو وہ مشرک ہی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ﰳاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾

"(اے حبیب!) آپ فرمائیے: اگر ہیں تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیارے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو نافرمان ہے"۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو ایک آدمی اپنے باپ کو اور باپ اپنے بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو اور آدمی اپنی بیوی کو کہنے لگا: بے شک ہمیں ہجرت کا حکم دیا گیا ہے۔ تو ان میں سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 17
2۔ صحیح بخاری، باب صلة المرأة امها ولها زوج، حدیث نمبر 5521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بعض نے اس کے لیے تیزی اور جلدی کی۔ اور بعض نے ہجرت کرنے سے انکار کیا۔ تو وہ کہتا: قسم بخدا! اگر تم دار الہجرت کی طرف نہ نکلے میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں دوں گا اور نہ تم پر کبھی کوئی شی خرچ کروں گا۔ اور ان میں سے وہ بھی تھے جس کے ساتھ اس کی بیوی اور اولاد چمٹ گئی اور وہ اسے کہنے لگے: میں تجھے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تو نہ نکل پس تیرے بعد ہم ضائع ہو جائیں گے۔ پھر ان میں سے بعض تھے جو نرم ہو گئے اور انہوں نے ہجرت کو چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ مقیم ہو گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ رب کریم فرما رہا ہے: اگر انہوں نے مکہ مکرمہ میں رہنے کو پسند کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے اور مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے پر وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں) پھر جو پیچھے رہ گئے اور انہوں نے ہجرت نہ کی ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ اور یہ (عشیرہ) وہ جماعت ہے جو ایک عقد کی طرف راجع ہو جیسے دس یا زیادہ افراد کا عقد کرنا۔ اور اسی سے المعاشرۃ ہے اور اس کا معنی کسی شے پر جمع ہونا ہے۔ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وہ فرما رہا ہے: اور وہ اموال جو تم نے مکہ مکرمہ میں کمائے۔ اور اقتراف کا اصل معنی کسی شے کا اپنی جگہ سے دوسرے کی طرف کٹ جانا، منتقل ہو جانا ہے۔

وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا حضرت ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ بیٹیاں اور بہنیں ہیں جب گھر میں ان کا مندا ہو جائے تو وہ اپنے لیے کوئی دعوت نکاح دینے والا نہیں پاتیں۔ شاعر نے کہا ہے:

كَسَدْنَ من الفقرِ فی قومهنّ وقد زادهنّ مقامی كُسودا

وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ وہ فرما رہا ہے: اور وہ گھر جن میں اقامت اختیار کرنا تمہارے لیے پسندیدہ ہے۔

اَحَبَّ اِلَیْكُمْ (یہ تمہارے نزدیک زیادہ محبوب ہو جائے) اس سے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ طیبہ میں ہجرت کرو۔ واحب یہ کان کی خبر ہے اور غیر قرآن میں مبتدا اور خبر ہونے کی بنا پر أحب کو مرفوع پڑھنا بھی جائز ہے، اور کان کا اسم اس میں مضمر ہے، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

إذا متُّ كان الناسُ صنفان شامِتٌ وآخَرُ مُثْنٍ بالذی كنتُ أصنعُ

هی الشفاء لدائی لو ظفِرتُ بها ولیس منها شفاءُ الداء مبذول

اور آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واجب ہے اور امت کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ کہ یہ ہر محبوب پر مقدم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا معنی و مفہوم سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا اس میں تربصوا صیغہ امر ہے اور اس کا معنی تہدید ہے۔ وہ فرما رہا ہے: پس تم انتظار کرو۔ حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قتال اور فتح مکہ کے بارے حکم لے آئے، یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

حسن نے کہا ہے: یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اخروی یا دنیوی سزا کا حکم لے آئے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ میں فضیلت جہاد پر دلیل ہے اور اسے راحت نفس اور اسے اہل و مال کے ساتھ چمٹائے رکھنے پر ترجیح دینے پر دلیل ہے۔ سورت کے آخر میں جہاد کی فضیلت کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہجرت سے متعلقہ احکام سورۃ النساء میں گزر چکے ہیں اور وہ کافی ہیں۔ والحمد للہ۔ اور حدیث صحیح میں ہے "بے شک شیطان ابن آدم کے لیے تین مقامات پر بیٹھا وہ اس کے لیے اسلام کی راہ میں بیٹھا اور کہا: تو اپنا دین اور اپنے آباؤ اجداد کا دین کیوں چھوڑتا ہے؟ تو اس نے اس کی مخالفت کی اور اسلام قبول کر لیا پھر وہ اس کے لیے ہجرت کی راہ میں بیٹھا، کیا تو اپنے مال اور اپنے گھر والوں کو چھوڑتا ہے؟ پس اس نے اس کی مخالفت کی اور ہجرت کی۔ پھر وہ جہاد کے راستے میں بیٹھا اور اسے کہا: تو جہاد کرے گا تو تو قتل کر دیا جائے گا اور تیری بیوی (نیا) نکاح کرے گی اور تیرا مال تقسیم کر دیا جائے گا، تو اس نے اس کی مخالفت کی اور جہاد کیا، پس اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے"۔ امام نسائی نے اسے سبرہ بن ابی فاکہ کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الشیطان ... اور آگے مذکورہ حدیث ذکر کی ہے۔ بخاری نے کہا ہے: ابن الفاکہ اور اس میں اختلاف ذکر نہیں کیا۔ اور ابن ابی عدی نے کہا ہے: ابن الفاکہ اور ابن ابی الفاکہ کہا جاتا ہے۔ انتہی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

"بے شک مدد فرمائی تمہاری اللہ نے بہت سے جنگی میدانوں میں اور حنین کے روز بھی، جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) کچھ بھی اور تنگ ہو گئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے، پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔ پھر نازل فرمائی اللہ نے اپنی (خاص) تسکین اپنے رسول پر اور اہل ایمان پر اور اتارے وہ لشکر جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے کافروں کی۔ پھر رحمت سے توجہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد جس پر چاہے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ جب بنی ہوازن کو مکہ مکرمہ فتح ہونے کی خبر پہنچی تو مالک بن عوف النصری جو بنی نصر بن مالک میں سے تھا، نے انہیں جمع کیا اور تمام لشکر میں ریاست و حکومت اسی کی تھی اور وہ کفار کو ان کے مالوں، مویشیوں، عورتوں اور ان کی اولاد سمیت ساتھ لے کر چلا۔ اور اس کا خیال یہ تھا کہ اس کے سبب ان

کی جائیں محفوظ رہیں گی اور اس طرح جنگ میں ان کی قوت وطاقت انتہائی مضبوط ہو گی۔ حضرت حسن اور مجاہد رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ ہوازن وثقیف میں سے چار ہزار تھے۔ اور ہوازن پر مالک بن عوف اور ثقیف پر کنانہ بن عبد سالار تھا۔ پس وہ اوطاس میں اترے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے (یعنی جاسوسی کرنے کے لیے) بھیجا پس وہ آئے اور جو کچھ ان کے بارے میں دیکھا تھا اس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے پختہ عزم کیا۔ اور صفوان بن امیہ بن خلف جمی سے کچھ زرہیں عاریۃً لیں، کہا گیا ہے کہ وہ سو زرہیں تھیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ چار سو زرہیں تھیں۔ اور ربیعہ مخزومی سے تین ہزار یا چالیس ہزار قرض لیے، پھر جب آپ آئے تو آپ نے اسے وہ ادا کر دیئے۔ پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھے تیرے گھر والوں میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ بے شک قرض کی جزا اور بدلہ اسے پورا کرنا اور شکر ادا کرنا ہے'' (1)۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ہزار مسلمانوں کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ ان میں سے دس ہزار وہ صحابہ کرام تھے جو مدینہ طیبہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے تھے اور یہ اس کے بارے میں آزاد تھے جو کوئی اعرابیوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ملا۔ یہ سلیم بن کلاب، عبس اور ذبیان میں سے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ پر عامل مقرر کیا۔ اور آپ کے اس سفر کے دوران جاہل اعرابیوں نے ایک سرسبز شاداب درخت دیکھا اور ان کے لیے زمانہ جاہلیت میں معروف درخت تھا اس کا نام ذات انواط تھا۔ کفار سال میں ایک معین دن میں اس کی طرف نکلتے تھے اور وہ اس کی تعظیم بجالاتے تھے۔ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لیے بھی اسی طرح ایک ذات انواط بنا دیجئے جیسے ان کے لیے ذات انواط ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ اکبر قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم نے اس طرح کہا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا (کہ) ہمارے لیے الٰہ بنا دیجئے جیسے ان کے لیے الٰہ ہیں تو فرمایا: بلاشبہ تم جاہل قوم ہو تو یقیناً تم بھی برابر برابر اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلو گے یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو تم بھی اس میں داخل ہو گے''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے یہاں تک کہ آپ وادی حنین میں آ گئے۔ اور یہ تہامہ کی وادیوں میں سے ہے اور ہوازن وادی کی دونوں طرفوں میں چھپے ہوئے تھے اور یہ صبح کے وقت آخر شب کی تاریکی میں تھے، پس انہوں نے ایک آدمی کی طرح یکبارگی مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور جمہور مسلمان پسپا ہو گئے اور کسی نے کسی کی طرف مڑ کر نہ دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت قدم رہے اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور آپ کی اہل بیت میں سے حضرت علی، حضرت عباس، ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب اور ان کے بیٹے حضرت جعفر اور حضرت اسامہ بن زید، حضرت ایمن بن عبید اور وہ ایمن بن ام ایمن تھے جو اس دن حنین میں شہید ہوئے۔ اور حضرت ربیعہ ابن حارث اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہم بھی ثابت قدم رہے۔ اور جعفر بن ابی سفیان کی جگہ میں قثم بن عباس بھی کہا

1۔ سنن ابن ماجہ، باب حسن القضاء، حدیث نمبر 2414، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گیا ہے۔ پس یہ دس افراد تھے۔ اسی لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا:

نصرنا رسولَ الله في الحرب تسعةً وقد فرّ مَن قد فرّ عنه وأقشعوا

ہم نو نے جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی حالانکہ جو آپ سے بھاگ گئے وہ بہت دور چلے گئے۔

وعاشرنا لاقَی الحمام بنفسه بما مسّه في الله لا يتوجّع

اور ہم میں سے دسویں کی ذات نے موت سے جا ملاقات کی اس تکلیف کے سبب جو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں آئی اور اس نے کوئی درد محسوس نہیں کیا۔

ام سلیم بھی ان تمام کے ساتھ ثابت قدم رہی جو ثابت قدم رہے، درآنحالیکہ وہ حضرت ابوطلحہ کے اونٹ کی رسی کو کمر سے باندھ کر مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی اور اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پسپا نہیں ہوئے اور نہ ہی ان میں کوئی پسپا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شہباء خچر پر سوار تھے اور اس کا نام دلدل تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھا اور میں اس ارادے سے اسے روکتا تھا کہ وہ تیز نہ چلے اور ابوسفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب تھامے ہوئے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عباس! ببول کے درخت والوں کو بلاؤ'' (مراد اصحاب شجرہ ہیں جو بیعت رضوان میں شریک تھے) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ بہت بلند آواز والے آدمی تھے۔ اور آپ کی آواز کی شدت کے بارے روایت کیا جاتا ہے کہ ایک دن مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیا گیا تو انہوں نے آواز لگائی واصباحاہ! تو جس حاملہ عورت نے آپ کی آواز سنی اس نے اپنا جنین گرا دیا۔ پس میں نے بلند آواز کے ساتھ کہا: اصحاب شجرہ کہاں ہیں؟ آپ فرماتے ہیں: قسم بخدا! جس وقت انہوں نے میری آواز سنی تو وہ اس کی طرف مائل ہوئے اور لپک کر آئے جیسے گائے اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے۔ اور انہوں نے جواب دیا: یالبیک یالبیک (ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں) انہوں نے بیان کیا: پھر وہ کفار کے ساتھ لڑنے میں مشغول ہو گئے الحدیث (1)۔

اور اس میں ہے: فرمایا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگریزے اٹھائے اور انہیں کفار کے چہروں پر پھینک دیا''۔ پھر فرمایا: ''حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم وہ شکست کھا گئے''۔ فرمایا پس میں دیکھتا چلا گیا تو جنگ اپنی اسی ہیئت پر تھی جس میں میں اسے دیکھتا رہا۔ فرمایا: قسم بخدا! وہ نہیں ہوا مگر ان سنگریزوں کے سبب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پھینکے۔ پس میں مسلسل ان کی تیز دھار تلواروں کو کند ہوتا اور ان کے معاملے کو پیٹھ پھیرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ابوعمرو نے کہا ہے: ہم نے کئی اسناد سے ان بعض افراد سے روایت بیان کی ہے جو مشرکین میں سے اسلام لائے تھے اور غزوۂ حنین میں حاضر تھے کہ انہوں نے بیان کیا درآنحالیکہ ان سے غزوۂ حنین کے بارے پوچھا گیا: ہم مسلمانوں سے ملے (مقابلہ کیا) زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہم نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا اور ہم نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ ہم اس آدمی تک پہنچ گئے جو سفید خچر پر سوار تھا، پس جب اس نے ہمیں دیکھا تو اس نے ہمیں سخت جھڑکا اور ہم سہم گئے، خوفزدہ ہو گئے اور اس نے اپنی ہتھیلی میں کنکریاں

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1775

اور مٹی اٹھائی اور اسے پھینک دیا اور زبان سے فرمایا: شاھت الوجوہ (چہرے بدشکل ہوں)
پس کوئی آنکھ نہ بچی جس میں وہ مٹی داخل نہ ہوئی ہو اور ہم اپنے نفسوں کے مالک نہ رہے کہ ہم الٹے پاؤں واپس لوٹ جائیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہمیں مشرکوں میں سے ایک آدمی نے حنین کے دن کے بارے بیان کیا کہ جب ہمارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب سے آمنا سامنا ہوا تو وہ بکری دو ہنے کی مقدار بھی ہمارے سامنے نہ ٹھہرے، یہاں تک کہ جب ہم شہباء خچر والے...... یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم...... کے پاس پہنچے تو سفید چہروں والے خوبصورت آدمی ہمارے سامنے آ گئے۔ اور انہوں نے ہمارے لیے کہا: شاھت الوجوہ واپس لوٹ جاؤ، پس ہم واپس لوٹ گئے اور وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے اور وہ وہ تھے یعنی ملائکہ تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ شاھت الوجوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول بھی ہو اور ملائکہ کا قول بھی ہو اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ملائکہ نے حنین کے دن جنگ لڑی۔ فاللہ اعلم۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ حنین میں اپنے ہاتھ سے چالیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار ہزار افراد کو قیدی بنایا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ قیدی چھ ہزار تھے اور بارہ ہزار اونٹ تھے یہ اس کے سوا ہے جو مال غنیمت معلوم نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس غزوہ کے بارے میں علماء نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی آدمی کو قتل کیا اور اس کے پاس اس پر بینہ موجود ہو تو اس سے چھینا ہوا مال اسی کے لیے ہوگا''۔ اور اس کا بیان سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسی نکتہ اور دیگر قرائن کی وجہ سے احکام بیان کرنے والوں نے اس آیت کو احکام میں داخل کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اس میں یہ بھی ہے کہ ہتھیار عاریۃً لینا جائز ہے، عاریۃً لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس معہود کی مثل ہو جس کے لیے عاریۃً لیا جا سکتا ہو اور امام کا حاجت کے وقت مال کو خرچ کرنا جائز ہے اور پھر وہ اسے اس کے مالک تک واپس لوٹا دے۔ اس باب میں صفوان کی حدیث اصل ہے۔ اور اس غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ''کسی حاملہ سے وطی نہ کی جائے یہاں تک کہ وہ وضع حمل کر لے اور غیر حاملہ سے بھی وطی نہ کی جائے یہاں تک کہ وہ ایک کامل حیض گزار لے''۔ اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ قید عصمت کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اس کا مکمل بیان سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔ اور امام مالک کی حدیث میں ہے کہ صفوان اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلا کہ وہ کافر تھا، پس وہ حنین اور طائف میں حاضر ہوا اور اس کی بیوی مسلمان تھی۔ الحدیث۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے نہیں ہوا اور میں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ مشرکوں سے مشرکوں کے خلاف مدد طلب کی جائے مگر یہ کہ وہ خادم ہوں یا ملاح ہوں۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، ثوری اور امام اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اسلام کا حکم غالب ہو اور ان سے مدد طلب کرنا مکروہ ہے جب کہ شرک کا حکم بھی ظاہر ہو۔ ان کے حصص کے بارے میں گفتگو سورۃ الانفال میں گزر

چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ، حُنَيْنٍ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے اور یہ لفظ منصرف ہے کیونکہ یہ مذکر کا اسم ہے اور یہ قرآن کی لغت ہے۔ اور عربوں میں سے جو اسے غیر منصرف بناتے ہیں، وہ اسے بقعہ کا اسم بناتے ہیں۔ اور انہوں نے یہ شعر بیان کیا ہے:

نصروا نبیّهم و شدّوا أزره بحنینَ یومَ تواکلُ الأبطال

تو اس میں بحنین کو غیر منصرف پڑھا گیا ہے۔ اور یوم ظرف ہے اور اس معنی کی بنا پر یہاں منصوب ہے: و نصرکم یوم حنین اور فراء نے کہا ہے: مواطن منصرف نہیں ہے کیونکہ مفرد میں اس کی کوئی نظیر نہیں اور نہ اس کی جمع آتی ہے۔ مگر شاعر بسا اوقات مجبور ہوتے ہیں اور وہ جمع لے آتے ہیں اور نثر کلام میں وہ جائز نہیں ہوتا ہر وہ جو شعر میں جائز ہوتا ہے اور شعر بیان کیا:

فهن یعلُلْنَ حدائداتها

اور نحاس نے کہا ہے: میں نے ابو اسحاق کو اس پر تعجب کرتے ہوئے دیکھا ہے انہوں نے کہا ہے: انہوں نے خلیل کا قول لیا ہے اور اس میں خطا کی ہے، کیونکہ خلیل اس بارے میں کہتے ہیں: یہ منصرف نہیں ہے کیونکہ یہ جمع ہے جس کی واحد میں کوئی نظیر نہیں ہے اور نہ اس کی جمع مکسر بنائی جاسکتی ہے اور رہی جمع الف اور تا کے ساتھ تو یہ ممتنع نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ کہا گیا ہے کہ لشکر کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گیارہ ہزار پانچ سو تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ سولہ ہزار تھے۔ تو ان میں سے بعض نے کہا: آج کے دن قلت کے سبب ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے۔ پس انہیں اسی کلمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ تو پھر وہ ہوا جو ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ ابتدا میں ہزیمت کا سامنا ہوا یہاں تک کہ واپس لوٹ گئے، پس مسلمانوں کی مدد و نصرت اور کامیابی و کامرانی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تھی۔ تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کر دیا کہ غلبہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے سبب ہوتا ہے نہ کہ کثرت کے ساتھ۔ تحقیق ارشاد فرمایا: وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (آل عمران: 160) (اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ یعنی خوف کے سبب زمین تم پر تنگ ہوگئی باوجود اپنی وسعت کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

كأن بلادَ الله وهي عريضةٌ على الخائف المطلوب كِفّةُ حابِلِ

اور الرحب (را کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی وسعت ہے۔ تو اسی سے کہتا ہے: فلان رحب الصدر (فلاں وسیع سینے والا ہے) اور الرحب (را کے فتحہ کے ساتھ) کا معنی الواسع ہے۔ اسی سے تو کہتا ہے: بلد رحب (کھلا شہر) اور أرض رحبة (کھلی زمین) اور تحقیق رَحُبت ترحُب رحُبا و رَحابة (وسیع ہونا) اور کہا گیا ہے کہ بِمَا میں با معنی مع ہے، ای مع رحبها اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی علی ہے، یعنی علی رحبها۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی بِرحبها ہے اور ما مصدریہ ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ مسلم نے ابو اسحاق سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک آدمی حضرت براء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے ابا عمارہ! کیا تم غزوۂ حنین کے دن پیٹھ پھیر کر مڑے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے شہادت دیتا ہوں کہ آپ پیٹھ پھیر کر نہیں مڑے، بلکہ لوگوں میں سے جلد باز اور ہتھیار رو ں سے خالی لوگ بنی ہوازن کے اس قبیلہ کی طرف چلے۔ اور وہ تیر انداز قوم تھی انہوں نے یکبارگی ان پر تیروں کی بارش کر دی گویا کہ وہ مکڑی کا جتھہ ہے اور وہ ظاہر ہو گیا ہے۔ پس ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور ابو سفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کو پکڑے ہوئے تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے۔ دعا کی اور مدد طلب کی اور آپ یہ فرما رہے تھے: أنا النبی لا کذب أنا ابن عبد المطلب (میں یقیناً نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ نہیں اور میں عبد المطلب کا پوتا ہوں) اللّٰهُمَّ نزّل نصرك ''اے اللہ! اپنی مدد و نصرت نازل فرما'' حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: قسم بخدا! جب جنگ شدت کے ساتھ بھڑک گئی تو ہم اس سے ڈر رہے تھے اور جو ہم میں سے شجاع اور بہادر تھا وہ اس کے مقابلہ میں تھا۔ شجاع سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر انہیں سکون پہنچانے والی اور ان سے خوف دور کرنے والی چیز نازل فرمائی، یہاں تک کہ وہ پیٹھ پھیرنے کے بعد پھر مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے پر جری ہو گئے۔ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا اور اللہ تعالیٰ نے وہ لشکر اتارے جنہیں تم نہ دیکھ سکے اور وہ ملائکہ ہیں، وہ مومنوں کو ان خواطر اور ثابت قدم رہنے کے جذبات کے ساتھ طاقتور اور قوی بناتے رہے جو وہ ان کے دلوں میں ڈال رہے تھے اور کافروں کو بزدلی کے جذبات کے ساتھ کمزور کرتے رہے اس حیثیت سے کہ نہ وہ انہیں دیکھ سکے اور نہ وہ جنگ میں عملاً شریک ہوئے، کیونکہ ملائکہ نے غزوۂ بدر کے سوا کسی دن عملاً جنگ نہیں لڑی۔

اور روایت ہے کہ جنگ کے بعد بنی نصر کے ایک آدمی نے مومنوں کو کہا: وہ ابلق (چتکبرے) گھوڑے کہاں ہیں؟ اور وہ لوگ کہاں ہیں جو ان پر خود پہنے ہوئے تھے؟ ہم ان کے سامنے نہیں تھے مگر ناک کے بال کی طرح اور ہم فقط انہیں کے ہاتھوں سے قتل کیے گئے؟ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے اس بارے خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے''۔

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری تلواروں کے ساتھ کافروں کو عذاب دیا۔

وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۞ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ یعنی پھر اللہ تعالیٰ رحمت سے ان پر توجہ فرمائے گا جو شکست خوردہ ہوئے اور انہیں اسلام کی طرف ہدایت اور رہنمائی فرمائے گا (جنہیں چاہے گا) جیسا کہ مالک بن عوف نصری حنین کا سردار تھا اس کے ساتھ اس کی قوم بھی اسلام لے آئی۔

مسئلہ نمبر 8۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ کے مقام پر حنین کے مال غنیمت تقسیم فرمائے، تو ہوازن کا ایک وفد اسلام کا اظہار کرتے ہوئے، اپنے اوپر عطف و مہربانی چاہتے ہوئے اور اپنے اوپر احسان کرنے کی خواہش اور طلب لے کر حاضر ہوا اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک آپ سارے لوگوں سے بہتر اور لوگوں سے بڑھ کر نیکوکار ہیں۔ تحقیق آپ نے ہماری اولاد، ہماری عورتیں اور ہمارے اموال لے لیے ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''بلاشبہ

میں تمہارے بارے میں غور و فکر کرتا رہا حالانکہ تقسیم واقع ہو چکی ہے اور میرے پاس وہ ہیں جنہیں تم دیکھ رہے ہو اور بے شک بہترین قول وہی ہے جو زیادہ سچا ہو پس تم اپنی اولاد یا اپنے مالوں میں سے (ایک کو) اختیار کر لو"۔ تو انہوں نے عرض کی: ہم کسی شے کو بھی اولاد کے برابر قرار نہیں دیتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: "یہ لوگ مسلمان ہو کر ہمارے پاس آئے ہیں اور ہم نے انہیں اختیار دیا ہے اور انہوں نے اولاد کے برابر کسی کو نہیں قرار دیا پس تم ان کی اولاد واپس لوٹانے پر راضی ہو جاؤ پس جو میرے اور بنی عبد المطلب اور بنی ہاشم کے حصہ میں ہیں تو وہ ان کے لیے ہیں" (یعنی میں انہیں واپس لوٹاتا ہوں) تو یہ سن کر مہاجرین و انصار نے کہا: جو ہمارے حصہ میں ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہیں۔ اور اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن نے اپنی قوم کے ساتھ اس سے انکار کر دیا کہ وہ انہیں اس میں سے کوئی شے واپس لوٹائیں جو ان کے حصہ میں ہے اور اسی طرح عباس بن مرداس سلمی نے بھی انکار کر دیا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ اس کی قوم اس کے ساتھ اسی طرح تعاون کرے گی جیسا کہ اقرع اور عیینہ کے ساتھ ان کی قوم نے تعاون کیا، لیکن بنو سلیم نے انکار کر دیا اور کہا: بلکہ جو کچھ ہمارے لیے ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کسی نے تم میں سے اس کے بارے بخل کا اظہار کیا جو اس کے قبضے میں ہے تو ہم اسے اس کا معاوضہ ادا کریں گے"۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کی عورتیں اور بچے واپس لوٹا دیئے۔ اور جو اپنا حصہ خوشی کے ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے انہیں اتنا عوض عطا فرمایا کہ وہ اس سے راضی ہو گئے (1)۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہمیں بتایا گیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دایہ جس نے آپ کو دودھ پلایا تھا وہ بنی اسد سے تھی، وہ حنین کے دن آپ کے پاس حاضر ہوئی اور حنین کے قیدیوں کے بارے آپ سے درخواست کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک میں صرف اسی کا مالک ہوں جو حصہ مجھے ان سے ملا ہے البتہ تم کل صبح میرے پاس آؤ اور مجھ سے اور میرے پاس موجود لوگوں سے یہ درخواست کرو تو جب میں اپنا حصہ تمہیں عطا کر دوں گا تو لوگ بھی آپ کو دے دیں گے"۔ پس وہ دوسرے دن صبح حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے اپنا کپڑا بچھایا اور اس پر انہیں بٹھایا۔ پھر انہوں نے آپ سے درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا حصہ عطا فرما دیا۔ تو جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے حصص دے دیئے (2)۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ہوازن کے قیدیوں کی تعداد پورے چھ ہزار تھی۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھی۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: ان میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیماء بھی تھی اور یہ حارث بن عبد العزیٰ جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھا اور حضرت حلیمہ سعدیہ کی بیٹی تھی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عزت و تکریم دی اور اسے بہت نوازا اور اس کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کیا اور وہ انتہائی خوشی خوشی اپنے دین کے ساتھ اور اس مال کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا اپنے شہر واپس لوٹ گئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم اوطاس کو ایک عورت کو

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7073-6729 2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 389

دیکھا وہ دوڑ رہی ہے اور چیخ و پکار کر رہی ہے اور اسے قرار حاصل نہیں ہو رہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے پوچھا تو آپ کو بتایا گیا: اس نے اپنا بچہ گم کر دیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا کہ اس نے اپنے بچے کو پالیا ہے وہ اس سے پیار کر رہی ہے اور اسے قریب لا رہی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اپنے اصحاب کو فرمایا: اطارحة هذه ولدها في النار؟ (کیا یہ اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟) صحابہ کرام نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں؟''۔ انہوں نے عرض کی: اپنی شفقت (اور پیار و محبت) کی وجہ سے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الله أرحم بكم منها (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ اس سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے)۔ اسی معنی میں مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ والحمدللہ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

''اے ایمان والو! مشرکین تو بڑے ناپاک ہیں سو وہ قریب نہ ہونے پائیں مسجد حرام سے اس سال کے بعد اور اگر تم اندیشہ کرو تنگ دستی کا تو غنی کر دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اگر چاہے گا، بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ مشرک کے نجس (ناپاک ہونے) کے ساتھ متصف ہونے کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت قتادہ اور معمر بن راشد وغیرہما نے کہا ہے: کیونکہ وہ جنبی ہوتا ہے (اس لیے ناپاک ہے) کیونکہ جب وہ غسل جنابت کرے تو وہ غسل نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: بلکہ شرک ہی وہ شے ہے جس نے اسے نجس اور ناپاک بنا دیا ہے۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس نے مشرک کے ساتھ مصافحہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ وضو کرے۔ اور تمام مذاہب اس پر متفق ہیں کہ کافر جب اسلام قبول کرے تو اس پر غسل کرنا واجب ہوتا ہے، سوائے ابن عبدالحکم کے کیونکہ اس نے کہا ہے: یہ واجب نہیں ہے (1)، کیونکہ اسلام سابقہ سارے گناہ مٹا دیتا ہے۔ اور اس پر غسل کے واجب ہونے کا قول ابو ثور اور احمد نے کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ساقط کر دیا ہے اور کہا ہے: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ وہ غسل کرے اور اسی طرح ابن قاسم نے بیان کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ غسل کو نہیں پہچانتے۔ اسے ان سے ابن وہب اور ابن ابی اویس نے روایت کیا ہے اور حضرت ثمامہ اور قیس بن عاصم کی حدیث ان اقوال کا رد کرتی ہے ان دونوں کو ابو حاتم البستی نے اپنی صحیح مسند میں روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ثمامہ کے پاس سے گزرے اور وہ اسلام لا چکا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی طرف بھیجا اور اسے غسل کرنے کا حکم دیا۔ پس اس نے غسل کیا اور دو رکعتیں نماز پڑھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 20

نے فرمایا: "تحقیق تمہارے ساتھی کا اسلام حسین اور اچھا ہو گیا ہے"۔ اسی معنی میں اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ ثمامہ پر جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان فرمایا تو وہ مسجد کے قریب ایک نخلستان کی طرف چلا گیا اور غسل کیا۔ اور قیس بن عامر نے حکم دیا ہے کہ وہ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ غسل کرے۔ پھر اگر وہ بالغ ہونے سے پہلے اسلام لائے تو اس کا غسل کرنا مستحب ہے اور جب وہ اپنے بالغ ہونے کے بعد اسلام لائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے غسل جنابت کی نیت کرے۔ یہ ہمارے علماء کا قول ہے اور یہی مذہب کا ماحصل ہے۔

ابن قاسم نے کافر کے لیے جائز قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اسلام کی شہادت کا اظہار کرنے سے پہلے غسل کر لے، بشرطیکہ اپنے دل کے ساتھ اسلام کا اعتقاد رکھتا ہو۔ یہ نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف قول ہے اور اثر کے مخالف ہے۔ اور وہ اس لیے کہ کوئی بھی قول کے بغیر صرف نیت کے ساتھ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اہل السنت والجماعت کا ایمان کے بارے میں یہ قول ہے: بے شک یہ زبان کے ساتھ اقرار کرنے اور دل کے ساتھ تصدیق کرنے کا نام ہے اور عمل کے ساتھ یہ نمو پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (فاطر: 10) (اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے) (1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، فَلَا یَقْرَبُوا یہ نہی ہے۔ اسی وجہ سے اس سے نون حذف کر دی گئی ہے۔ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اس لفظ کا اطلاق پورے حرم پر کیا جاتا ہے، یہی حضرت عطا کا مذہب ہے۔ تب پورے حرم میں کسی مشرک کو داخل ہونے کی قدرت دینا حرام ہو گا پس جب کوئی ان کی طرف سے ہمارے پاس قاصد آئے تو امام مقام حل کی طرف نکلے تا کہ وہ (پیغام) سن سکے جو وہ کہتا ہے اور اگر کوئی مشرک چھپ کر حرم پاک میں داخل ہوا اور وہ مر گیا تو اس کی قبر اکھیڑ کر اس کی ہڈیاں نکال لی جائیں گی، نتیجۃً اس کے لیے اس کے اندر داخل ہونا جائز نہیں اور نہ اس سے گزرنا جائز ہے۔ اور رہا جزیرۃ العرب اور یہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمامہ، یمن اور اس کی بستیوں پر مشتمل ہے، پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو بھی دین اسلام پر نہیں وہ ان مقامات سے نکل جائے اور اس کے بارے متردد مسافروں کو نہیں روکا جائے گا اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، مگر آپ نے اس سے یمن کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ان کے لیے تین دنوں کی مدت مقرر کی جائے گی جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے اتنی مدت مقرر کی جس وقت آپ نے انہیں جلاوطن کیا۔ انہیں نہ تو اس میں دفن کیا جائے گا اور نہ انہیں حل کی طرف پناہ دی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا کفار کے مساجد اور مسجد حرام میں داخل ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس کے بارے پانچ قول ہیں: پس اہل مدینہ نے کہا ہے: یہ آیت تمام مشرکین اور تمام مساجد کے بارے عام ہے۔ اور اسی وجہ سے حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے عمال کی طرف لکھا اور اپنے خط میں اس آیت سے استدلال کیا۔ اور اس کی تائید یہ ارشاد گرامی بھی کرتا ہے: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ (النور: 36) (ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 209

کہ بلند کیے جائیں اور لیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام) اور کفار کا ان میں داخل ہونا ان کی رفعت شان کے خلاف ہے۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے: ''بے شک یہ مساجد بول وقذر میں سے کسی شی کی صلاحیت نہیں رکھتیں'' (1)۔ الحدیث (یعنی غلاظت سے انہیں پاک اور محفوظ رکھنا چاہیے) اور کافر ان سے خالی نہیں ہوتا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں مسجد کو کسی حائضہ عورت اور جنبی کے لیے حلال نہیں کروں گا''۔ اور کافر جنبی ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ میں تو اللہ تعالیٰ نے اسے نجس کا نام دیا ہے۔ پس یہ اس سے خالی نہیں کہ یہ نجس العین ہوگا یا پھر بطریق حکم اسے دور رکھا گیا ہوگا۔ اور جو صورت بھی ہو اسے مسجد سے روکنا واجب ہے، کیونکہ ان میں علت جو کہ نجاست ہے وہ موجود ہے اور مسجد میں حرمت موجود ہے۔

کہا جاتا ہے: رجل نجس، امرأۃ نجس، رجلان نجس، إمراتان نجس، رجال نجس اور رجال نجس و نساء نجس چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے نہ اس کا تثنیہ بنایا جائے گا اور نہ ہی جمع بنائی جائے گی۔ اور النجس (نون کے کسرہ اور جیم کی جزم کے ساتھ) تو یہ نہیں کہا جائے گا مگر تب جب اس کے ساتھ گندگی اور پلیدی (رجس) بھی ہو۔ پس جب مفرد ہو تو نَجِس (نون کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ) اور نَجُس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) کہا جائے گا۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت تمام مشرکین کے بارے میں عام ہے اور مسجد حرام کے بارے میں خاص ہے، لہٰذا کسی اور مسجد میں داخل ہونے سے انہیں نہیں روکا جائے گا۔ انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے تمام مساجد میں داخل ہونے کو مباح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ان کی طرف سے ظاہر پر جمود ہے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یہ شرک اور نجاست کے ساتھ علت پر تنبیہ ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کو مسجد میں باندھا تھا اور وہ مشرک تھا۔ تو اسے یہ کہا جائے گا: ہمارے علماء نے اس حدیث کے کئی جوابات دیئے ہیں اگر یہ صحیح ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ واقعہ نزول آیت سے پہلے کا تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے اسلام لانے کے بارے میں علم تھا اس لیے آپ نے اسے وہاں باندھا۔ اور تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک معین فرد کا قضیہ ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ اس کے ساتھ ان ادلہ کا دفاع کیا جائے جو ہم نے ذکر کی ہیں، کیونکہ وہ قاعدہ کلیہ کے حکم کو مقید کرتی ہیں اور یہ کہا جانا ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسجد میں باندھا ہو تا کہ وہ مسلمانوں کی نماز کے حسن اور ان کے اجتماع کو اور مسجد میں ان کے بیٹھنے کے آداب کے حسن و جمال کو دیکھے، تو وہ اس سے مانوس ہو جائے اور اسلام قبول کر لے۔ اور اسی طرح ہوا۔ اور یہ کہا جانا بھی ممکن ہے کہ ان کے پاس مسجد کے سوا اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ اسے باندھ سکتے۔ واللہ اعلم

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: یہود و نصاریٰ کو مسجد حرام یا کسی اور مسجد میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا اور مشرکوں اور بت پرستوں کے سوا کسی کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے نہیں روکا جائے گا۔ اور یہ ایسا قول ہے جسے آیت وغیرہ میں سے جو ہم نے ذکر کیا ہے وہ سب رد کرتا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 20

الکیا طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذمی کے لیے بغیر حاجت کے تمام مساجد میں داخل ہونا جائز ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حاجت کا اعتبار کیا جائے گا اور حاجت کے ساتھ بھی مسجد حرام میں داخل ہونا جائز نہیں۔ اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حرم پاک سارے کا سارا قبلہ اور مسجد ہے، پس چاہیے کہ انہیں حرم پاک میں داخل ہونے سے منع کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (الاسراء: 1) ((ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے) اور بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ام ہانی کے گھر سے اٹھایا گیا۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی مشرک مسجد حرام کے قریب نہ جائے، سوائے اس کے جو صاحب جزیہ (جزیہ دینے والا) ہو یا کسی مسلمان کا کافر غلام ہو۔ اسماعیل بن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ یحییٰ بن عبد الحمید نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا ہمیں شریک نے اشعث سے انہوں نے حسن سے انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی مشرک مسجد کے قریب نہ جائے سوائے اس کے کہ وہ کسی کا غلام یا کنیز ہو پس وہ کسی حاجت اور ضرورت کے لیے اس میں داخل ہو سکتا ہے“ (1)۔ اور اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: عموم مشرک کو مسجد حرام کے قریب جانے سے روکتا ہے اور اسے غلام اور لونڈی کے حق میں خاص کر دیا گیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا اس بارے میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس سال سے مراد 9 ہجری کا سال ہے جس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج ادا کیا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ مراد 10 ہجری ہے۔ یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور یہی وہ صحیح قول ہے لفظ کا مقتضیٰ جس کی موافقت کرتا ہے اور بلاشبہ یہ عجیب بات ہے کہ کہا جائے کہ اس سال سے مراد 9 ہجری ہے۔ اور یہی وہ سال ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا (کہ آئندہ کوئی مشرک حرم پاک میں داخل نہیں ہو سکتا) اگر کسی آدمی کا غلام کسی دن اس کے گھر میں داخل ہو اور اس کا آقا اسے یہ کہے: لا تدخل هذه الدار بعد یومك (تو آج کے بعد اس گھر میں مت داخل ہو) تو اس سے مراد وہ دن نہیں ہو سکتا جس میں وہ داخل ہوا ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَةً عمرو بن فائد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے واذ خفتم (اور جب تمہیں خوف ہو) اور یہ عجمہ ہے اور اس کا معنی عمدہ اور حسین ہے اِنۡ کے ساتھ۔ مسلمانوں نے جب مشرکوں کو حج سے روک دیا حالانکہ وہ اناج اور دیگر سامان تجارت لے کر آتے تھے، تو شیطان نے ان کے دلوں میں فقر و افلاس کا خوف ڈال دیا اور کہنے لگے: ہم زندگی کہاں سے گزاریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے فضل سے انہیں غنی فرما دے گا۔ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اہل ذمہ کی جانب سے جزیہ کا دروازہ کھول دیا اپنے اس ارشاد گرامی کے ساتھ: قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ الآیہ (التوبہ: 29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر)

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 3، صفحہ 89 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 901 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 903

اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں موسلا دھار بارش، نباتات اور زمین کی سرسبزو شادابی کے ساتھ غنی فرما دیا۔ پس یمن کے شہر اور نواحی بستیاں بھی سرو سبز شاداب ہو گئیں اور وہ اناج، گوشت کی چربی اور تیل اور دیگر کثیر نفع بخش چیزیں مکہ مکرمہ لے کر آئے۔ اور عرب اسلام لے آئے مراد نجد، صنعاء اور دوسرے علاقے کے لوگ ہیں۔ پس ان کا حج اور ان کی تجارت انتہا تک پہنچ گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جہاد اور دیگر امتوں پر غلبے کے سبب انہیں غنی کر دیا۔ عیلہ کا معنی فقر و افلاس ہے۔ کہا جاتا ہے: عالَ الرجلُ یَعیل جب کوئی آدمی محتاج اور فقیر ہو جائے (1) (تو یہ جملہ کہا جاتا ہے) جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وما یَدرِی الفقیرُ متی غِنَاہُ   وما یدرِی الغنیّ متی یَعیلُ

فقیر نہیں جانتا کہ کب (اللہ تعالیٰ) اسے غنی کر دے اور غنی (دولت مند) نہیں جانتا کہ وہ کب محتاج ہو جائے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے علقمہ وغیرہ نے اسے عائلۃ پڑھا ہے اور یہ مصدر ہے، جیسا کہ قال یقیل سے قائلۃ ہے۔ اور اسی طرح عافیۃ بھی ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ محذوف موصوف کی نعت ہو اور تقدیر عبارت ہو: حالا عائلۃ اور اس کا معنی ہو مشکل اور تکلف دہ خصلت۔ اسی سے یہ کہا جاتا ہے: عالنی الأمر یعولنی یعنی معاملہ مجھ پر شاق اور سخت ہو گیا۔ اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: عال یعول جب کوئی محتاج اور فقیر ہو جائے (2)۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رزق کے بارے میں دل کا تعلق اسباب کے ساتھ قائم کرنا جائز ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے، اگرچہ رزق مقدر ہے، اللہ تعالیٰ کا امر ہے اور اس نے اسے تقسیم کیا ہوا ہے، لیکن اس نے اسے حکمت کے تحت اسباب کے ساتھ معلق کر دیا ہے تاکہ وہ ان دلوں کو جان لے جو اسباب کے ساتھ متعلق ہیں ان دلوں میں سے جو رب الارباب پر توکل رکھتے ہیں۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ سبب توکل کی نفی نہیں کرتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اگر تم نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جیسے اس کے توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائے گا جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے وہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں“ (3)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے پس اس میں خبر دی ہے کہ رزق کی تلاش میں صبح و شام آنا جانا توکل حقیقی کے خلاف نہیں ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لیکن مشائخ صوفیہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ صبح و شام آنا جانا طاعات (اور تعمیل حکم) میں ہے۔ اور یہی وہ سبب ہے جو رزق کو کھینچ لاتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اس پر دلیل دو امر ہیں: ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ (طٰہٰ:132) (اور حکم دیجئے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی پابند رہیے اس پر نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو)

اور دوسرا یہ قول باری تعالیٰ ہے: اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (فاطر:10) پس وہ اپنے محل

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 21
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 400
3۔ جامع ترمذی، باب فی التوکل علی اللہ، حدیث نمبر 2266، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو کہ آسمان ہے۔ سے رزق نازل نہیں کرتا مگر وہی جو اس کی طرف بلند ہوتا ہے اور وہ پاکیزہ ذکر اور عمل صالح ہے اور وہ زمین میں سعی اور دوڑ دھوپ کرنا نہیں ہے، کیونکہ اس میں رزق نہیں ہے۔ اور صحیح وہ ہے جسے فقہاء ظاہر کے نزدیک سنت نے ثابت اور مستحکم کر دیا ہے اور وہ اسباب دنیوی کے ساتھ کام کرنا ہے، مثلاً زمین میں ہل چلانا (کاشتکاری کرنا)، بازاروں میں تجارت کرنا، اموال (کاروبار) کے لیے تعمیرات کرنا اور باغات لگانا وغیرہ۔ تحقیق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس طرح عمل کرتے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے۔ ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس پاکیزہ مال میں سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو انہوں نے کمایا، علاوہ ازیں دیگر آیات بھی ہیں۔ اور فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ (البقرہ: 173) (لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں) پس اللہ تعالیٰ نے مضطر اور مجبور آدمی کے لیے وہ (کھانا) حلال قرار دیا ہے جو اس پر حرام ہے جب اس کے پاس کھانے کے لیے وہ موجود نہ ہو جسے کمانے اور غذا اپنانے کا اس نے حکم دے رکھا ہے اور اس نے اسے آسمان سے کھانا نازل ہونے کے انتظار کرنے کا حکم نہیں دیا اور اگر وہ شے جسے عذاب بنایا جا سکتا ہے اسے چھوڑ کر اس نے سعی اور کوشش ترک کر دی تو وہ اپنی جان کا قاتل ہو گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھوک سے بل کھاتے رہتے تھے جو آپ پاتے تھے وہ کھا لیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آسمان سے کھانا نازل نہیں ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ کے لیے سال کی خوراک جمع کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتوحات عطا فرمائیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اونٹ کے ساتھ حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں اسے ڈھنگا ڈال دوں اور توکل کروں یا اسے کھلا چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اسے رسی ڈال اور پھر توکل کر"۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کے لیے اہل صفہ میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ وہ فقراء تھے مسجد میں بیٹھتے تھے نہ وہ ہل چلاتے تھے اور نہ تجارت کرتے تھے، ان کے لیے نہ کمائی تھی اور نہ کوئی مال، بلاشبہ وہ شہروں کی تنگی کے وقت اسلام کے مہمان تھے اور اس کے باوجود وہ دن کے وقت لکڑیاں (ایندھن) چنتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس میں پانی بھر کر لاتے تھے اور رات کے وقت قرآن کریم پڑھتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح ان کا وصف بیان کیا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی سبب پیدا کرتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی ہدیہ آتا تو آپ اسے ان کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔ اور اگر صدقہ آتا تو وہ انہیں کو عطا فرما دیتے تھے، پس جب فتوحات کثیر ہو گئیں اور اسلام پھیل گیا تو وہ بھی نکل گئے اور حکم کی تعمیل میں لگ گئے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اور وہ بیٹھے نہ رہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ وہ اسباب جن سے رزق حاصل کیا جاتا ہے ان کی چھ قسمیں ہیں:

(ا) ان میں سے سب سے اعلیٰ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے) میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے رکھا ہے اور ذلت اور حقارت کو اس پر ڈال دیا ہے جس نے میرے حکم کے خلاف

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث نمبر 2441، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا"۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رزق اپنے فضل سے ان کی کمائی اور کسب میں رکھا ہے اور اسے کسب کی افضل ترین نوع کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے شرف وعظمت کے سبب (دشمن پر) غلبہ اور (فتح) حاصل کرنا ہے۔

(۲) آدمی کا اپنے ہاتھ کے عمل سے کھانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بے شک آدمی جو کچھ کھاتا ہے اس میں سے اطیب اور پاکیزہ وہ ہے جو اس کے ہاتھ کی کمائی سے ہو اور بے شک اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے کھاتے تھے"۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ (الانبیاء: 80) (اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدے کے لیے) اور روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے (سوت) کاتنے کی کمائی کھاتے تھے۔(1)

(۳) تیسری قسم تجارت ہے اور یہ بزرگ اور اجل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل تھا بالخصوص مہاجرین صحابہ کرام کا اور قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس کی رہنمائی کی ہے۔

(۴) کاشتکاری کرنا اور باغات اور درخت لگانا۔ تحقیق ہم اسے سورۂ بقرہ میں بیان کر چکے ہیں۔

(۵) قرآن کریم پڑھنا اور اس کی تعلیم دینا اور دم کرنا وغیرہ، اس کا بیان سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔

(۶) کسی سے اس ارادہ اور نیت کے ساتھ لینا کہ پھر اسے ادا کر دے گا بشرطیکہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہو۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ پر لیے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دے گا اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ پر لیا تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا"۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ شَآءَ اس پر دلیل ہے کہ رزق اجتہاد اور کوشش کے ساتھ نہیں، بلکہ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے وہی اسے اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کرنے کا والی ہے۔ اور اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الآیہ (الزخرف: 32) (ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

"جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 17، صفحہ 59

یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں''۔

اس میں پندرہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ جب اللہ تعالیٰ نے کفار پر مسجد حرام کے قریب آنا حرام قرار دیا، تو مسلمانوں نے اپنے دلوں میں اس تجارت کے بارے خوف سا محسوس کیا جو ان سے ختم کر دی گئی (کیونکہ) مشرکین اسے اپنائے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً، الآیہ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پھر اس آیت میں جزیہ کو حلال قرار دیا اور یہ اس سے پہلے نہیں لیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس کا عوض بنا دیا جو انہیں مشرکین کے ساتھ تجارت میں شریک ہونے سے منع کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ اس وصف پر وہ تمام متفق ہیں اور اہل کتاب کا ذکر ان کی کتاب کی تکریم کے لیے خاص طور پر علیحدہ کیا، کیونکہ وہ توحید و رسالت، شرائع اور ادیان کو جانتے تھے اور خصوصاً حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی ملت اور آپ کی امت کے بارے علم رکھتے تھے۔ تو جب انہوں نے اس کا انکار کیا تو ان پر حجت مؤکد ہو گئی اور ان کا جرم بڑھ گیا۔ پس پہلے ان کے مقام و محل پر آگاہ فرمایا پھر قتال کے لیے غایت کو ذکر کیا اور وہ قتل کے بدلے جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے ایک مجلس نظر و فکر میں ابو الوفا علی بن عقیل کو سنا ہے وہ یہ آیت پڑھتے تھے اور اس سے استدلال کرتے تھے۔ پس فرمایا: قَاتِلُوا یہ سزا کے بارے امر ہے۔ پھر فرمایا: الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ یہ اس گناہ کا بیان ہے جس نے عقوبت (سزا) کو واجب کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یہ جانب اعتقاد میں گناہ کی تاکید ہے۔ پھر فرمایا: وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ یہ اعمال کی مخالفت میں گناہ کے بڑھ جانے اور زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا: مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ حجت کے لیے تاکید ہے، کیونکہ وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں اسے لکھا ہوا پاتے تھے۔ پھر فرمایا: حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ پس اس غایت کو بیان کر دیا جس تک سزا ممتد ہو سکتی ہے اور اس بدل اور عوض کو معین کر دیا جس کے سبب وہ سزا اٹھ سکتی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جن لوگوں سے جزیہ لیا جاتا ہے ان کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا مگر صرف اہل کتاب سے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی۔ دلیل یہی آیت ہے، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خاص طور پر علیحدہ ذکر کیا گیا ہے پس حکم صرف انہیں کی طرف متوجہ ہوگا ان کے سوا دوسروں کی طرف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبہ: 5) (تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں) اور آگے یہ نہیں فرمایا: حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں جیسا کہ اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے اور (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) نے مزید یہ کہا ہے: جزیہ مجوسیوں سے قبول کیا جائے گا اور یہ سنت سے ثابت ہے۔ اسی طرح امام احمد اور ابو ثور نے کہا ہے۔ اور یہی ثوری، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ علیہم کا مذہب ہے۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بتوں کی عبادت کرنے والے، آتش پرست، منکر اور جھٹلانے والے سبھی سے ہی جزیہ لیا جائے گا اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے، کیونکہ ان کی رائے یہ ہے کہ شرک اور انکار کی تمام اجناس سے جزیہ لیا جائے گا چاہے وہ عربی ہو یا عجمی، تغلبی ہو یا قریشی، جو بھی ہو سوائے مرتد کے (سبھی سے جزیہ لیا جائے گا) ابن القاسم، اشہب اور سحنون نے کہا ہے: جزیہ عرب کے مجوسیوں اور تمام امتوں سے لیا جائے گا۔ اور رہے عرب بت پرست تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں جزیہ کا تذکرہ نہیں کیا، ان میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہے گا، بلاشبہ ان کے لیے یا قتال ہے یا اسلام۔ اور ابن القاسم کا یہ نظریہ بھی موجود ہے کہ ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اور یہ ابن جلاب کی تفریع میں ہے اور یہ احتمال ہے نص نہیں۔

اور ابن وہب نے کہا ہے: عرب کے مجوسیوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے سوا سے قبول کر لیا جائے گا۔ فرمایا: کیونکہ عرب میں مجوسی کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ ان تمام نے اسلام قبول کر لیا۔ پس ان میں سے کوئی خلاف اسلام پایا گیا تو وہ مرتد ہوگا، ہر حال میں اسے قتل کیا جائے گا اگر وہ اسلام نہ لایا اور ان سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور ابن الجہم نے کہا ہے: جزیہ ہر اس سے قبول کیا جائے گا جو اسلام کے سوا کسی بھی دین پر ہو سوائے ایسی شی کے جس پر کفار قریش کا اجتماع ہو اور اس کی علت بیان کرتے ہوئے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہ ذلت اور حقارت کے بدلے ان کی تکریم کے لیے ہے، کیونکہ ان کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اور کسی اور ۔ یہ کہا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ تمام کے تمام فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ اور رہے مجوس! تو ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ ان سے جزیہ لیا جائے گا۔ اور مؤطا میں ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجوس کا معاملہ ذکر کیا اور فرمایا: میں نہیں جانتا میں ان کے بارے کیا کروں؟ تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: سنوبهم سنة اهل الكتاب (تم ان سے اہل کتاب جیسا برتاؤ کرو) ابو عمر نے کہا ہے: یعنی خاص طور پر جزیہ میں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، سنوابهم سنة اهل الكتاب میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اور یہی مذہب جمہور فقہاء کا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ وہ اہل کتاب تھے پھر بدل دیئے گئے۔ اور میرا گمان یہ ہے کہ وہ اس بارے میں اس کی طرف گئے ہیں جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ایک سند سے مروی ہے اور اس میں ضعف ہے، اس کا دارومدار ابو سعید البقال پر ہے۔ اسے عبدالرزاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: روایت ہے کہ مجوس کی طرف ایک نبی مبعوث کیے گئے جن کا نام زرادشت تھا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں جزیہ کی وہ مقدار ذکر نہیں کی جو ان سے لی جائے گی۔ تحقیق علماء نے جزیہ کی اس مقدار میں اختلاف کیا ہے جو ان سے لی جائے گی۔ پس حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس میں کوئی مقرر مقدار نہیں، بلکہ یہ اتنا ہی ہوگا جس پر ان سے صلح کی گئی۔ اسی طرح یحییٰ بن آدم، ابو عبید اور علامہ طبری رحمہم اللہ نے کہا

ہے، مگر علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے: اس کی کم سے کم مقدار ایک دینار ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ اور انہوں نے استدلال اس روایت سے کیا ہے جسے اہل الصحیح نے حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بحرین سے جزیہ پر صلح کی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: غنی اور آزاد بالغ فقیر پر ایک دینار ہوگا اس سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد وغیرہ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کی طرف بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ہر بالغ سے جزیہ میں ایک دینار وصول کریں (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی ارشاد اللہ تعالیٰ کے مراد بہ کے لیے مبین اور اس کی وضاحت کرنے والا ہے اور یہی ابوثور کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اور اگر ایک دینار سے زیادہ پر ان سے صلح کر لی گئی تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر انہوں نے زیادہ دیا اور اس پر ان کے دل مطمئن اور خوش ہوں تو وہ ان سے قبول کر لیا جائے گا۔ اور اگر ان سے صلح تین دنوں کی ضیافت پر کی گئی تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ ضیافت معلوم ہو مثلاً روٹی، جو، پنیر اور سالن وغیرہ۔ اور اس کا ذکر کرے جو ان میں سے متوسط پر ہوگا اور جو ان میں سے خوشحال اور دولت مند پر ہوگا اور سردی، گرمی اترنے اور واپس لوٹنے کی جگہ کا بھی ذکر ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں کہا ہے جو آپ سے ابن قاسم، اشہب اور محمد بن حارث بن زنجویہ نے روایت کی ہے کہ جزیہ سونے والوں پر چار دینار ہوگا اور چاندی والوں پر چالیس درہم، اس میں غنی اور فقیر برابر ہیں اگرچہ وہ مجوسی ہو۔ جو مقدار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کر دی ہے نہ اس پر اضافہ کیا جائے گا اور نہ اس میں کمی کی جائے گی، ان سے اس کے سوا کچھ نہیں لیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کمزور اور ضعیف کو اتنی مقدار تخفیف کر دی جائے گی جتنی امام وقت مناسب سمجھے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: تنگی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ مقدار میں کمی نہیں کی جائے گی اور خوشحالی اور دولت کی وجہ سے اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ابو عمر نے کہا ہے: ان کے فقراء سے اتنی مقدار میں لیا جائے گا جسے وہ برداشت کر سکتے ہوں اگرچہ وہ ایک درہم ہی ہو۔ اور اسی کی طرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے رجوع کیا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام محمد بن حسن اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جزیہ کی مقدار بارہ، چوبیس اور چالیس ہے۔ امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں مختلف مقداروں کا ذکر مروی ہے، پس والی کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے لے لے، جب کہ وہ اہل ذمہ ہوں۔ اور رہے اہل صلح تو ان پر اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا جس پر صلح کی گئی ہو۔

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے: وہ جس پر قرآن کریم دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جزیہ جنگ لڑنے والے مردوں سے لیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا**

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ، حدیث نمبر 1345، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب فی زکوٰۃ البقر، حدیث 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ پس یہ ارشاد ان پر جزیہ کے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو قتال کرتے ہیں۔ اور یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ غلام پر جزیہ نہیں ہے اگرچہ وہ جنگ لڑنے والا ہو، کیونکہ اس کے پاس کوئی مال نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: حَتّٰى يُعْطُوا اور جو کسی شے کا مالک نہ ہو اس کے لیے حتی یعطی نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جزیہ آزاد، بالغ مردوں کے سروں پر لگایا جائے گا اور وہ وہی ہیں جو قتال کرتے ہیں نہ کہ عورتیں، بچے، غلام، ایسے مجنون افراد جن کی عقلیں مغلوب ہوں اور بوڑھے، پیر فرتوت وغیرہ۔ اور راہبوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ پس ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ مطرف اور ابن ماجشون نے کہا ہے: یہ تب ہے جب وہ جزیہ لگ جانے کے بعد راہب نہ بنا ہو اور اگر جزیہ پہلے لگا دیا گیا پھر وہ راہب بنا تو اس کی رہبانیت جزیہ کو ساقط نہیں کر سکتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب اہل جزیہ جزیہ ادا کر دیں تو پھر ان کے پھلوں، سامان تجارت اور ان کی فصلوں کی پیداوار میں سے کوئی شے ان سے نہ لی جائے، مگر یہ کہ وہ ان شہروں کے علاوہ دوسرے شہروں میں تجارت کریں جن میں انہیں ٹھہرایا گیا اور جن پر ان سے صلح کی گئی۔ پس اگر وہ تجارت کی غرض سے اپنے مقیمی شہروں سے دوسرے شہروں کی طرف نکلے تو ان سے (محصول، عشر ٹیکس) لیا جائے گا جب وہ سامان بیچیں اور اس کے ثمن نقد ان کے پاس موجود ہوں، اگرچہ سال میں ان کا گزر کئی بار ہو، مگر یہ کہ وہ طعام گندم اور زیتون وغیرہ لے کر مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ کی طرف خاص طور پر لے جائیں، تو اس صورت میں ان سے نصف العشر لیا جائے گا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کیا ہے۔ اور اہل مدینہ میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ اہل ذمہ سے ان کے سامان تجارت کا محصول ٹیکس سال میں صرف ایک بار لیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ یہی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ فقہاء کی جماعت کا مذہب ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ جب اہل جزیہ نے اپنا وہ جزیہ ادا کر دیا جو ان پر لگایا گیا یا جس پر ان سے صلح کی گئی تو پھر انہیں ان کے تمام مالوں، ان کی انگور کی بیلوں اور ان کے اس عصیر (نچوڑ) کو جس کی شرابوں کو انہوں نے چھپا رکھا ہو اور وہ انہیں کسی مسلمان کو بیچنے کا اعلان نہ کریں تو ان سب کو چھوڑ دیا جائے (اور درمیان میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے) اور انہیں شراب (خمر) اور خنزیر کو مسلمانوں کے بازاروں اور ظاہراً لانے سے منع کیا جائے، پس اگر وہ ان سے کوئی شے ظاہراً لائیں تو شراب کو ان پر انڈیل دیا جائے اور جو خنزیر کو لے کر آئے اسے تادیبی سزا دی جائے۔ اور اگر کسی مسلمان نے شراب کے اظہار کے بغیر اسے بہا دیا تو یہ تعدی اور زیادتی ہے، لہٰذا اس پر ضمان واجب ہوگی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمان نہیں ہوگی۔ اور اگر کسی نے شراب غصب کر لی تو اس پر اسے واپس لوٹانا واجب ہے۔ ان کے احکام میں اور ان کے آپس میں سودی کاروبار میں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ پس اگر وہ اپنا کوئی مقدمہ ہمارے پاس فیصلہ کے لیے پیش کریں تو پھر حاکم کو اختیار ہے، اگر چاہے تو ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کر دے اور اگر چاہے تو اعراض کر لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے باہمی مظالم کے بارے میں ہر حال میں ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور ان کے طاقتوروں سے ان کے

کمزوروں کا حق لیا جائے گا، کیونکہ یہ ان سے دفع مضرت کے باب سے ہے۔ اور امام وقت پر لازم ہے کہ وہ ان کی طرف سے ان کے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑے اور دشمنوں سے جنگ لڑنے میں ان سے مدد بھی طلب کرے۔ مال فی (غنیمت) میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا اور عبادت گاہوں میں جن پر صلح کی گئی ہے وہ ان پر اضافہ نہیں کر سکتے (یعنی مزید ان کی تعمیر کو بڑھا نہیں سکتے) البتہ ان میں سے جو بوسیدہ ہو جائے اس کی اصلاح اور مرمت سے انہیں نہ روکا جائے۔ اور ان کے لیے ان کے علاوہ نئی تعمیر کرنا قطعاً جائز نہیں۔ اور وہ ایسا لباس اور ہیئت اختیار کریں گے جس کے ساتھ وہ خود مسلمانوں سے الگ اور جدا ہو جائیں اور اہل اسلام کے ساتھ مشابہت کو اختیار کرنے سے انہیں روکا جائے گا۔ اور ان سے دشمن کے بچوں کو خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ ان کے لیے ذمہ نہ ہو۔ اور جزیہ ادا کرنے میں جس کسی نے جھگڑا کیا تو اسے اس جھگڑنے پر تادیبی سزا دی جائے گی۔ اور اس سے جزیہ لیا جائے گا اس حال میں کہ وہ مغلوب ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ جس کے سبب جزیہ واجب ہے اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، پس علماء مالکیہ نے کہا ہے: یہ اس قتل کے بدل کے طور پر واجب ہے، جو کفر کے سبب لازم ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جان کی حفاظت اور دار کی سکونت کے بدل کے طور پر واجب ہوتا ہے۔ اس اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے یہ کہا کہ یہ قتل کے بدلے واجب ہے پھر وہ اسلام لے آیا تو اس سے گزری ہوئی مدت کا جزیہ ساقط ہو جائے گا، اگرچہ اس نے سال مکمل ہونے سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد اسلام قبول کیا۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ یہ جزیہ ایک دین (قرض) ہے جو اس کے ذمہ پختہ ہو چکا ہے پس اسلام اسے ساقط نہیں کر سکتا جیسا کہ دار کی اجرت (ساقط نہیں ہوتی) اور بعض حنفیہ نے ہمارے قول کی مثل ہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جزیہ مدد و نصرت اور جہاد کے بدل کے طور پر واجب ہے۔ اور قاضی ابوزید نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور ان کا گمان یہ ہے کہ یہ اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کا سر اور راز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کسی مسلمان پر کوئی جزیہ نہیں ہے'' (1)۔

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ذمی اپنے اوپر جزیہ واجب ہونے کے بعد جب اسلام لے آئے تو اس سے جزیہ باطل ہو جائے گا۔ اسے ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ کیونکہ اسلام کے سبب یہ معنی زائل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا نہیں کریں گے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسلام کے بعد اس وجہ اور سبب کی بنا پر نہیں لیتے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ بے شک وہ یہ فرماتے ہیں کہ جزیہ ایک دین ہے، جو اس پر سبب سابق کے ساتھ واجب ہوا ہے اور وہ سبب سکنیٰ (رہائش) یا قتل کے شر سے بچنا اور حفاظت ہے، پس یہ تمام قرضوں کی مثل ہو گیا۔

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء لیس علی المسلمین جزیۃ، حدیث نمبر 574، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 9۔ اگر امام وقت کسی شہر یا قلعہ کے باسیوں کے ساتھ معاہدہ کرے پھر وہ اپنا عہد توڑ دیں اور جزیہ وغیرہ میں سے جوان کے ذمہ لازم ہوتا ہے اسے ادا کرنے سے رک جائیں (انکار کر دیں) اور وہ اسلام کے حکم سے بھی انکار کر دیں بغیر اس کے کہ ان پر کوئی ظلم وزیادتی کی جائے اور امام وقت بھی ان پر جبر اور زیادتی کرنے والا نہ ہو تو مسلمانوں پر اپنے امام کی معیت میں ان کے ساتھ جنگ اور قتال کرنا واجب ہے، پس اگر وہ قتال کریں اور مغلوب ہو جائیں تو ان کے بارے میں بالکل اسی طرح حکم ہوگا جو دار الحرب والوں کے بارے حکم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اور ان کی عورتیں مال فے ہوگا اور ان میں خمس نہیں ہوگا۔ اور یہ ایک مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اور اگر وہ چوریاں کرتے ہوئے اور ڈاکے ڈالتے ہوئے خروج کریں تو وہ لوٹ مار کرنے والے مسلمانوں کے قائم مقام ہوں گے جب کہ وہ جزیہ دینے سے انکار نہ کریں اور اگر وہ ظلم وزیادتی کی شکایت کرتے ہوئے نکلیں تو ان کے معاملہ میں غور وفکر کیا جائے گا اور انہیں اصل ذمہ اور معاہدہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور انہیں ان کے ساتھ ظلم کرنے والوں سے انصاف دلایا جائے اور ان میں سے کسی کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور وہ آزاد ہوں گے۔ اور اگر ان میں سے بعض نے معاہدہ توڑ دیا تو جنہوں نے نہیں توڑا وہ اپنے معاہدہ پر باقی رہیں گے اور انہیں کسی دوسرے کے توڑنے کے سبب نہیں پکڑا جائے گا اور انہیں معاہدہ پر قائم رہنے کو اسی طرح پہچانا جائے گا کہ وہ توڑنے والوں کے خلاف ہوں اور ان کا انکار کرتے ہوں۔

مسئلہ نمبر 11۔ اَلْجِزْیَةُ یہ فعلۃ کے وزن پر ہے۔ اور جزی یجزی سے ہے جب کوئی بدلہ دے اس احسان کا جو اس پر کیا گیا ہو (تو اس کو جزی یجزی بدلہ دینا کہا جاتا ہے) تو گویا انہوں نے جزیہ اس جزا اور بدلے کے طور پر دیا جو انہیں امن وسلامتی عطا کی گئی اور یہ لفظ القعدۃ اور الجلسۃ کی طرح ہے۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

یُجزیك اویُثنِی علیك وانّ مَن أثنی علیك بما فعلت کمن جزی

مسئلہ نمبر 12۔ مسلم نے ہشام بن حکیم بن حزام سے روایت نقل کی ہے کہ وہ شام کے کسانوں میں سے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ انہیں دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے: اور ان کے سروں پر تیل انڈیلا گیا تھا۔ تو انہوں نے پوچھا: ان کا کیا معاملہ ہے؟ تو بتانے والے نے کہا: انہیں جزیہ میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ تو ہشام نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں''۔ اور ایک روایت میں ہے ان دنوں ان کا امیر عمیر بن سعد فلسطین میں تھا، پس وہ اس کے پاس گیا اور اس سے بات کی تو اس نے ان کے بارے حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: رہی ان کی سزا! تو جب وہ جزیہ دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود جزیہ ادا کرنے سے انکار کر دیں تو انہیں سزا دینا جائز ہے، لیکن جب ان کا عجز ظاہر ہو تو پھر انہیں سزا دینا حلال نہیں، کیونکہ جو جزیہ دینے سے عاجز آ جائے ان سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اور امیر لوگوں کو فقراء کی طرف سے جزیہ ادا کرنے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اور ابو داؤد نے صفوان بن سلیم سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے متعدد بیٹوں سے اور انہوں نے اپنے آباء سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا: ''جس نے کسی معاہدہ کرنے والے کے ساتھ ظلم کیا یا اسے نقصان پہنچایا یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اسے کام کا مکلف بنایا یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس کا حجیج ہوں گا'' (1)۔ (یعنی دلیل سے اس پر غالب آؤں گا)

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: عَنْ يَّدٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ بذات خود جزیہ دے گا اس میں کسی کو نائب نہیں بنائے گا۔ ابوالبختری نے سلمان سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: اس کا معنی ہے انتہائی مذموم حالت میں دے گا۔ اور معمر نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس سے مراد ہے عن قہر (مغلوب اور مجبور ہو کر دے گا) اور بعض نے کہا ہے: عَنْ يَّدٍ یعنی تمہاری طرف سے ان پر جو انعام ہے اس کے عوض دے گا، کیونکہ جب ان سے جزیہ لیا گیا تو تحقیق ان پر اس سے انعام کیا گیا۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: وہ جزیہ دے گا اس حال میں کہ وہ کھڑا ہو گا اور لینے والا بیٹھا ہوا ہو گا۔ اور یہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قول باری تعالیٰ عن ید سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ سے ثابت ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ ائمہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچے والا مانگنے والا ہے''۔ اور یہ بھی روایت ہے، ''اور اوپر والا ہاتھ ہی عطا کرنے والا ہے''۔ پس آپ نے صدقہ میں دینے والے ہاتھ کو علیا (اوپر والا ہاتھ) قرار دیا ہے اور جزیہ میں دینے والے ہاتھ کو سفلیٰ (نیچے والا ہاتھ) قرار دیا ہے۔ اور لینے والے ہاتھ کو علیا قرار دیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کیونکہ وہی بلند کرنے والا اور پست کرنے والا ہے، جسے چاہتا ہے بلند کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پست کر دیتا ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ حبیب بن ابی ثابت نے کہا ہے: ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور عرض کی: بے شک خراج والی زمین سے اس کے باسی عاجز آرہے ہیں کیا میں اسے آباد کر سکتا ہوں اور اسے کاشت کر کے اس کا خراج ادا کر سکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں۔ اور پھر ایک دوسرا آیا تو اس نے بھی آپ کو اسی طرح کہا، تو آپ نے فرمایا: نہیں اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ کیا تم میں سے کوئی اس ذلت و حقارت کا قصد کرتا ہے جو ان میں سے کسی کی گردن میں ہے کہ وہ اسے اتارے اور اسے اپنی گردن میں ڈال لے۔ اور کلیب بن وائل نے کہا ہے: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: میں نے زمین خریدی ہے۔ انہوں نے فرمایا: خریدنا اچھی شے ہے۔ میں نے کہا: پس میں زمین کی ہر جریب کے بدلے ایک درہم اور ایک قفیز اناج دوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: تو اپنی گردن میں ذلت اور حقارت کو نہ ڈال۔ اور میمون بن مہران نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میرے لیے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی تعشیر اہل الذمۃ، حدیث نمبر 2654، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ باعث مسرت نہیں کہ میرے لیے ساری زمین پانچ درہم جزیہ کے بدلے ہو میں اس میں اپنے نفس کے لیے ذلت و رسوائی کا اقرار کرتا ہوں۔

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ ۝

''اور کہا یہود نے کہ عزیر اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور کہا نصرانیوں نے کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی (بے سروپا) بات ہے ان کے مونہوں سے نکلی ہوئی، نقل اتار رہے ہیں ان لوگوں کے قول کی جنہوں نے کفر کیا پہلے، ہلاک کرے انہیں اللہ تعالیٰ، کدھر بھٹکے چلے جارہے ہیں''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ عاصم اور کسائی نے عُزَیْرٌ ابْنُ اللّٰهِ عزیر کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ اس بنا پر ابن، عزیر مبتدا کی خبر ہے اور عزیر منصرف ہے چاہے عجمی ہو یا عربی ہو۔ ابن کثیر، نافع، ابو عمرو اور ابن عامر نے عزیر ابن اجتماع ساکنین کی وجہ سے تنوین کو ترک کر کے پڑھا ہے۔ اور اسی سے ان کی قراءت ہے جنہوں نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (الاخلاص) پڑھا ہے (1)۔ ابو علی نے کہا ہے: شعر میں ترک تنوین کا استعمال زیادہ ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں یہ شعر بیان کیے ہیں:

لَتَجِدَنِّی بالأمیر بَرًّا وبالقناة مِدْعَسا مِكَرًّا

إذا غُطَیْفُ السُّلَمِیُّ فَرَّا (2)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ یہ لفظ بظاہر عام ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے، کیونکہ تمام یہودیوں نے اس طرح نہیں کہا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ (آل عمران: 173) اور یہ تمام لوگوں نے نہیں کہا۔ اور کہا گیا ہے کہ جو بیان کیا گیا ہے یہودیوں میں سے اس کے قائل سلام بن مشکم، نعمان بن ابی اوفیٰ، شاس بن قیس اور مالک بن صیف تھے۔ انہوں نے یہ قول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا۔ نقاش نے بیان کیا ہے: کوئی یہودی باقی نہیں رہتا جو یہ کہتا ہو، بلکہ وہ سب ہلاک ہو گئے۔ پس جب ایک نے یہ کہا پھر وہ اس طرف متوجہ ہوا کہ قول کی برائی اور نقصان پوری جماعت کو لازم ہو گی۔ اس لیے کہ ان میں کہنے والے کی شہرت ہے۔ اور شریف اور بیدار مغز لوگوں کے اقوال ہمیشہ لوگوں میں مشہور ہوتے ہیں اور ان سے استدلال کیا جاتا ہے۔ پس یہاں یہ صحیح ہے کہ جماعت اپنے قائد اور شریف فرد کا قول کرنے لگے۔ واللہ اعلم

روایت کیا گیا ہے کہ اس قول کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء علیہم الصلوات و التسلیمات کو قتل کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے تورات کو اٹھا لیا اور ان کے دلوں سے اسے محو کر دیا، پھر حضرت عزیر علیہ السلام زمین میں تسبیح بیان کرتے ہوئے نکلے، تو ان کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور پوچھا: ''تم کہاں جارہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 23
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 412

ہو؟'' انہوں نے کہا: میں علم کی طلب میں ہوں، تو آپ نے انہیں پوری تورات سکھادی پس حضرت عزیر علیہ السلام تورات لے کر بنی اسرائیل کی طرف آئے اور انہیں اس کی تعلیم دی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو تورات حفظ کرادی اور یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عزت افزائی ہے، تو انہوں نے بنی اسرائیل کو کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات حفظ کرادی ہے، پس انہوں نے اپنی طرف سے اس کی تدریس شروع کردی، حالانکہ تورات دفن کی جاچکی تھی، ان کے علماء نے اس وقت اسے دفن کردیا تھا جب انہیں طرح طرح کے فتنے، جلاوطنی اور بیماری جیسی چیزیں پہنچیں جن میں وہ مبتلا ہوئے اور بخت نصر نے انہیں قتل کیا۔ پھر دفن شدہ تورات پائی گئی وہ بالکل اس کی مثل تھی جو عزیر علیہ السلام پڑھا رہے تھے، تو اس وقت وہ گمراہ ہوگئے اور وہ کہنے لگے: بے شک یہ حضرت عزیر علیہ السلام کے لیے تیار نہیں کی گئی مگر تبھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور عیسائیوں کے اس قول ''کہ مسیح ابن اللہ ہیں'' کا ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے اس سے بنوت النسل کا ارادہ کیا ہے، جیسا کہ عربوں نے ملائکہ کے بارے میں کہا۔ اسی طرح حضرت ضحاک اور طبری وغیرہ کا قول تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ انتہائی شنیع اور برا کفر ہے۔

ابوالمعالی نے کہا ہے: نصرانیوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام الٰہ ہیں اور یہ کہ وہ الٰہ کے بیٹے ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے بے شک ان میں سے بعض بنوت شفقت و رحمت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور یہ معنی بھی درست نہیں ہے کہ اس پر بنوۃ (بیٹا ہونے) کا اطلاق کیا جائے اور یہ کفر ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اس میں ہمارے رب تبارک و تعالیٰ کے قول سے اس پر دلیل موجود ہے کہ جو کوئی کسی دوسرے کے ایسے کفر کے بارے خبر دے جس سے ابتدا کرنا کسی کے لیے جائز نہیں، اس پر کوئی حرج نہیں، کیونکہ وہ اس کا انکار کرتے ہوئے اور اس کا رد کرنے کے لیے اس کے بارے گفتگو کر رہا ہے۔ اور اگر ہمارا رب چاہے تو کوئی اس کے بارے کلام نہ کرے۔ تو جب اس کے بارے زبانیں کھولنے کی قدرت دے دی ہے تو پھر اس کے بارے خبر دینے کی بھی اجازت ہے، اس معنی میں کہ دل اور زبان اس کا انکار کرتے ہوں۔ اور دلیل و برہان کے ساتھ اس کا رد مقصود ہو۔(2)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ کہا گیا ہے: اس کا معنی تاکید ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں ہے: یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ (البقرہ:79) وَ لَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (الانعام:38) فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ (الحاقہ) اور اس کی امثلہ کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ جب یہ قول ہی جھوٹا ہے نہ اس میں کوئی بیان ہے اور نہ کوئی دلیل، تو یقیناً یہ فقط ''منہ'' کی بات ہے، ایسا دعویٰ ہے جس کے تحت کوئی صحیح معنی نہیں ہے، کیونکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کسی کو بیوی نہیں بنایا تو پھر وہ کیونکر گمان کر سکتے ہیں کہ اس کا کوئی بیٹا ہے، تو یہ کذب ہے اور فقط زبان کا قول ہے، بخلاف ان اقوال صحیحہ کے جنہیں دلائل مضبوط اور پختہ کرتے ہیں اور ان پر دلائل قائم ہوتے ہیں۔ اہل معانی نے کہا ہے: بے شک اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جہاں بھی قول کو افواہ (مونہوں) اور السن (زبان) کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 24	2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 913

ذکر کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے تو وہاں یقیناً مراد قول زور (جھوٹا قول) ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران:167) (کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں) اور كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ (الکہف) (کتنی بڑی ہے وہ بات جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے وہ نہیں کہتے مگر (سرتاسر) جھوٹ) اور يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (الفتح:11) (اے حبیب!) یہ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ، يُضَاهِـُٔوْنَ وہ مشابہت اختیار کرتے ہیں (نقل اتارتے ہیں) اور اسی معنی میں عربوں کا قول ہے: امرأۃ ضھیا یہ اس عورت کو کہتے ہیں جسے حیض نہ آتا ہو یا جس کے پستان نہ ہوں، گویا کہ وہ مردوں کے مشابہ ہے۔

اور قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا بت پرستوں کا قول ہے: اللات والعزی و مناۃ الثالثہ الاخری (لات وعزیٰ کے بارے میں اور منات کے بارے میں جو تیسری ہے) اور دوسرا قول، کافروں کا قول ہے: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (الملائکۃ بنات اللہ) اور تیسرا ان کے اسلاف کا قول ہے، پس تم انہوں نے باطل میں ان کی تقلید کی اور کفر میں ان کی اتباع اور پیروی کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ (الزخرف:23) (کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر)(1)

مسئلہ نمبر 6۔ علماء کا ضھیا کے بارے اختلاف ہے کہ کیا اس میں مد ہوگی یا نہیں؟ پس ابن ولاء نے کہا ہے: امرأۃ ضھیا اور یہ وہ عورت ہے جسے حیض نہ آئے۔ یہ مہموز ہے اور بغیر مد کے ہے۔ اور بعض اسے مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور وہ سیبویہ ہیں پس وہ اسے فعلاء کے وزن پر مد کے ساتھ بناتے ہیں۔ اور اس میں ہمزہ زائد ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں: نساء ضُهْی پس وہ ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں۔

ابوالحسن نے بیان کیا ہے کہ نجیرمی نے مجھے کہا: ضھیأۃ یعنی مد اور ہاء کے ساتھ۔ اس نے تانیث کی دو علامتیں جمع کر دیں۔ اس نے اسے ابوعمرو شیبانی سے نوادر میں بیان کیا ہے۔ اور شعر کہا ہے:

ضھیأۃ او عاقر جماد

ابن عطیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ یضاھئون عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: امرأۃ ضھیاء تو ان کا قول غلط ہے(2)۔ یہ ابوعلی نے کہا ہے، کیونکہ ضاھأ میں ہمزہ اصلی ہے اور ضھیاء میں ہمزہ زائدہ ہے جیسا کہ حمرآء میں زائد ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان پر لعنت بھیجے، مراد یہود ونصاریٰ ہیں، کیونکہ ملعون مقتول کی مثل ہی ہوتا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ یہ تعجب کے معنی میں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: قرآن کریم میں قتل سے مراد لعن (لعنت کرنا) ہی ہے۔ اور اسی معنی میں ابان بن تغلب کا قول ہے:

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 914
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 24

قاتلها الله تَلحاني وقد علمتْ انّي لنفسي إفسادي و إصلاحي

نقاش نے بیان کیا ہے کہ قاتل اللہ کی اصل تو دعا ہے، پھر ان کا استعمال کثیر ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے خیر و شر میں اظہار تعجب کے لیے کہنے لگے اور اب وہ اس سے دعا کا ارادہ نہیں کرتے۔ اور اصمعی نے شعر کہا ہے:

يا قاتل الله لَيْلَى كيف تعجبني وأخبر النّاس أنّي لا أباليها

اس میں مراد تعجب کا معنی ہی ہے۔

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝۳۱

''انہوں نے بنا لیا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو اپنے پروردگار اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح فرزند مریم کو بھی، حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں بجز اس کے کہ وہ عبادت کریں (صرف) ایک خدا کی، نہیں کوئی خدا بغیر اس کے، وہ پاک ہے اس سے جسے وہ اس کا شریک بناتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ احبار، حبر کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ ہے جو اچھا قول کرتا ہو، اسے منظم کر سکتا ہو اور اپنے حسن بیان کے ساتھ اسے انتہائی مضبوط اور پختہ بنا سکتا ہو۔ اور اسی سے ثوب محبر ہے یعنی ایسا کپڑا جو حسن خوبصورتی کو جامع ہو(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الاحبار کی واحد حبر حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور مفسرین حا پر فتحہ اور اہل لغت اس کے نیچے کسرہ پڑھتے ہیں۔ یونس نے کہا ہے: میں نے اسے نہیں سنا مگر حا کے کسرہ کے ساتھ، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ انہوں نے کہا ہے (مداد) حبر مراد عالم کی سیاہی ہے، پھر استعمال کثیر ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے مداد (سیاہی) کو ہی حبر (سیاہی) کہہ دیا۔ فراء نے کہا ہے: اس میں کسرہ اور فتحہ کی دونوں لغتیں ہیں۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: حبر کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی سیاہی ہے اور حبر فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی عالم ہے۔ اور الرهبان، راهب کی جمع ہے۔ یہ رهبة سے ماخوذ ہے، مراد وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ کا خوف اس پر برانگیختہ کرے کہ وہ نیت کو اس کے لیے خالص کر دے نہ کہ لوگوں کے لیے۔ اور اپنا وقت اسی کے لیے، اپنا عمل اس کی معیت میں اور اپنا انس اسی کے ساتھ بنائے۔

قولہ تعالیٰ: اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اہل معانی نے کہا ہے: انہوں نے اپنے پادریوں اور راہبوں کو پروردگار کی طرح بنا لیا تھا اس طرح کہ انہوں نے ہر شے میں ان کی اطاعت و پیروی کی۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (الکہف: 96) یعنی آگ کی طرح بنا دیا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

وهل أفسد الدّينَ إلا الملوكُ وأحبارُ سوء ورهبانها

کیا بادشاہوں، علماء سوء اور راہبوں کے سوا کسی نے دین کو فاسد کیا؟ (یعنی دین میں فساد انہوں نے ہی برپا کیا)

1۔ احکام القرآن لابن العربی

اعمش اور سفیان نے حبیب بن ابی ثابت سے اور انہوں نے ابو البختری سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد باری تعالیٰ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے بارے پوچھا گیا کیا انہوں نے ان کی عبادت اور پرستش کی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، لیکن انہوں نے ان کے لیے حرام کو حلال قرار دیا تو انہوں نے اسے حلال سمجھ لیا اور انہوں نے ان پر حلال کو حرام قرار دیا تو انہوں نے اسے حرام ہی قرار دیا۔ اور ترمذی میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عدی! یہ کیا ہے؟ اس بت کو اپنے سے پھینک دے'' اور میں نے آپ کو سورت براءت میں یہ پڑھتے ہوئے سنا: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ پھر فرمایا: ''خبردار سنو بے شک انہوں نے ان کی عبادت تو نہیں کی لیکن وہ جب کسی شے کو ان کے لیے حلال قرار دیتے تھے تو وہ اسے حلال سمجھتے تھے اور جب وہ ان پر کوئی شے حرام قرار دیتے تھے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے''۔ فرمایا: یہ حدیث غریب ہے، عبد السلام بن حرب کی حدیث کے سوا اس کی کوئی پہچان نہیں۔ اور غطیف بن اعین حدیث میں معروف نہیں ہے۔ (1)

قولہ تعالیٰ: وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ اس کے اشتقاق کے بارے میں کلام سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ اور مسیح سے مراد وہ پسینہ ہے جو پیشانی سے بہتا ہے، بعض متاخرین نے بہت خوب کہا ہے:

افرح فسوف تألف الأحزانا إذا شهدت الحشر والميزانا

تو خوش رہ پھر تو غموں سے مرکب ہوگا جب تو میدان حشر اور میزان کے پاس حاضر ہوگا۔

وسال من جبينك المسيح كأنه جداول تسيح

اور تیری پیشانی سے پسینہ بہے گا گویا کہ نالیاں بہہ رہی ہیں۔

اور مسیح کی نسبت اپنی ماں مریم کی طرف، اس کا معنی و مفہوم سورۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲

''(یہ لوگ) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچا دے اپنے نور کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) کافر''۔

قولہ تعالیٰ: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ مراد اللہ تعالیٰ کی توحید پر اس کے دلائل اور حجتیں ہیں۔ تو اس میں براہین و دلائل کو نور کے قائم و مقام رکھا ہے، کیونکہ ان میں بیان اور وضاحت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کا معنی نور اسلام ہے، یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنی تکذیب کے ساتھ بجھا دیں (ختم کر دیں) بِاَفْوَاهِهِمْ یہ اصل کی بنا پر فوہ کی جمع ہے، کیونکہ فم میں اصل فوہ ہے، جیسے حوض اور احواض ہے۔ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ کہا جاتا ہے: الا کیسے

1۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داخل کر دیا گیا حالانکہ کلام میں حرف نفی نہیں ہے اور ضربت إلا زیدا کہنا جائز نہیں ہے۔ تو فراء کا خیال یہ ہے کہ الا اس لیے داخل ہوا ہے کیونکہ کلام میں انکار کی ایک طرف (قسم) موجود ہے۔ زجاج نے کہا: انکار اور اثبات دونوں ذوی الطراف نہیں ہیں۔ اور ادوات نفی: ما، لا، ان اور لیس ہیں۔ ان کی کوئی اطراف نہیں ہیں جن کے ساتھ کلام کی جاتی ہو اور اگر معاملہ اس طرح ہے جیسے انہوں نے ارادہ کیا ہے تو پھر کرهت الا زیدا کہنا جائز ہے، لیکن جواب یہ ہے کہ عرب اسے ابی کے ساتھ حذف کر دیتے ہیں۔ اور تقدیر کلام ہے: ویأبی الله کل شئ إلا أن یتم نوره (اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا انکار فرماتا ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے) اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: بلاشبہ ابی میں ایسا جائز ہے کیونکہ اس کا معنی روکنا یا رکنا ہے، پس یہ نفی کے مشابہ ہی ہے۔ اور یہ قول اچھا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وهل لِیَ أُمٌّ غیرُها إن ترکتها أبی الله إلا أن أکون لها ابنَما

کیا میرے لیے اس کے سوا کوئی ماں ہے اگر میں اسے چھوڑ دوں، اللہ انکار فرماتا ہے مگر یہ کہ میں اس کا بیٹا ہوں۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾

''وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر تا کہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگرچہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ بِالۡهُدٰی یعنی فرقان (قرآن مجید) کے ساتھ۔ وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ یعنی دلائل اور براہین کے ساتھ (تمام دینوں پر اس دین حق کو غالب کر دے) تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے شرائع (اور احکام) پر غالب کر دیا یہاں تک کہ آپ پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہ رہی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِیُظۡهِرَهٗ یعنی تا کہ وہ دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگا۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ امام مہدی کے خروج کے وقت ہوگا، اس وقت کوئی باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے گا یا پھر جزیہ ادا کرے گا(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مہدی فقط حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس بارے میں اخبار صحیحہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں کہ امام مہدی علیہ السلام حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت میں سے ہوں گے(2)، لہٰذا انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر محمول کرنا جائز نہیں ہے۔ اور وہ حدیث جو اس بارے میں وارد ہے کہ ''مہدی نہیں ہیں مگر عیسیٰ علیہ السلام'' وہ صحیح نہیں ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب البعث والنشور'' میں

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 428

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب المہدی، حدیث نمبر 3735، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب خروج المہدی، حدیث نمبر 4075، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: کیونکہ اس کے راوی محمد بن خالد جندی ہیں اور وہ مجہول ہیں، وہ ابان بن ابی عیاش سے روایت کرتے ہیں اور وہ متروک راوی ہیں اور وہ حسن سے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور وہ منقطع ہے۔ اور وہ احادیث جو اس سے قبل حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے بیان ہوئی ہیں اور ان میں یہ بیان ہے کہ امام مہدی علیہ السلام رسول اللہ کی عترت میں سے ہوں گے وہ اسناد کے اعتبار سے اصح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے اسے اپنی کتاب ''کتاب التذکرہ'' میں خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہم نے امام مہدی علیہ السلام کے بارے میں روایات مکمل طور پر ذکر کی ہیں۔ والحمدللہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ سے جزیرہ عرب میں غلبہ مراد لیا ہے۔ تحقیق اس نے ایسا کر دیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾

''اے ایمان والو! بے شک اکثر پادری اور راہب کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طریقہ سے اور روکتے ہیں (لوگوں کو) راہ خدا سے اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی''۔

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اس میں فعل مضارع پر لام داخل ہوا ہے (فَعَلَ) فعل ماضی پر لام داخل نہیں ہوا۔ اس لیے کہ یفعل (فعل مضارع) اسماء کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور الاحبار سے مراد علماء یہود ہیں۔ اور الرھبان سے مراد وہ عیسائی ہیں جو عبادت میں مستغرق رہنے والے اور انتہائی کوشش کرنے والے ہیں۔ بالباطل کہا گیا ہے کہ بے شک وہ اپنے متبعین اور پیروکاروں کے اموال کئی شکلوں اور معین طریقوں سے کنیسوں، عبادت گاہوں اور کئی دوسرے ناموں پر لیتے تھے۔ جس سے وہ انہیں یہ وہم دلاتے تھے کہ ان میں مال خرچ کرنا شرعی حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ذریعہ اور سبب ہے اور وہ اس دوران ان اموال کو روک لیتے تھے، جیسا کہ اسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس راہب سے ذکر کیا ہے جس نے اپنا جمع کیا ہوا مال نکالا۔ اسے ابن اسحاق نے سیر میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ دین کی حمایت اور شریعت کے قیام کے نام پر کئی طریقوں سے ان کے غلے (اناج) اور ان کے اموال لے لیتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ احکام میں رشوت لیتے تھے، جیسا کہ آج بہت سے والی اور حکمران کرتے ہیں۔ اور قولہ: بِالْبَاطِلِ ان تمام صورتوں کو جامع ہے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی وہ اپنے دین والوں کو دین اسلام میں داخل ہونے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ لغت میں کنز کا اصلی معنی ملانا، جوڑنا اور جمع کرنا ہے۔

اور یہ سونے اور چاندی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ کیا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں جانتے: ألا أخبركم بخير ما يكنز المرء المرأة الصالحة (1) (کیا میں تمہیں اس خیر اور بھلائی کے بارے خبر نہ دوں جسے ایک آدمی جمع کرتا ہے (اور وہ) نیک اور صالح عورت ہے، یعنی وہ اسے اپنے نفس کے لیے جوڑتا ہے اور اسے جمع کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

ولم تزوّد من جميع الكنز غير حنوط و رَثيثِ بزّ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لا دَرْدَرِي إن أطعمتُ جائعهم قِرْف الحَيّ و عندي البُرّ مكنوز

میری یہ خوبی خوبی نہیں ہے اگر میں ان کے بھوکوں کو گوگل کا پھل کھلاؤں حالانکہ میرے پاس گندم جمع پڑی ہوئی ہو۔

تو اس میں قرف الحى سے مراد گوگل کا پھل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ ایک قوم کے پاس ٹھہرا ان کے نزدیک اس کی ضیافت گوگل کے پھل سے ہوئی اور وہی الحی ہے، پھر جب وہ لوگ اس کے پاس آئے اس وقت اس نے کہا: لا دَرْ دَرِي...... شعر۔ سونے اور چاندی کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جن پر مطلع نہیں ہوا جا سکتا، بخلاف دیگر ساز و سامان اور اموال کے (کہ ان پر اطلاع ہو سکتی ہے) علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کنز سے مراد ہر وہ شے ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی اور جمع شدہ ہو، چاہے وہ زمین کے اندر ہو یا اس کے اوپر ہو۔ ذهب (سونے) کو ذهب اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چلا جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے اور الفضة (چاندی) کو یہ نام اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر متفرق ہو جاتی ہے اور بکھر جاتی ہے۔ اور اسی سے رب کریم کا یہ ارشاد ہے: انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11)...... لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 159) (تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے) اس کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس آیت کے مراد بہ میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں اور یہی نظریہ اصم کا ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ اس قول کے بعد مذکور ہے: اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب اور ان کے علاوہ مسلمان بھی ہیں۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ صرف اہل کتاب کا ارادہ فرماتا تو پھر کلام اس طرح فرماتا: يَكْنِزُوْنَ یعنی اس کے ساتھ والذين مذکور نہ ہوتا۔ پس جب فرمایا: وَالَّذِيْنَ تو یہ ایک دوسرا نیا معنی ہے جو اس کی وضاحت کر رہا ہے کہ یہاں جملہ کا عطف جملہ پر ہے۔ پس الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ نیا کلام ہے اور یہ مبتدا کی بنا پر مرفوع ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد اہل قبلہ ہیں (2)۔ پس یہ تین اقوال ہیں۔ اور صحابہ کرام کے قول کے مطابق اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ان کے نزدیک کفار شریعت کے فروعی احکام کے مخاطب ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن وہب سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: میں مقام ربذہ سے گزرا تو اچانک میری ملاقات حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہو گئی تو میں نے ان سے کہا: تمہیں اس منزل پر کس نے اتارا ہے؟ تو انہوں نے

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی حقوق المال، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 426

فرمایا: میں شام میں تھا تو میرا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس آیت وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے بارے اختلاف ہو گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور میں نے کہا: یہ ہمارے اور ان کے بارے نازل ہوئی ہے، میرے اور ان کے درمیان یہی اختلاف تھا۔ تو انہوں نے میرے بارے شکایت لکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف بھیج دی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھے مدینہ طیبہ آنے کا لکھ بھیجا۔ پس میں وہاں حاضر ہوا تو بہت سے لوگ مجھ پر جمع ہو گئے یہاں تک کہ (یہ محسوس ہوا) گویا انہوں نے اس سے قبل مجھے نہیں دیکھا تھا۔ تو میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: اگر آپ چاہیں کہ کنارہ کش ہو جائیں تو بھی آپ ہمارے قریب ہی ہوں گے تو یہی وہ جملہ ہے جس نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے اور اگر آپ مجھ پر کسی حبشی کو امیر مقرر کر دیں تو میں یقیناً بات سنوں گا اور اس کی اطاعت کروں گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت سونے چاندی کی زکوٰۃ کے حکم کو بھی متضمن ہے اور وہ چار شرطوں کے ساتھ واجب ہوتی ہے: آزاد ہونا، مسلمان ہونا، سال کا گزرنا اور نصاب کا قرض سے محفوظ اور سلامت ہونا۔ نصاب دو سو درہم یا بیس دینار ہے یا دونوں میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا اور چالیسواں حصہ اس سے اور چالیسواں حصہ اس سے نکالا جائے گا۔ ہم نے کہا ہے کہ آزاد ہونا شرط ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ غلام کی ملکیت ناقص ہوتی ہے۔ اور ہم نے یہ کہا ہے کہ اسلام شرط ہے، کیونکہ زکوٰۃ پاکیزگی اور طہارت ہے اور کافر کو طہارت اور پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: 110) تو اس میں زکوٰۃ کا مخاطب انہیں کو بنایا گیا ہے جنہیں نماز کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اور ہم نے کہا ہے: بے شک سال گزرنا شرط ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مال میں زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے'' اور پھر ہم نے یہ کہا ہے کہ نصاب شرط ہے۔ تو یہ اس لیے ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو سو درہم سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور بیس دینار سے کم میں کوئی زکوٰۃ نہیں''

سال کے شروع میں نصاب کے مکمل ہونے کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سال کے آخر میں اس کے مکمل ہونے کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ اس پر تمام (ائمہ) کا اتفاق ہے کہ نفع اصل کے حکم میں ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس آدمی کے پاس دو سو درہم ہوں پھر وہ انہیں تجارت اور کاروبار میں لگائے اور وہ سال کے آخر میں ایک ہزار ہو گئے تو وہ ایک ہزار کی زکوٰۃ ادا کرے گا، نفع کے لیے اسے از سر نو پورا سال گزارنے کی ضرورت نہیں۔ تو جب صورت حال اس طرح ہے تو پھر نفع کا حکم مختلف نہیں ہوگا، چاہے وہ نصاب سے حاصل ہو یا اس سے کم۔ اور اسی طرح اس پر بھی تمام نے اتفاق کیا ہے کہ اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہوں، پھر انہوں نے سال کے شروع میں بچوں کو جنم دیا پھر ان میں سے سوائے ایک کے ساری مائیں (یعنی بڑی بکریاں) مر گئیں اور ان کے بچے نصاب کو مکمل کر رہے ہوں تو بلاشبہ ان سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے اس کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے کہ آیا اسے کنز کا نام

دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو ایک جماعت نے کہا ہے: ہاں (اسے کنز کہا جا سکتا ہے) اور اسے ابوالضحیٰ نے جعدہ بن ہبیرہ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: چار ہزار اور جو اس سے کم ہے وہ نفقہ اور خرچہ ہے۔ اور جو اس سے زیادہ ہے تو وہ کنز ہے اگرچہ تو نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: وہ مال جس سے تو زکوٰۃ ادا کر دے یا جس مال کی کسی دوسرے مال کے ساتھ زکوٰۃ ادا کر دے تو وہ کنز نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی گئی تو وہ کنز نہیں ہے اگرچہ وہ سات زمینوں کے نیچے ہو اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے تو وہ کنز ہے اگرچہ وہ زمین کے اوپر ہو: ما أدی زکاته فلیس بکنز وإن کان تحت سبع أرضین، وکل مالم تؤد زکاته فهو کنز وإن کان فوق الأرض اور اسی کی مثل حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ صحیح ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے اسے قیامت کے دن گنجے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا جس پر دو سیاہ نشان ہوں گے اور وہ قیامت کے دن اس کے گلے میں لپٹ جائے گا پھر اس کی باچھوں کو پکڑ کر کہے گا: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ الآیہ (آل عمران: 180) (اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے)

اور اس میں بھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! یا قسم ہے اس کی جس کے بغیر کوئی الٰہ نہیں یا جیسے بھی آپ نے قسم کھائی۔ ہر وہ آدمی جس کے پاس اونٹ یا گائیں یا بکریاں ہوں اور وہ ان کا حق ادا نہ کرتا ہو تو قیامت کے دن انہیں اس سے بڑا اور موٹا کر کے لایا جائے گا جتنا وہ ہوتے ہیں اور وہ اسے اپنے پاؤں کے ساتھ روند ڈالیں گے اور اسے اپنے سینگوں کے ساتھ ماریں گے جب بھی ان میں سے آخری آگے گزر جائے گا تو ان میں سے پہلے کو پھر اس پر لوٹا دیا جائے گا یہاں تک کہ اسے لوگوں کے درمیان ڈال دیا جائے گا''۔ پس ان دونوں حدیثوں کے خطاب کی دلیل اس مفہوم کے صحیح ہونے پر دلیل ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ تحقیق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس معنی کو صحیح بخاری میں بیان کیا ہے، ایک اعرابی نے آپ کو کہا: مجھے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ کے بارے بتایئے؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے انہیں جمع کیا اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لیے ہلاکت ہے، بلاشبہ یہ زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا، پس جب زکوٰۃ کا حکم نازل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مالوں کے لیے طہارت اور پاکیزگی بنا دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کنز سے مراد وہ مال ہے جو حاجت اور ضرورت سے زائد اور فالتو ہو۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور یہ جو نقل کیا گیا ہے یہ ان ہی کا مذہب ہے اور یہ ان کے ان شدائد اور سختیوں میں سے ہے جن کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ منفرد ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ وہ مجمل ہے جو اس بارے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ جو روایت کیا گیا ہے کہ آیت انتہائی شدید حاجت کے وقت نازل ہوئی اور مہاجرین کی انتہائی کمزوری اور ضعف کے وقت اور ایسے وقت میں رسول

اللہ ﷺ کا دست مبارک ان کی کفایت سے انتہائی تنگ تھا اور بیت المال میں بھی ان کے لیے کوئی وسعت اور خوشحالی نہ تھی۔ اور خشک سالی ان پر حملہ آور تھی، تو اس حالت میں انہیں حاجت اور ضرورت کی مقدار سے زیادہ مال میں سے کوئی شے رکھنے سے منع کر دیا گیا اور اس جیسے وقت میں سونا، چاندی ذخیرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور انہیں وسعت و خوشحالی عطا فرما دی تو آپ ﷺ نے دو سو دراہم میں سے پانچ درہم اور بیس دینار میں سے نصف دینار واجب کر دیا۔ اور کل واجب نہ کیے اور بڑھنے کی مدت کا اعتبار کیا، تو یہ آپ ﷺ کی طرف سے بیان اور وضاحت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کنز وہ مال ہے جس سے پیش آمدہ حقوق ادا نہ کیے جائیں، جیسا کہ قیدی کی رہائی، بھوکے کو کھانا کھلانا اور دیگر اسی طرح کے امور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کنز لغوی طور پر سونے چاندی کے مجموعہ اور ان کے علاوہ اس مال کو کہا جاتا ہے جسے قیاس کے ساتھ ان دونوں پر محمول کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان دونوں کا مجموعہ ہے جب کہ وہ زیور نہ ہو، کیونکہ ان سے زیور بنانے کی اجازت دی گئی ہے اور اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور صحیح وہی ہے جس کے ذکر سے ہم نے آغاز کیا اور بلاشبہ وہ سب کا سب لغۃً اور شرعاً کنز ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ زیورات کی زکوٰۃ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب، امام احمد، اسحاق، ابو ثور اور ابو عبید رحمہم اللہ کا نظریہ یہ ہے کہ ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور عراق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی تھا اور اس کے بعد مصر میں آپ نے اس میں توقف کیا ہے اور فرمایا ہے: میں اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کروں گا۔ امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: ان تمام میں زکوٰۃ ہے۔ پہلے گروہ نے حجت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: نمو اور بڑھوتری کا پایا جانا سامان میں زکوٰۃ کو واجب کرتا ہے حالانکہ وہ زکوٰۃ واجب کرنے کا محل نہیں ہے۔ اسی طرح سونے چاندی سے اپنی ذات کے لیے زیور بنانے کے سبب نمو کا ختم ہو جانا زکوٰۃ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سونے چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کے بارے عموم الفاظ سے استدلال کیا ہے اور آپ نے زیورات اور ان کے غیر میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اور حضرت لیث بن سعد نے فرق کیا ہے پس انہوں نے ان زیورات میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے جو محض زکوٰۃ سے بچنے کے ارادہ سے بنائے جائیں اور ان میں زکوٰۃ کو ساقط کر دیا ہے جو پہننے کے لیے اور عاریۃً دینے کے لیے بنوائے جائیں۔ زیورات کے بارے میں مذاہب میں تفصیل ہے، اس کا بیان کتب فروع میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ فرمایا: مسلمانوں پر یہ گراں ثابت ہوئی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تم سے اس مشقت کو دور کر دوں گا، چنانچہ آپ چلے اور حضور کی بارگاہ میں عرض کی: یا نبی اللہ! ﷺ بلاشبہ آپ کے اصحاب پر یہ آیت بھاری اور گراں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی مگر اس لیے تاکہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور بے شک اس نے میراث کا حق مقرر کیا ہے۔ اور ایک کلمہ ذکر کیا..... تاکہ وہ تمہارے بعد آنے والوں کے لیے ہو جائے“۔ راوی کا قول ہے: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تکبیر بلند کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا:

"کیا میں تمہیں اس بہترین خزانہ کے بارے خبر نہ دوں جسے آدمی جمع کر سکتا ہے وہ نیک اور صالح بیوی ہے جب آدمی اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کر دے اور جب اسے حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ اس سے غائب ہو تو وہ اس کی حفاظت کرے۔ ألا أخبرك بخير ما يكنز المرء المرأة الصالحة إذا نظر إليها سرته وإذا أمرها اطاعته وإذا غاب عنها حفظته (1) اور ترمذی وغیرہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بیان کیا: تحقیق اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی کی مذمت بیان کی ہے، پس اگر ہمیں علم ہو کون سا مال بہتر ہے تو ہم اسے ہی کمائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کروں گا۔ پس آپ نے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور ایسی بیوی جو دین کے معاملے میں آدمی کی معاون اور مددگار رہو۔ لسان ذاکر و قلب شاکر و زوجة تعين المرء على دينه۔ (2)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہاں ولا ینفقونهما نہیں فرمایا۔ تو اس کے چھ جواب ہیں (۱) ابن الانباری نے کہا ہے: رب کریم نے اغلب اور اعم کا قصد کیا ہے اور وہ چاندی ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ (البقرہ: 45) اس میں ہا ضمیر صلوٰۃ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ وہی اعم ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا (الجمعہ: 11) تو اس میں بھی ہا ضمیر تجارۃ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ وہ اعم ہے اور لھو کو چھوڑ دیا ہے، بہت سے مفسرین نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے اس کا انکار بھی کیا ہے اور کہا ہے: یہ اس کے مشابہ نہیں ہے، کیونکہ او نے تجارت کو لھو سے جدا کر دیا ہے پس ضمیر کو ان دو میں سے ایک کی طرف لوٹانا اچھا ہے۔ (۲) اس کا برعکس ہے، اور وہ یہ ہے کہ ینفقونها سونے کے لیے ہو اور دوسرا اس پر معطوف ہو۔ اور الذهب (سونے) کو عرب مؤنث پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں: هي الذهب الحمراء (یہ سرخ سونا ہے) اور کبھی مذکر بھی پڑھا جاتا ہے لیکن تانیث زیادہ مشہور ہے۔ (۳) کہ یہ ضمیر کنوز کے لیے ہو۔ (۴) ضمیر جمع کیے گئے مالوں کے لیے ہو۔ (۵) ضمیر زکوٰۃ کے لیے ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ولا ینفقون زکاۃ الأموال المکنوزة (وہ جمع کیے گئے اموال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے) (۶) صرف ایک ضمیر پر اکتفا کرنا جب کہ معنی سمجھا جا سکے اور یہ عرب کلام میں بہت زیادہ ہے۔ سیبویہ نے شعر بیان کیا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما		عندك راضٍ والرأي مختلفِ

اس میں راضون جمع نہیں کہا ہے۔

اور دوسرے نے کہا ہے:

رَمانى بأمرٍ كنتُ منه ووالدي		بريئا ومن أجل الطَّوِيّ رماني

اس میں بریئین نہیں کہا ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی حقوق المال، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3019، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اسی طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

إن شرخ الشباب والشعر الأسود مالم يُعاص كان جنونا

اس میں آپ نے یعاصیا تثنیہ نہیں کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اگر کہا جائے: جس نے مال جمع نہیں کیا اور نہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا بلکہ اسے گناہوں میں خرچ کیا، کیا وعید میں اس کا حکم اس کے حکم کی مثل ہی ہوگا جس نے مال جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کیا؟ تو جواب یہ ہے: بلاشبہ یہ اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، کیونکہ جس نے اپنا مال گناہوں اور معاصی میں خرچ کیا اس نے دو اعتبار سے نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب کیا۔ خرچ کرنے کے اعتبار سے اور مال حاصل کرنے کے اعتبار سے، جیسا کہ شراب کو خریدنا اور پھر اسے پینا، بلکہ کئی جہتوں سے وہ معصیت ہے جب کہ معصیت متعدی گناہوں میں سے ہو، جیسا کہ وہ آدمی جس نے کسی مسلم پر ظلم کرنے میں کسی کی مدد کی مثلاً اسے قتل کرنے میں یا اس کا مال چھیننے میں وغیرہ وغیرہ۔ اور مال جمع کرنے والے نے دو اعتبار سے معصیت کی ہے۔ اور وہ زکوٰۃ نہ دینا اور مال کو روکنا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اور کبھی مال کو روکنے کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عذاب کی اپنے اس ارشاد کے ساتھ تفسیر اور وضاحت بیان کی ہے: ”ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو بشارت دے دو داغ دینے کی جو ان کی پشتوں میں لگیں گے (اور) ان کے پہلوؤں میں ظاہر ہو جائیں گے اور ان کی گدی کی جانب سے لگائے جائیں گے اور ان کی پیشانیوں کی طرف سے نکل آئیں گے“۔ الحدیث اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک روایت میں بیان کیا ہے: ”ذخیرہ اندوزوں کو بشارت اس پتھر کے بارے جسے جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اسے ان میں سے ہر ایک کے سر پستان پر رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے کندھے کے اوپر کی جانب سے نکل جائے گا اور اسے اس کے کندھے کی اوپر کی جانب رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے سر پستان سے نکل جائے گا اور وہ لرز جائے گا“۔ الحدیث۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: پتھر کا سر پستان سے داخل ہو کر کندھے کے اوپر کی جانب سے نکلنا اس کے دل اور اس کے باطن کو عذاب دینے کے لیے ہے جب کہ دنیا میں وہ مال کی کثرت، فرحت و سرور سے بھرا رہا، تو اب آخرت میں غم واندوہ اور عذاب کے ساتھ اسے سزا دی جائے گی (1)۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علمائے نے کہا ہے: آیت کا ظاہر وعید کو اس آدمی کے ساتھ معلق کیے ہوئے ہے جو مال جمع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتا اور وہ واجب وغیرہ کے لیے تعرض کرتا ہے، مگر کنز کے خاص طریقہ کا اعتماد کرنا مناسب نہیں، کیونکہ جس نے مال جمع نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روکتا رہا ضروری ہے کہ وہ بھی اس طرح ہو، مگر وہ آدمی جو زمین کے نیچے مال چھپا دیتا ہے وہ وہی ہے جو عرفاً اسے واجبات میں خرچ کرنے سے روکتا ہے، پس اسی لیے وعید کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 922

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

''جس دن تپایا جائے گا (یہ سونا چاندی) جہنم کی آگ میں پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں (اور انہیں بتایا جائے گا) کہ یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے لیے تو (اب) چکھو (سزا اس کی) جو تم جمع کیا کرتے تھے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ، يَّوْمَ ظرف ہے اور تقدیر عبارت ہے: یعذبون یوم یحمی (وہ عذاب دیئے جائیں گے اس دن جس دن اسے تپایا جائے گا) اور یہ صحیح نہیں ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہو: فبشرھم یوم یحمی علیھا کیونکہ اس دن بشارت نہیں ہوگی۔ کہا جاتا ہے: أحمیت الحدیدۃ فی النار، ای أو قدت علیھا (یعنی لوہے کو آگ پر جلایا گیا) اور کہا جاتا ہے: أحمیتہ (میں نے اسے گرم کیا) اور یہ نہیں کہا جاتا: أحمیت علیہ (میں نے اس پر گرم کیا) اور یہاں علیھا فرمایا ہے: کیونکہ یہاں علی، احماء کے معنی کا صلہ بنایا ہے اور احماء کا معنی ایقاد (بھڑکانا) ہے یعنی اسے آگ پر خوب گرم کیا جائے گا اور داغ دیئے جائیں گے۔ الکی کا معنی ہے: گرم ہونے والے لوہے اور آگ کو عضو کے ساتھ چپکانا یہاں تک کہ جلد جل جائے۔ اور الجباہ جبھۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد حاجب (ابرو) اور ناصیہ (پیشانی کے بال) کے درمیان والی ہموار جگہ ہے یعنی پیشانی۔ اور جبھت فلانا بکذا اس کا معنی ہے میں نے اس کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اس کی پیشانی پر ضرب لگائی اور جنوب جنب کی جمع ہے (یعنی پہلو) اور چہرے پر داغ دینا زیادہ واضح اور زیادہ عیب ناک ہے اور پہلو اور پشت میں زیادہ دردناک اور زیادہ تکلیف دہ ہے، پس اسی وجہ سے تمام اعضاء کے درمیان سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا۔ اور علماء صوفیہ نے کہا ہے: جب انہوں نے مال وجاہ کو طلب کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو عیب ناک بنا دیا اور جب انہوں نے فقیر سے اعراض کیا، پہلو تہی اختیار کی جب وہ ان کے ساتھ آکر بیٹھا تو ان کے پہلوؤں میں داغ دیئے گئے۔ اور جب انہوں نے اپنی پشتوں کو اپنے اموال کے ساتھ لگایا ان سے وثوق حاصل کرتے ہوئے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی پشتوں کو داغا گیا۔ (1)

اور علماء ظاہر نے کہا ہے: بلاشبہ ان اعضاء کو خاص اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ غنی اور دولت مند آدمی جب فقیر کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھوں کی درمیانی جگہ کو اکٹھا کر لیتا اور وہ اپنا منہ چڑھا لیتا ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

يَزِيدُ يَغُضُّ الطَّرْفَ عَنِّي كَأَنَّمَا　　زَوَى بَيْنَ عَيْنَيْهِ عَلَيَّ الْمَحَاجِمُ

فَلَا يَنْبَسِطْ مِنْ بَيْنِ عَيْنَيْكَ مَا انْزَوَى　　وَلَا تَلْقَنِي إِلَّا وَأَنْفُكَ رَاغِمُ

اور جب اس سے وہ مانگے تو وہ اعراض برت لیتا ہے اور جب وہ سوال میں اضافہ کرے اور کثرت سے اسے کہے تو وہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 924

اس سے اپنی پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے معصیت کی حالت پر ہی سزا کو مرتب کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس کے ساتھ داغ دینے کی کیفیت میں روایات مختلف ہیں، پس صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے اس میں پتھر کا ذکر ہے۔ اور اس بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی بھی سونے اور چاندی کا مالک نہیں جو اس سے اس کا حق ادا نہیں کرتا مگر جب قیامت کا دن ہوگا تو اس کے لیے آگ پر چوڑی سلاخیں بنائی جائیں گی پھر انہیں جہنم کی آگ پر گرم کیا جائے گا اور ان کے ساتھ اس کے پہلو، چہرے اور اس کی پیٹھ پر داغ دیئے جائیں گے اور جب بھی وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی تو اس کے لیے انہیں دوبارہ لوٹایا جائے گا اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ جنت یا جہنم کی طرف اپنا راستہ دیکھ لے گا'' (1)۔ الحدیث۔ اور بخاری میں ہے: ''بے شک اس کے خزانے کو اس کے لیے گنجے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا''۔ اور غیر صحیح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ آپ نے فرمایا: جس کا کوئی مال ہو اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اسے گنجے سانپ کا طوق پہنایا جائے گا اور وہ اس کے سر میں ڈنگ لگائے گا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید ایسا مختلف جگہوں میں ہوگا۔ ایک جگہ پر اس مال کو اژدہا کی مثل بنا دیا جائے گا۔ اور ایک جگہ وہ سلاخیں ہو جائے گا اور ایک جگہ وہ پتھر ہو جائے گا پس صفات بدلتی رہیں گی لیکن جسمیت ایک ہوگی۔ پس سانپ بھی ایک جسم ہے اور مال بھی ایک جسم ہے۔ اور یہ تمثیل حقیقت ہے، بخلاف اس قول کے: ''موت کو لایا جائے گا گویا کہ وہ ایک چتکبرہ مینڈھا ہے''۔ کیونکہ یہ ایک دوسرا طریقہ ہے۔ (3)

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور سانپ کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ وہ مخلوق کا دوسرا دشمن ہے اور الشجاع سانپوں میں سے وہ سانپ ہے جو شہسوار اور پیدل پر جھپٹ پڑتا ہے، حملہ آور ہو جاتا ہے اور اپنی دم پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات گھڑ سوار تک جا پہنچتا ہے اور یہ صحراؤں میں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اژدھا ہے۔ اللحیانی نے کہا ہے: سانپ کو شجاع کہا جاتا ہے اور ثلاثۃ اشجعہ ہیں اور پھر شجعان ہے۔ اور اقرع سانپوں میں سے وہ ہے جس کے سر کے بال گر جاتے ہیں (یعنی گنجا ہوتا ہے) اور زہر کے سبب سفید ہوتا ہے۔ اور موطا میں ہے: اس کی باچھوں میں دو نقطے (نشان) سے ابھرے ہوتے ہیں جیسا کہ جھاگ ہوتی ہے اور وہ انسان کی باچھوں میں بھی بن جاتے ہیں جب وہ غصے میں ہو اور گفتگو بہت زیادہ کرے (ام) غیلان بنت جریر نے کہا ہے: بسا اوقات میں اپنے باپ کے شعر پڑھتی رہتی ہوں یہاں تک کہ میری باچھوں میں جھاگ بن آتی ہے۔ یہ اس سانپ کی مثال بیان کی گئی ہے جس کا زہر بہت زیادہ ہوتا ہے پس مال کو اس حیوان کی مثل بنا دیا جائے گا جو اپنے مالک کو غصے میں گرا دیتا ہے۔

اور ابن درید نے کہا ہے: اس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ رنگ کے نقطے ہوتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے: اس کو ایسے سانپ کی مثل بنا دیا جائے گا جو اس کا پیچھا کرے گا اور اسے مجبور کر دے گا پس وہ اسے اپنا ہاتھ دے گا اور وہ اسے چبا

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 7563 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 923 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 921

ڈالے گا جیسے نر دانتوں کے ساتھ کاٹ ڈالتا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کسی کو جمع شدہ مال کے ساتھ عذاب نہیں دے گا پس نہ کوئی درہم درہم کو مس کرے گا اور نہ دینار دینار کو مس کرے گا، مگر اس کی جلد کو وسیع کر دیا جائے گا یہاں تک کہ ہر درہم اور دینار کو علیحدہ علیحدہ رکھا جائے گا۔ اور یہ کافر کے بارے میں بلا شبہ صحیح ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ نہ کہ مومن کے بارے میں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ علامہ طبری نے حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ تک سند بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اہل صفہ میں سے ایک آدمی فوت ہوا اس کی چادر میں ایک دینار پایا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ایک داغ ہے'' پھر دوسرا فوت ہوا اور اس کے پاس دو دینار پائے گئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ دو داغ ہیں'' (1) اور یہ یا تو اس لیے ہے کہ یہ دونوں مال صدقہ سے زندگی گزارتے تھے حالانکہ دونوں کے پاس سونا تھا اور یا اس لیے کہ یہ صدر اسلام کا دور تھا، پھر شریعت نے مال جمع کرنے اور اس کے حق ادا کرنے کے احکام مضبوط اور پختہ کر دیئے۔ اور اگر مال کو جمع کرنا ممنوع ہوتا تو پھر اس کا حق یہ ہوتا کہ وہ سارے کا سارا نکال دیا جائے اور امت میں ایسا کوئی نہیں جو یہ لازم کرتا ہو۔ اور تیرے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اموال ہی کافی ہیں۔ اور وہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے تو وہ انہی کا مذہب ہے۔ اور موسیٰ بنت عبیدہ نے عمران بن ابی انس سے، انہوں نے مالک بن اوس بن الحدثان سے اور انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دینار یا درہم یا سونا یا چاندی جمع کی اور اسے کسی قرض خواہ کو نہ دیا اور نہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا تو وہ کنز ہے قیامت کے دن اس کے ساتھ اسے داغا جائے گا''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لائق اور مناسب ہی ہے کہ وہ یہ کہیں اور یہ کہ جو حاجت اور ضرورت سے زائد ہے وہ کنز نہیں ہے بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ کے لیے تیار کیا جائے۔

اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جس نے چاندی یا سونا پیچھے چھوڑا اس کے ساتھ اسے داغا جائے گا چاہے اس کی مغفرت کی گئی ہو یا مغفرت نہ کی گئی ہے۔ خبردار سنو! بلاشبہ تلوار پر لگا ہوا زیور بھی اسی میں سے ہے۔ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی اس حال میں فوت ہوتا ہے کہ اس کے پاس سونا یا چاندی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر قیراط کے ساتھ ایک سلاخ بنا دے گا اس کے ساتھ اسے سر کے بالوں سے لے کر پاؤں تک داغا جائے گا اس کے بعد اس کی بخشش ہو یا اسے عذاب دیا جائے''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے اس صورت پر محمول کیا جائے گا جب اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے اور اس کی دلیل آیت کے ضمن میں ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ پس تقدیر عبارت یہ ہوگی: وعندہ أحمر أو أبیض لم یؤد زکاتہ اور اسی طرح وہ روایت ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جس نے دس ہزار چھوڑے اس کی سلاخیں بنائی جائیں گی اور اس کے ساتھ اس کے مالک کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا (2)، یعنی اگر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی، تاکہ احادیث میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 429 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 923

تناقص لازم نہ جائے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ یعنی ان کو کہا جائے گا: یہ ہے وہ جو تم نے جمع کیا۔ پس اس سے یقال لھم کے الفاظ محذوف ہیں۔ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ یعنی چکھو اس کا عذاب جو تم جمع کرتے رہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۶

"بے شک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ہے کتاب الٰہی میں جس روز سے اس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو، ان میں سے چار عزت والے ہیں، یہی دین قیم ہے پس نہ ظلم کرو ان مہینوں میں اپنے آپ پر اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے جس طرح وہ سب تم سے جنگ کرتے ہیں اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ، شھور، شھر کی جمع ہے۔ پس جب کوئی آدمی اپنے بھائی سے کہے: لا اکلمك الشھور (میں تیرے ساتھ مہینے کلام نہیں کروں گا) اور وہ اس پر ہر قسم کھائے تو وہ ایک سال تک اس کے ساتھ کلام نہیں کر سکے گا۔ یہ بعض علماء نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ کلام نہیں کر سکے گا۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس کی کوئی نیت نہ ہو تو یہ قول تین مہینوں کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ وہ کم سے کم جمع ہے جس کا تقاضا فعول کا صیغہ کرتا ہے اور یہ فعل کی جمع ہے(1)۔ اور عند اللہ کا معنی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم میں اور اس میں جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اثناعشر شھرا، اثناعشر شھرا کو معرب پڑھا گیا ہے، بخلاف اس کی نظائر کے، کیونکہ اس میں اعراب کا حرف اور اس کی دلیل موجود ہے۔ عام قراء نے عشر عین اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو جعفر نے عشر شین کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔

فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ عِنْدَ اللّٰهِ کہنے کے بعد اس کا اعادہ کیا کیونکہ بہت سی اشیا کا وصف اس کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے (کہ وہ اللہ کے پاس ہیں) اور یہ نہیں کہا جا سکتا انہ مکتوب فی کتاب اللہ (کہ وہ کتاب اللہ میں لکھی ہوئی ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان: 34) (بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بے شک اس نے کہا ہے: يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 925

وَ الْاَرْضَ تا کہ وہ یہ بیان کرے کہ اس کی قضاو قدر اس سے پہلے تھی۔ اور یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان مہینوں کو وضع کیا اور ان کے نام ان اسماء کے ساتھ رکھے جن پر انہیں مرتب فرمایا اس دن سے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔ اور انہیں اپنے انبیاء علیہم السلام پر اپنی نازل کردہ کتابوں میں نازل فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا کا یہی معنی ہے۔ اور ان کا حکم اسی حال پر باقی ہے جس پر یہ تھے مشرکوں نے ان کے ناموں کو بدلنے کے ساتھ انہیں اپنی ترتیب سے زائل نہیں کیا اور ان سے اسم میں مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کرنے نے (انہیں اپنی ترتیب سے زائل نہیں کیا) اور اس سے مقصود ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کرنا ہے اور اس طریقہ کو چھوڑنا ہے جسے مہینوں کے ناموں کو مقدم و موخر کرنے اور احکام کو ان اسماء پر جن کو انہوں نے ان پر مرتب کیا تھا معلق کرنے میں بے اہل جاہلیت اپنائے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا: ''اے لوگو! بے شک زمانہ اپنی اس حالت پر گردش کناں ہے جس روز سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے''۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور وہ جو اہل جاہلیت نے کیا کہ انہوں نے محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنایا تو اس سے وہ وصف تبدیل نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ یوم میں عامل وہ مصدر ہے جو فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں ہے اس سے مراد کتب کی واحد نہیں، کیونکہ اعیان ظروف میں عمل نہیں کر سکتے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے: فیما کتب اللہ یوم خلق السموات والأرض اور عند، عدۃ مصدر کے متعلق ہے اور وہی اس میں عامل ہے اور فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ میں فی محذوف کے متعلق ہے، وہ قول باری تعالیٰ: اثْنَا عَشَرَ کی صفت ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: اثنا عشر شهرا معدودة أو مكتوبة في كتاب الله اور یہ جائز نہیں کہ یہ عدۃ کے متعلق ہو، کیونکہ اس میں صلہ اور موصول کے درمیان ان کی خبر کے ساتھ تفرقہ موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عبادات وغیرہ میں سے احکام کو معلق کرنا واجب ہے بلاشبہ وہ ان مہینوں اور سالوں کے ساتھ ادا ہوتے ہیں جنہیں عرب جانتے ہیں، نہ کہ ان مہینوں کے ساتھ جو عجم، روم اور قبط میں معتبر ہیں، اگرچہ یہ بارہ مہینوں سے زائد نہیں ہیں، کیونکہ ان کے دنوں کی تعداد مختلف ہے، ان میں سے کچھ تیس دنوں سے زائد ہوتے ہیں اور کچھ تیس دنوں سے کم ہوتے ہیں اور عربوں کے مہینے تیس دنوں سے زائد نہیں ہوتے اگرچہ ان میں سے بعض ان سے کم ہوتے ہیں اور وہ جو کم ہوتا ہے وہ کوئی مہینہ متعین نہیں، بلاشبہ ان میں کم ہونے اور مکمل ہونے کے درمیان تفاوت بروج میں چاند کی چال کے مختلف ہونے کی بناء پر ہوتا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ وہ حرمت اور عزت والے مہینے جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور وہ رجب ہے جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہے۔ اور وہی رجب مضر ہے اور اس کو رجب مضر کہا گیا ہے؛ کیونکہ ربیعہ بن نزار رمضان کے مہینے کو حرام اور عزت والا مہینہ قرار دیتے تھے اور وہ اسے رجب کا نام دیتے تھے۔ اور مضر نفس رجب کو بھی حرمت والا مہینہ کہتے تھے، پس اس لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن للکیا الطبری

الذی بین جمادی و شعبان (یعنی وہ جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے) اور اس کے نام میں جو خلل تھا اسے اس بیان کے ساتھ ختم کر دیا۔ عرب بھی اسے منصل الاسنہ کا نام دیتے تھے (کیونکہ ان کا طریقہ تھا کہ جب رجب آتا تو وہ اپنے تیر اور نیزوں کے بھالے اتار کر رکھ چھوڑتے تھے تاکہ اس مہینے میں کوئی ایسا فعل نہ صادر ہو جو اس کی حرمت کے خلاف ہو)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو رجاء عطاردی سے روایت نقل کی ہے۔ اور ان کا نام عمران بن ملحان ہے اور یہ قول بھی ہے کہ نام عمران بن تیم ہے۔ انہوں نے بیان کیا: ہم پتھروں کی پوجا کرتے تھے، پس جب ہم کسی پتھر کو پاتے کہ وہ اس (پہلے) سے بہتر اور اچھا ہے تو ہم اسے پھینک دیتے اور دوسرے کو اٹھا لیتے اور جب ہم کوئی پتھر نہ پاتے تو ہم کچھ مٹی جمع کرتے پھر ہم اسے بکریوں کے پاس لے کر آتے اور اس پر انہیں دوہتے پھر اسے لے کر گھومتے پھرتے رہتے اور جب رجب کا مہینہ آجاتا تو ہم کہتے منصل الاسنہ، پس ہم کسی نیزے میں اس کا بھالہ اور نہ کسی تیر میں اس کا لوہا چھوڑتے مگر ہم اسے اتار لیتے اور اسے پھینک دیتے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ مراد صحیح حساب اور پورا عدد ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے: ذٰلِكَ الدِّيْنُ سے مراد ذلك القضاء (وہ فیصلہ) ہے۔ حضرت مقاتل نے کہا ہے: مراد حق ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہاں دین سے مراد اس کی مشہور وجوہ ہوں، مراد وہ شرع اور طاعت ہے۔ الْقَيِّمُ یعنی سیدھا قائم ہونے والا، یہ قام یقوم سے ہے۔ اور یہ سید کی مثل ہے جو کہ ساد یسود سے ہے۔ اور اس کی اصل قیوم ہے۔(1)

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ھن ضمیر تمام مہینوں کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ صرف اشہر حرم کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ یہ ان کے زیادہ قریب ہے اور ظلم بڑھنے کی صورت میں ان کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ: 197) (تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات اور نہ من مانی اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں)

یہ مطلب نہیں کہ ان دنوں کے علاوہ میں ظلم جائز ہے جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ ظلم میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے تم ان میں قتال کے ساتھ اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو، پھر تمام مہینوں میں قتال کو مباح قرار دے کر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ یہ حضرت قتادہ، عطا خراسانی، زہری اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور ابن جریج نے کہا ہے کہ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ لوگوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ حرم پاک میں لڑیں اور نہ یہ حلال ہے کہ وہ اشہر حرام میں لڑیں مگر یہ کہ وہ ان میں باہم لڑیں اور یہ منسوخ نہیں ہے۔ صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہوازن کے ساتھ حنین میں اور ثقیف کے ساتھ طائف میں جنگ لڑی اور آپ نے شوال اور ذوالعقدہ کے کچھ دن ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ اور یہ بیان سورۂ بقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ تم ان مہینوں میں گناہوں کا ارتکاب کر کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 31

اپنے آپ پر ظلم نہ کرو، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب ایک جہت سے کسی شے کو عظیم بنادیتا ہے تو اس کے لیے ایک حرمت ہو جاتی ہے اور جب وہ اسے دو جہتوں سے یا کئی جہتوں سے عظیم بنادے تو پھر اس کی حرمت بھی متعدد ہوتی ہے پس اس میں برے عمل کے سبب سزا دو گنا کر دی جاتی ہے اور اسی طرح عمل صالح کے سبب ثواب بھی دو گنا کر دیا جاتا ہے، کیونکہ جس نے حرمت والے مہینے میں بلد حرام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس کا ثواب اس آدمی کے ثواب کی مثل نہیں ہوگا جس نے حلال مہینے میں بلد حرام میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے حلال مہینے میں شہر حرام میں اس کی اطاعت کی اس کا ثواب اس کے ثواب کی مثل نہیں ہوگا جس نے حلال مہینے میں بلد حلال میں اس کی اطاعت کی۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے: یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ (الاحزاب:30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا)(1)

مسئلہ نمبر 7۔ اس معنی کے اعتبار سے علماء نے اس آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جس نے شہر حرام میں کسی کو خطاءً قتل کر دیا کہ کیا اس پر دیت مغلظہ ہوگی یا نہیں؟ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دیت کے بارے میں جو ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے شہر حرام میں اور حرم پاک میں کسی کو قتل کیا تو اس میں دیت مغلظہ لازم کی جائے گی، لہٰذا وہ دیت اور ایک ثلث مقرر ہوگی اور شبہ عمد کی صورت میں اونٹوں کی عمروں میں اضافہ کیا جائے گا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حرام مہینے اور بلد حرام اور ذوی الرحم میں کسی کو قتل کرنے اور زخم لگانے کی صورت میں دیت مغلظہ لازم ہوگی۔ قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، ابن شہاب اور ابان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے: جس نے حرام مہینے میں یا حرم پاک میں کسی کو قتل کیا تو اس کی دیت میں تہائی دیت کے برابر اضافہ کیا جائے گا۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور امام مالک امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: حل اور حرم پاک میں قتل کرنا برابر ہے۔ اسی طرح حرام مہینے میں اور دوسرے مہینے میں قتل کرنا برابر ہے اور یہی تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اور یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیتوں کا ذکر کیا اور ان میں حرم پاک اور حرام مہینوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ جس نے حرام مہینے یا کسی دوسرے مہینے میں کسی کو خطاءً قتل کیا اس پر ایک جیسا کفارہ ہوگا، (یعنی کفارہ میں دونوں برابر ہوں گے) تو پھر قیاس یہ ہے کہ دیت بھی اسی طرح ہوگی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 8۔ اللہ تعالیٰ نے چار اشہر حرام کو ذکر کے ساتھ خاص کیا ہے اور ان میں ظلم سے منع کیا ہے: یہ ان کے شرف اور عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہے، اگرچہ ہر زمانے میں ظلم ممنوع ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (البقرہ:197) اکثر اہل تاویل کا موقف یہی ہے، یعنی تم چار مہینوں میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ اور حماد بن مسلم نے علی بن زید سے، انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی کہ انہوں نے کہا: فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ کا معنی ہے تم بارہ مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو(2)۔ اور قیس بن مسلم نے حسن

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 927
2۔ تفسیر الطبری، جلد 11، صفحہ 444

سے اور انہوں نے محمد بن حنفیہ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: فیھن کلھن (ان تمام مہینوں میں) پس اگر پہلے قول کی بنا پر کہا جائے: فیھن کیوں فرمایا اور فیھا نہیں فرمایا؟ تو وہ اس لیے ہے کہ عرب لوگ تین سے لے کر دس تک کے لیے ھن اور ھولاء بولتے ہیں اور جب وہ دس سے تجاوز کر جائیں تو پھر ھی اور ھذہ بولتے ہیں، یہ ارادہ کرتے ہوئے کہ قلیل کو کثیر کا نام دینا معروف ہے (یعنی جمع قلت کا جمع کثرت سے نام رکھنا معروف ہے) اور کسائی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں عربوں کے اس فعل سے بڑا متعجب ہوں۔ اسی طرح وہ دس سے کم راتوں کے لیے کہتے ہیں: خلون اور اس سے زیادہ کے لیے خلت بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ بعض زمانوں کو بعض سے حرمت کے اعتبار سے عظیم کیسے بنا دیا گیا ہے؟ کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے فضیلت کے ساتھ خاص کر دیتا ہے، اس کے عمل کی نہ کوئی علت ہے اور نہ اس پر کوئی پابندی، بلکہ جو وہ اپنی حکمت کے مطابق ارادہ فرماتا ہے وہ کر دیتا ہے، اور کبھی اس میں حکمت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مخفی ہوتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اس میں ایک مسئلہ ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَاتِلُوا یہ قتال کے بارے امر ہے۔ اور كافة کا معنی ہے جمیعا (سب کے سب) یہ مصدر ہے اور حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے ای محیطین بھم و مجتمعین (اور تم جنگ کرو مشرکوں سے اس حال میں کہ تم ان تمام کو گھیرے ہوئے ہو اور وہ اکٹھے ہوں) زجاج نے کہا ہے: اس قسم کے مصادر عافاہ اللہ عافیۃ اور عاقبہ عاقبۃ بھی ہیں ان کی تثنیہ اور جمع نہیں بنائی جاتی اور اسی طرح عامۃ اور خاصۃ بھی ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے: اس آیت سے مقصود یہ تھا کہ پہلے اسے فرض عین قرار دیا پھر اسے منسوخ کر دیا اور فرض کفایہ بنا دیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو انہوں نے کہا ہے یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں سے کبھی نہیں جانا گیا کہ انہوں نے ساری امت کو نفر (بھاگنے) کا الزام دیا ہے، بلکہ اس آیت کا معنی مشرکوں کے قتال پر ابھارنا، ان کے خلاف جماعت بندی کرنا اور کلمہ کو جمع کرنا ہے، پھر اسے اپنے اس قول کے ساتھ مقید کر دیا: كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ان کے ہمارے ساتھ قتال کرنے اور ہمارے خلاف جمع ہونے کے اعتبار سے ہمارا بھی ان کے لیے جمع ہونا فرض ہے (1)۔ واللہ اعلم

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۧ

"(حرمت والے مہینوں کو) ہٹا دینا تو اور اضافہ کرنا ہے کفر میں۔ گمراہ کیے جاتے ہیں اس سے وہ لوگ جو کافر ہیں حلال کر دیتے ہیں ایک ماہ کو ایک سال اور حرام کر دیتے ہیں اسی کو دوسرے سال تاکہ پوری کریں گنتی ان مہینوں کی جنہیں حرام کیا ہے اللہ نے تاکہ اس حیلہ سے حلال کر لیں جسے حرام کیا ہے اللہ نے آراستہ کر دیے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 312

گئے ہیں ان کے لیے ان کے برے اعمال۔ اور اللہ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کیے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ اسی طرح اکثر ائمہ پڑھتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: جہاں تک ہم جانتے ہیں حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے سوائے اکیلے ورش کے کسی نے بھی انما النسی بغیر ہمزہ کے روایت نہیں کیا۔ اور یہ نساہ اور أنساہ سے مشتق ہے (اس کا معنی ہے) اس نے اسے موخر کر دیا۔ یہ دونوں لغتیں کسائی نے بیان کی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے کہ النسئی فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور یہ تیرے اس قول سے ماخوذ ہے: نسأت الشئ فھو منسوء جب تو اسے موخر کر دے۔ پھر منسوئ کو نسئی کی طرف پھیر دیا گیا ہے جیسے مقتول کو قتیل کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اور رجل ناسی اور قوم نساۃ یہ فاسق اور فسقۃ کی مثل ہے۔ علامہ طبری نے کہا ہے: النسئ ہمزہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے زیادتی کرنا۔ کہا جاتا ہے: نسا ینسأ جب وہ زیادہ ہو جائے۔ فرمایا: اگر ہمزہ کے بغیر ہو تو وہ فقط نسیان سے ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ (التوبہ: 67) اور یہ حضرت نافع کی قراءت کا رد ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ یہ حرف جر کے ساتھ متعدی ہوتا ہے: کہا جاتا ہے: نسأ اللہ فی أجلك (اللہ تعالیٰ تیری موت کو موخر کر دے) جیسے تو کہتا ہے: زاد اللہ فی أجلك (اللہ تعالیٰ تیری عمر میں اضافہ کرے) اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے: من سرہ أن یبسط لہ فی رزقہ وینسأ لہ فی أثرہ فلیصل رحمہ (جس کے لیے یہ باعث مسرت ہو کہ اس کے لیے اس کا رزق وسیع کر دیا جائے اور اس کے لیے اس کی موت مؤخر کر دی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے)

ازہری نے کہا ہے: أنسأت الشئ انساء و نسیئا یہ اسم ہے جو مصدر حقیقی کی جگہ رکھا گیا ہے۔ وہ محرم میں جنگ وجدال کو حرام قرار دیتے تھے اور جب انہیں اس کی ضرورت پیش آتی تو وہ اس کے بدلے صفر کو حرام کر دیتے اور محرم میں جنگ شروع کر دیتے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ عرب جنگ اور غارت گری کے دلدادہ تھے اور ان پر یہ شاق اور گراں گزرتا تھا کہ وہ لگاتار تین مہینے رکے رہیں جن میں وہ کوئی جنگ وجدال نہ کریں۔ تو انہوں نے کہا: اگر ہم پر مسلسل تین مہینے آجائیں جن میں ہم کوئی شے حاصل نہ کریں تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ پس جب وہ منیٰ سے واپس لوٹتے تو بنی کنانہ میں ٹھہرتے تھے پھر بنی فقیم میں ایک آدمی تھا جسے قلمس کہا جاتا تھا، تو وہ کہنے لگا: میں وہ ہوں کہ میرا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جائے گا۔ تو وہ کہنے لگے: تو ہم سے محرم کی حرمت کو مؤخر کر دے اور اسے صفر میں رکھ دے۔ پس وہ ان کے لیے محرم کو حلال کر دیتا۔ تو وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک مہینہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ تحریم پورے سال میں گھوم گئی۔ پھر اسلام آیا اور محرم اپنی اسی جگہ کی طرف لوٹ گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اسے رکھا ہوا تھا(1)۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والأرض اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مشرک ہر مہینے میں دو سال حج کرتے رہے، پس انہوں نے دو سال ذوالحجہ میں حج کیا، پھر دو سال محرم میں حج کیا، پھر دو سال صفر میں حج کیا، اسی طرح تمام مہینوں میں وہ کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ حج جو آپ نے حجۃ الوداع سے پہلے کیا تھا وہ 9 ہجری میں ذوالقعدہ

1۔ تفسیر البغوی، جلد 2، صفحہ 290

کے موافق آیا، پھر آئندہ سال حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع ادا فرمایا اور وہ ذوالحجہ کے موافق آیا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کا یہ ارشاد ہے: إِنَّ الزمان قد استدار (1) الحدیث۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ حج کے مہینے اپنے اصل محل کی طرف لوٹ آئے ہیں اور حج ذوالحجہ کی طرف لوٹ آیا ہے اور نسئی باطل ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ ایاس بن معاویہ نے کہا کہ مشرک سال کا بارہ مہینے اور پندرہ دنوں کے ساتھ حساب لگاتے تھے، پس حج رمضان المبارک میں اور ذوالقعدہ میں اور سال کے ہر مہینے میں ہوتا رہتا پندرہ دنوں کی زیادتی کے سبب مہینے کی گردش کرنے کے حکم سے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی گردش کے حکم کے تحت 9ھ میں ذی القعدہ میں حج ادا کیا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا نہ فرمایا، پھر جب آئندہ سال 10ھ میں حج ذوالحجہ کے موافق ہو گیا اور وہ چاندوں کے موافق بھی ہو گیا۔ اور یہ قول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے: إِنَّ الزمان قد استدار یعنی حج کا زمانہ اپنے اس اصلی وقت کی طرف لوٹ آیا جسے اللہ تعالیٰ نے معین فرمایا تھا جس روز اس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا اس اصل مشروعیت کے ساتھ جس کے بارے اسے پہلے علم تھا اور اس کے بارے اس کا حکم نافذ ہے۔ پھر فرمایا: سال بارہ مہینے کا ہے۔ اس کے ساتھ اس زیادتی کی نفی ہو رہی ہے جو انہوں نے اپنے فیصلے کے ساتھ سال میں اضافہ کر رکھا تھا۔ اور وہ پندرہ دن ہیں، پس وقت اصلی متعین ہو گیا اور تحکم جبلی باطل ہو گیا۔ امام مازری نے خوارزمی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے سورج کو تخلیق فرمایا اور اسے برج حمل میں رکھا اور وہ زمانہ جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے وہ سورج کے برج حمل میں اترنے کے موافق ہے۔ اور یہ توقیف کا محتاج ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے نقل کیے بغیر اس تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اس بارے ان سے کوئی صحیح قول منقول نہیں۔ اور جو اس کا دعویٰ کرے اسے چاہیے کہ وہ اس کی سند بیان کرے۔ اور اس کے خلاف جو قول ہے عقل اسے جائز قرار دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بروج سے پہلے سورج کو تخلیق فرمایا ہے اور عقل اسے بھی جائز قرار دیتی ہے کہ اس نے ان تمام کو ایک ہی بار تخلیق فرمایا ہے۔ پھر علماء تعدیل نے اس بارے تحقیق کی تو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: إِنَّ الزمان قد استدار کے وقت سورج کو برج الحوت میں پایا اور اس کے اور برج حمل کے درمیان بیس درجے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے کہا: یہ دس درجات ہیں۔ واللہ اعلم

اہل تاویل نے اس کے بارے اختلاف کیا ہے جس نے پہلی بار (شہر حرام کو) مؤخر کیا۔ پس حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: وہ مالک بن کنانہ کے بیٹے تھے اور وہ تین تھے (2)۔ اور جویبر نے حضرت ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس نے پہلی بار یہ عمل کیا وہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف تھا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے پہلی بار یہ فعل کیا وہ بنی کنانہ کا ایک آدمی تھا اسے نعیم بن ثعلبہ کہا جاتا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک آدمی تھا اس کو جنادہ بن عوف کہا جاتا تھا اور یہ وہی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پایا ہے۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پہلے بنی کنانہ کا ایک قبیلہ پھر بنی فقیم کا ان میں سے ایک آدمی تھا جسے القلمس کہا جاتا تھا اور اس کا نام حذیفہ بن عبید تھا۔ اور ایک

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 455
2۔ تفسیر البغوی، جلد 2، صفحہ 291

روایت میں ہے: وہ مالک بن کنانہ تھا۔ اور وہ جو نسئی تھا وہ حکومت اور مختار تھا وہ ریاست اور حکومت کے ساتھ کامیاب تھا، کیونکہ عرب اس کی ریاست کو قبول کرتے تھے اور اسی بارے میں ان کا شاعر کہتا ہے:

ومنّا ناسِیُٔ الشّهرِ القَلَمّس

اور ہم میں سے مہینے کو مؤخر کرنے والا القلمس ہے

اور کمیت نے کہا ہے:

ألسنا الناسئين على مَعَدٍّ شهورَ الحِلّ نجعلها حراماً

کیا ہم معد پر حلال مہینوں کو مؤخر کرنے والے نہیں ہیں کہ ہم انہیں حرام بنا دیتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ یہ اس کا بیان ہے جو عربوں نے انواع کفر میں سے مجموعی طور پر کیا، کیونکہ انہوں نے وجود تعالیٰ کا انکار کیا اور کہا: وَ مَا الرَّحْمٰنُ (الفرقان: 60) اصح وجوہ میں یہی ہے۔ اور انہوں نے بعث بعد الموت کا انکار کیا اور کہا: مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ۝ (یٰسین) (جی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں) اور انہوں نے رسل علیہم السلام کی بعثت کا انکار کیا اور انہوں نے کہا: اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (القمر: 24) (کیا ایک انسان جو ہم میں سے ہے (اور) اکیلا ہے ہم اس کی پیروی کریں)

اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ حلال و حرام کرنا ان کے اختیار میں ہے، پس انہوں نے اپنی طرف سے اپنی شہوات کو پورا کرنے کے لیے اس بدعت کا ارتکاب کیا اور اسے حلال قرار دیا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا۔ اور کوئی اس کے کلمات کو تبدیل کرنے والا نہیں اگرچہ مشرک ناپسند بھی کریں۔

قولہ تعالیٰ: يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اس میں تین قراءتیں ہیں: اہل حرمین اور ابوعمرو نے يَضِل پڑھا ہے اور کوفیوں نے يُضَل فعل مجہول پڑھا ہے۔ حسن اور ابورجا نے يُضِل پڑھا ہے۔ تینوں قراءتوں میں سے ہر ایک ایک معنی کو ادا کرتی ہے مگر تیسری قراءت کے مطابق اس سے مفعول محذوف ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: ويُضِل به الذين كفروا من يقبل منهم (اور اس کے ساتھ وہ کفر کرنے والے اسے گمراہ کرتے ہیں جو ان سے اسے قبول کرتا ہے) اور الذین محل رفع میں ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر اللہ عزوجل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اور تقدیر عبارت یہ ہو: يُضِل الله به الذين كفروا (اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں گمراہ کرتا ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا) جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: يضل من يشآء (وہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور جیسا کہ آیت کے آخر میں اس کا قول ہے: وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کیے ہوئے ہے)۔ اور دوسری قراءت يُضَلُّ به الذين كفروا یعنی اسے ان کے لیے شمار کیا گیا ہے۔ اس قراءت کو ابوعبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ (ان کے لیے ان کے برے اعمال آراستہ کر دیئے گئے) اور پہلی قراءت کو ابوحاتم نے اختیار کیا ہے، کیونکہ وہ اس یعنی نسئی کے سبب

گمراہ ہوئے، کیونکہ وہ اسے شمار کرتے تھے اور اس کے سبب گمراہ ہو جاتے تھے اور یحلونہ میں ہا ضمیر نسئی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ابو رجا سے یَضَل یا اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ مروی ہے۔ اور یہ ایک لغت ہے: کہا جاتا ہے: ضللت أضل اور ضللت أضل (یہ باب سمع یسمع اور باب ضرب یضرب دونوں ہے) لیواطئوا لام کی کے ساتھ اسے نصب دی گئی ہے، تا کہ وہ برابر اور پورے ہو جائیں۔ تواطأ القوم علی کذا ای اجتمعوا علیہ (یعنی وہ اس پر جمع اور متفق ہو گئے) یعنی انہوں نے ایک مہینے کو حلال نہیں کیا مگر ایک مہینے کو حرام بھی قرار دیا تا کہ حرام مہینے چار ہی باقی رہیں۔ اور یہی صحیح ہے، نہ کہ وہ جو ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے پانچواں مہینہ بنا دیا۔ حضرت قتادہ نے کہا: بے شک انہوں نے صفر کا قصد کیا اور اس کا حرام مہینوں میں اضافہ کر دیا اور اسے تحریم میں محرم کے ساتھ ملا دیا۔ قطرب اور طبری نے ان سے یہ قول نقل کیا ہے (1)۔ اور اسی کی بنا پر النسئی بمعنی زیادتی (اضافہ کرنا) ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝

”اے ایمان والو! کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جب کہا جاتا ہے تمہیں کہ نکلو راہ خدا میں تو بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو، کیا تم نے پسند کر لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں، سو نہیں ہے سروسامان دنیوی زندگی کا آخرت میں مگر قلیل“۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَكُمْ اس میں ما حرف استفہام برائے تقریر و توبیخ ہے، تقدیر عبارت ہے: أی شئ یمنعکم عن کذا (کون سی شی تمہیں اس طرح کرنے سے منع کرتی ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: کیا ہے تجھے کہ تو فلاں سے اعراض کر رہا ہے؟ مالك عن فلان معرضا؟ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے والوں کے لیے ان کے پیچھے رہنے پر بطور عتاب نازل ہوئی اور یہ فتح مکہ کے ایک سال بعد 9 ھ کا واقعہ ہے، عنقریب اس کا ذکر سورہ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور النفر کا معنی ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی نئے ہونے والے کام کی وجہ سے سرعت اور تیزی کے ساتھ منتقل ہونا۔ ابن آدم کے بارے میں کہا جاتا ہے: نَفَر إلی الأمر ینفر نفوراً (وہ بڑی تیزی کے ساتھ کام کی طرف گیا) اور اسی سے رب کریم کا یہ ارشاد بھی ہے: وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝ (الاسراء) (تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے) اور دابۃ (جانور) کے بارے کہا جاتا ہے: نَفَرت تَنفِرُ (فا کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ ہے) نفارا و نفوراً۔ اور کہا جاتا ہے: فی الدابۃ نفار (جانور کا بدکنا وغیرہ) اور یہ الحران کی مثل اسم ہے۔ اور نفر الحاج من مِنًی نَفْرًا (اور حاجی منیٰ سے تیزی

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 454

کے ساتھ چل پڑے)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ مفسرین نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم زمین کی نعمتوں کی طرف یا زمین پر اقامت اختیار کرنے کی طرف بوجھل ہو کر جھک جاتے ہو۔ اور یہ جہاد ترک کرنے پر زجر و توبیخ ہے اور نکلنے میں جلدی نہ کرنے پر عتاب ہے اور یہ اس کی طرح ہے جو زمین پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرلے۔ اِثَّاقَلْتُمْ اصل میں تثاقلتم ہے۔ تا کو ثا میں مدغم کیا گیا ہے، کیونکہ یہ اس کے قریب المخرج ہے اور پھر ہمزہ وصل کی ضرورت پیش آئی تاکہ ساکن کو بولنا ممکن ہو سکے، اور اسی کی مثل ادّارکوا اور ادّارأتم اور اطّیرنا اور ازّینت ہیں۔ اور کسائی نے شعر بیان کیا ہے:

تُولِی الضَّجِيعَ إذا ما استافها خَصِرًا عذبَ المَذاق إذا ما اتَّابع القبَلُ

اعمش نے تثاقلتم اصل کے مطابق قراءت کی ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے (1)۔ غزوۂ تبوک کی طرف شدید گرمی، پھل پکنے اور ٹھنڈے سایوں کے موسم میں آپ نے لوگوں کو دعوت دی، جیسا کہ حدیث طیبہ میں آیا ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ پس لوگوں پر سستی اور کاہلی غالب آگئی، تو وہ بیٹھ گئے اور بوجھ سا محسوس کرنے لگے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اس قول کے ساتھ زجر و توبیخ فرمائی اور ان پر دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کی وجہ سے عتاب کیا۔ اور اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ کا معنی ہے کیا تم نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پسند کرلی ہے؟ تقدیر کلام ہے: أرضيتم بنعيم الدنيا بدلاً من نعيم الآخرة (کیا تم نے اخروی نعمتوں کے بدلے دنیوی نعمتوں کو پسند کرلیا ہے؟) اس میں من بدل کے معنی کو متضمن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ⓺ (الزخرف) ای بدلا منکم (اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسا دیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے)

اور شاعر نے کہا ہے:

فليت لنا من ماء زمزم شربةً مُبرّدةً باتت على طَهَيان

اے کاش! ہمارے لیے ماء زمزم کے بدلے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی ہوتا جو رات کے وقت لکڑی پر پڑا ہوتا اس میں ماء حمنان (مکہ کا پانی) روایت کیا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے: لیت لنا بدلا من ماء زمزم شربة مبردة اور الطھیان سے مراد وہ لکڑی ہے جو گھر کی ایک طرف میں ہوا کے لیے نصب کی جاتی ہے، اس پر پانی لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ وہ ٹھنڈا ہو جائے (2)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی راحت اور سکون کو آخرت کی راحت پر ترجیح دینے کی وجہ سے عتاب فرمایا ہے، جب کہ آخرت کی راحت دنیا کی مشقت اور تکلیف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا درآنحالیکہ انہوں نے سوار ہو کر طواف کیا: أجرُكِ على قدر نصبكِ (تیرا اجر تیری مشقت کی مقدار کے مطابق ہوگا) اسے بخاری نے نقل کیا ہے۔ (3)

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⓷⓽

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 34 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 937 3۔ ایضاً

''اور اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ عذاب دے گا تمہیں دردناک عذاب۔ اور بدل کر لے آئے گا کوئی دوسری قوم تمہارے علاوہ اور تم نہ بگاڑ سکو گے اس کا کچھ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 1۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلَّا تَنْفِرُوْا شرط ہے، اسی لیے اس کے آخر سے نون حذف ہے۔ اور اس کا جواب یُعَذِّبْكُمْ اور وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ہے اور یہ شدید جھڑک ہے اور (جہاد پر) نکلنے کو ترک کرنے میں وعید موکد ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پختہ اور مسلمہ اصولوں میں سے ہے کہ امر جب وارد ہو تو اس کے ورود میں فعل کے اقتضا سے زیادہ کچھ مقصود نہیں ہوتا، پس رہا ترک امر کے وقت عقاب اور سزا تو وہ نفس امر سے اخذ نہیں کی جاتی اور نہ اقتضا اس کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ عقاب اور سزا اس کے بارے خبر سے ثابت ہوتی ہے، جیسے کسی کا یہ قول: ان لم تفعل کذا عذبتك بکذا (اگر تو نے اس طرح نہ کیا تو میں تجھے اس طرح سزا دوں گا) اسی طرح اس آیت میں وارد ہے، پس اس کے مقتضی کے مطابق جہاد کے لیے نکلنا اور کفار کے ساتھ قتال کرنے کے لیے ان کی طرف جانا اس بنا پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہو۔ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا اور مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ... تا قولہ ... یَعْمَلُوْنَ (التوبہ) اسے اس کے پیچھے آنے والی اس آیت نے منسوخ کر دیا ہے: وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً (التوبہ: 122) اور یہی حضرت ضحاک، حسن اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ یُعَذِّبْكُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد ان سے بارش کو روک لینا ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر یہ ان سے صحیح ہے تو وہی زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہاں کہا ہے، ورنہ دنیا میں عذاب الیم دشمن کے غلبہ کے ساتھ ہے اور آخرت میں آگ کے ساتھ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں ابن نفیع سے نقل کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے پوچھا اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا اور یہی ان کے لیے عذاب تھا (1)۔ اور اسے امام ابو محمد بن عطیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ذکر کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل میں سے ایک قبیلہ والوں کو نکلنے کے لیے فرمایا تو وہ بیٹھ گئے (یعنی وہ نہ نکلے) تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا اور اس کے ساتھ انہیں عذاب دیا اور الیم کا معنی ہوتا ہے درد پہنچانے والا۔ یعنی انتہائی تکلیف دہ۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ یہ ایک وعید ہے کہ وہ اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک قوم کو بدل دے گا جو آپ کے انہیں نکلنے کا حکم دینے کے وقت پیچھے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ کہا گیا ہے: مراد ابناء فارس ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد اہل یمن ہیں۔ وَّ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا یہ معطوف ہے۔ اور اس میں ہا ضمیر کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی نسخ نفیر العامۃ الخ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ اور جہاد سے بوجھل ہو کر بیٹھ جانا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ہر ایک پر حرام ہے۔ اور رہا وہ جس میں کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہو تو جسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معین فرما دیا تو اس پر کاہلی اور سستی کا اظہار کرنا اور بوجھل ہو کر بیٹھ جانا حرام ہے اور اگر وہ ان دونوں سے مامون ومحفوظ ہو تو پھر یہ فرض کفایہ ہے۔ اسے علامہ قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور تحقیق کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حاجت کے وقت، کافروں کے غلبے کے وقت اور ان کی قوت وشوکت کے زیادہ ہونے کے وقت نکلنا واجب ہے، کیونکہ اس کا وجوب دعوت دینے کے ساتھ مختص نہیں، کیونکہ وہ متعین ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو جائے تو دعوت دینا اور نکلنے کا مطالبہ کرنا بعید ہے کہ وہ کسی ایسی شے کا موجب ہو جو اس سے پہلے واجب نہیں، مگر یہ کہ امام جب کسی قوم کو معین کر دے اور انہیں جہاد کی طرف بلائے تو ان کے لیے اس تعیین کے وقت بوجھل ہونا جائز نہیں اور اس تعیین کے سبب یہ ان کے لیے فرض عین ہو جائے گا محض جہاد کی وجہ سے نہیں بلکہ امام کی اطاعت کی وجہ سے۔ واللہ اعلم

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

"اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تو (کیا ہوا) ان کی مدد فرمائی ہے خود اللہ نے جب نکالا تھا ان کو کفار نے۔ آپ دوسرے تھے دو سے جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ فرما رہے تھے اپنے رفیق کو کہ مت غمگین ہو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، پھر نازل کی اللہ نے اپنی تسکین ان پر اور مدد فرمائی ان کی ایسے لشکروں سے جنہیں تم نے نہ دیکھا اور کر دیا کافروں کی بات کو سرنگوں اور اللہ کی بات ہی ہمیشہ سر بلند ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: اگر تم غزوۂ تبوک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نکل کر آپ کی مدد نہ کرو گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ تبوک سے واپس لوٹنے کے بعد ان کو عتاب کیا۔ نقاش نے کہا ہے: پہلی آیت ہے جو سورہ براءت میں سے نازل ہوئی۔ اور اس کا معنی یہ ہے: اگر تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ آپ کا ضامن اور کفیل ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے قلت کے مواقع میں آپ کی مدد ونصرت فرمائی اور آپ کو اپنے دشمن پر عزت وغلبہ کے ساتھ واضح غلبہ عطا فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے غار میں آپ کے صاحب اور رفیق کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی اس طرح کہ وہ آپ کے ساتھ مانوس تھے، انہوں نے آپ کو کندھوں پر اٹھایا، آپ کے ساتھ وفا کی اور اپنی جان کے ساتھ آپ کی حفاظت کی اور اپنے مال کے ساتھ آپ کے لیے اظہار ہمدردی کیا (1)۔ لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 940

نے کہا: ہے، انبیاء علیہم السلام کے اصحاب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مثل تھے۔ اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس آیت کے ساتھ اس عتاب سے نکل گئے جس کا ذکر اِلَّا تَنْصُرُوْهُ کے ارشاد میں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ان سے دور ہو کر نکلے تھے، لیکن انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مجبور کر دیا تھا یہاں تک کہ آپ نے ایسا کیا، پس رب کریم نے فعل کی نسبت ان کی طرف کی اور اس میں حکم ان پر مرتب کیا۔ پس اسی وجہ سے قتل پر مجبور کرنے والے کو قتل کیا جاتا ہے اور بالاکراہ ضائع ہونے والے مال کا ضامن مکرہ کو بنایا جاتا ہے، کیونکہ وہی قاتل کو قتل پر اور مال ضائع کرنے والوں کو مال ضائع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: ثَانِيَ اثْنَيْنِ یعنی دو میں سے ایک۔ اور یہ اسی طرح ہے ثالث ثلاثۃ (تین میں سے ایک) اور رابع اربعۃ (چار میں سے ایک) اور جب لفظ مختلف ہوں تو یہ کہے: رابع ثلاثۃ و خامس اربعۃ تو اس کا معنی ہے تین کو اپنی ذات کے ساتھ چار بنانے والا اور چار کو پانچ بنانے والا۔ اور ترکیب کلام میں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالا اس حال میں کہ آپ تمام لوگوں سے منفرد اور الگ تھے سوائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے (یعنی وہ آپ کے ساتھ تھے)۔ اس میں عامل نصرہ اللہ ہے نصرہ منفردا او نصرہ أحد اثنين (اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی اس حال میں کہ آپ منفرد تھے اور اس حال میں کہ آپ دو میں سے ایک تھے)۔ حضرت علی بن سلیمان نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے فخرج ثانی اثنین (پس دو میں سے دوسرا نکلا) جیسا کہ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے) اور جمہور لوگوں نے ثانی یا کی نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس کے سوا کوئی معروف نہیں۔ اور ایک جماعت نے ثانی یا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابو عمرو بن علاء نے اسے بیان کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یا کو الف کے مشابہ قرار دیتے ہوئے ساکن پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: پس یہ حسن کی قراءت کی طرح ہے ما بقی من الربا اور اسی طرح جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فَارْضَوا مَارَضِي لكُمُ ماضِي العزيمةِ مافي حُكْمه جَنَفُ

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ، الْغَار سے مراد پہاڑی کی کھوہ ہے، مراد غار ثور ہے۔ جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے ہیں تو انہوں نے کہا: یہ ایسا مضبوط شر ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ پس انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا، پس انہوں نے آپ کے لیے رات مقرر کر دی اور طویل رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس کے دروازے پر آپ کی تاک میں رہے تاکہ جب آپ باہر نکلیں تو وہ آپ کو قتل کر دیں۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم ارشاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ وہ ان پر اپنا اثر ڈال دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اس حال میں کہ ان پر نیند چھائی ہوئی تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سروں پر مٹی ڈال دی اور چلے گئے، جب صبح ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس باہر تشریف لائے اور انہیں بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، تب انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو نکل گئے اور نجات پا گئے۔

اور حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کا وعدہ فرما رکھا تھا۔ اور ان دونوں نے اپنی سواریاں عبد اللہ بن ارقط کے حوالے کی ہوئی تھیں۔ اسے ابن اریقط بھی کہا جاتا ہے، وہ کافر تھا لیکن ان دونوں کو اس پر اعتماد اور یقین تھا اور یہ راستہ دکھانے کے لیے راہبر تھا۔ پس ان دونوں نے اسے اجرت پر لیا تا کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس گھر کے پچھلے دروازے سے نکلے جو بنی جمح میں تھا اور دونوں جبل ثور میں غار کی طرف چلے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے عبد اللہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ وہ باتیں سنے جو لوگ کریں اور اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو حکم دیا کہ وہ اپنا ریوڑ چرائے اور رات کے وقت وہ اسے ان کے پاس لے آئے پس وہ اس طرح ان کی حاجت اور ضرورت کو پورا کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں چلے اور غار میں داخل ہو گئے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا ان کے پاس کھانا لاتی تھیں اور حضرت عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما خبریں لے کر آتے تھے، پھر ان کے پیچھے عامر بن فہیرہ ریوڑ لے کر آتا اور وہ ان کے نشانات کو مٹا دیتا تھا۔ پس جب قریش نے آپ ﷺ کو مفقود اور گم پایا تو وہ آپ ﷺ کو قیافہ شناسوں کے ساتھ تلاش کرنے لگے ایسے قیافہ شناس جو نشانات قدم کی پہچان میں بڑے معروف اور مہارت رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ (چلتے چلتے) غار پر جا ٹھہرے اور کہا: یہاں نشان ختم ہو گیا ہے پھر انہوں نے دیکھا تو مکڑی نے غار کے منہ پر اس وقت جالا سا بن رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے مارنے سے منع فرمایا ہے۔ پس جب انہوں نے مکڑی کا جالا دیکھا تو انہوں نے یقین کر لیا کہ اس میں کوئی نہیں ہے، چنانچہ وہ واپس لوٹ گئے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے بارے میں اس آدمی کے لیے سو اونٹوں کا انعام مقرر کر دیا جو آپ کو ان کے پاس لوٹا کر لائے گا۔ یہ خبر مشہور ہے۔ اور سراقہ بن مالک بن جعشم کا قصہ اس میں مذکور ہے۔ اور حضرت ابو الدرداء اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبوتری کو حکم ارشاد فرمایا تو اس نے مکڑی کے جالے پر انڈے دے دیئے اور وہ اپنے انڈوں پر بیٹھنے لگی، پس جب کفار نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غار سے واپس لوٹا دیا(1)۔

مسئلہ نمبر 5۔ بخاری نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنی دیل کے ایک آدمی کو اجرت پر لیا اور وہ ماہر راہبر تھا اور وہ کفار قریش کے دین پر تھا، پس دونوں نے اپنی سواریاں اس کے حوالے کر دیں اور اس سے تین راتوں کے بعد غار ثور آنے کا معاہدہ کیا، پس وہ تیسری صبح کو دونوں کی سواریاں لے کر آ گیا اور دونوں نے وہاں سے رخت سفر باندھا اور آپ کی معیت میں عامر بن فہیرہ اور دیلی راہبر بھی چلا اور وہ انہیں لے کر ساحل (ایک جگہ کا نام ہے) کے راستہ پر چلا۔

مہلب نے کہا ہے: اس میں فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اہل شرک کو راز اور مال پر امین بنانا جائز ہے، بشرطیکہ ان کے بارے وفا اور مروت کا یقین ہو جیسا کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے اس مشرک کو مکہ مکرمہ سے اپنے نکلنے کے بارے اور اونٹنیوں پر امین بنایا۔ ابن منذر نے کہا ہے: اس میں یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو راستے کی رہنمائی کے لیے کفار کو اجرت پر لینا جائز ہے۔ اور امام

1۔ الطبقات لابن سعد، جلد 1، صفحہ 229

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں کہا ہے: "باب استئجار المشرکین عند الضرورة أو إذا لم یوجد اهل الاسلام" ابن بطال نے کہا ہے: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عنوان میں کہا ہے أو إذا لم یوجد اهل الاسلام یا جب اہل اسلام میں سے کوئی نہ پایا جائے۔ اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے بلاشبہ اہل خیبر کے ساتھ معاملہ کیا کہ وہ وہاں کی زمین پر کام کریں گے جب مسلمانوں میں سے ایسے نہ پائے گئے جو زمین پر کام کرنے میں ان کے نائب بن سکتے ہوں، یہاں تک کہ اسلام قوی ہو گیا اور ان کی ضرورت باقی نہ رہی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ اور عام فقہاء ضرورت کے وقت اور اس کے بعد بھی انہیں اجرت پر لینا جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ دو آدمیوں کا ایک آدمی کو اس شرط پر اجرت پر لینا کہ وہ ان دونوں کے لیے کام کرے گا (یہ بھی جائز ہے) اور اس میں دشمن کے خوف سے دین کے ساتھ فرار اختیار کرنے کے جواز پر بھی دلیل ہے۔ اور غیرت وغیرہ کے معاملہ میں حقیر جاننے کے خوف سے فرار اختیار کرنا بھی جائز ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس کے لیے صلح اور سلامتی چاہتے ہوئے بذات خود دشمن کے حوالے نہ ہو جائے۔ اور اگر تمہارے رب نے چاہا تو وہ اسے ان کے ساتھ ہونے کے باوجود اس سے محفوظ رکھے گا، یہ انبیاء اور دیگر لوگوں کے لیے اللہ کا طریقہ ہے (1) اور تو اللہ کے طریقہ کو ہرگز بدلا ہوا نہ پائے گا۔ اور جس نے اس سے منع کیا ہے اس کے نظریہ کے فاسد ہونے پر یہ بہت بڑی دلیل ہے اور کہا ہے: جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے غیر سے بھی ڈرے تو یہ اس کے توکل میں نقص ہے اور اس کا تقدیر پر ایمان نہیں۔ اور یہ سب کا سب آیت کے معنی میں ہے۔ وللہ الحمد والبدایۃ۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: **اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل کو متضمن ہے۔ اصبغ اور ابو زید نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ **ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** میں صاحب سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے آپ ﷺ کے قول کو اپنے کلام کے ساتھ ثابت کر دیا ہے اور اپنی کتاب میں آپ کے وصف صحابیت کو بیان کیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے: جو کوئی حضرت عمر، حضرت عثمان یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے کسی ایک کے رسول اللہ ﷺ کا صاحب ہونے کا انکار کرے تو وہ کذاب اور بدعتی ہوگا۔ اور جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رسول اللہ ﷺ کا صاحب ہونے کا انکار کر دیا تو وہ کافر ہے، کیونکہ اس نے قرآن کریم کی نص کا رد کیا ہے۔ اور **اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** کا معنی ہے یعنی مدد و نصرت کرنے، لحاظ رکھنے اور حفاظت و نگہبانی کرنے کے اعتبار سے بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

ترمذی اور حارث بن ابی اسامہ دونوں نے بیان کیا ہے کہ ہمیں عفان نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں ہمام نے بیان کیا، اس نے کہا ہمیں ثابت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے خبر دی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بیان کیا کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی اس حال میں کہ ہم غار میں تھے، اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو وہ یقیناً ہمیں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 940

اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا ابابکر، ما ظنك باثنین الله ثالثھما (اے ابوبکر تیرا ان دو کے بارے کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہے) (1)۔ محاسبی نے کہا ہے: یعنی اللہ تعالیٰ مدد و نصرت اور دفاع کے اعتبار سے ان دو کے ساتھ ہے نہ کہ اس معنی کی بنا پر جس کے ساتھ وہ ساری مخلوق کو شامل ہے۔ پس فرمایا: مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (المجادلہ: 7) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے) تو اس کا معنی عام ہے کہ وہ کفار اور مومنین میں سے بھی کی سنتا ہے اور انہیں دیکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: امامیہ نے کہا ہے: غار میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا غمزدہ اور پریشان ہونا ان کے جہل، نقص اور دل اور رائے کی کمزوری پر دلیل ہے۔ تو ہمارے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ کی طرف حزن اور پریشانی کی نسبت کرنا یہ نقص نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں کوئی نقص نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے: نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ (ہود: 70) (تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے، فرشتوں نے کہا: ڈریئے نہیں) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں اس قول سے کوئی نقص نہیں: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہٰ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا ہم نے فرمایا (اے کلیم) مت ڈرو) اور حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ہے: لَا تَحْزَنْ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ (العنکبوت: 33) (اور نہ رنجیدہ خاطر ہم نجات دینے والے ہیں تمہیں اور تیرے کنبہ کو)

پس یہ وہ عظیم انبیاء علیہم الصلوٰات والتسلیمات ہیں جن میں (خوف تقیہ) نصا پایا گیا ہے۔ اور یہ نہ ان پر طعن ہے اور نہ ان کے لیے ایسا وصف ہے جو باعث نقص ہو۔ تو اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات میں بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس اظہار میں احتمال ہے، کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا: اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کے نیچے (جھک کر) دیکھا تو یقیناً وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ حزن و ملال حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے اس خوف کی وجہ سے تھا کہ آپ کو کوئی ضرر اور تکلیف پہنچے اور اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معصوم اور محفوظ نہ تھے، بلاشبہ یہ ارشاد گرامی وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: 67) (اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے) مدینہ طیبہ میں نازل ہوا۔

مسئلہ نمبر 8۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ابو الفضائل العدل نے ہمیں کہا ہے کہ جمال الاسلام ابو القاسم نے ہمیں کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ (الشعراء) (ہرگز نہیں، بلاشبہ میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا) اور حضور نبی مکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا، تو یقیناً جب اللہ تعالیٰ اکیلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے تو ان کے اصحاب ان کے بعد مرتد ہو گئے پس جب وہ اپنے رب کے پاس سے واپس لوٹ کر آئے تو انہیں پایا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کر رہے ہیں۔ اور جب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3021، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہدایت یافتہ، موحد، عالم اور امر کے ساتھ یقیناً قائم رہنے والے باقی رہے اور کوئی خلل و فساد آپ تک راہ نہ پا سکا۔(1)

مسئلہ نمبر 9۔ ترمذی نے عبیط بن شریط کی حدیث نقل کی ہے انہوں نے حضرت سالم بن عبید رضی اللہ عنہ سے (انہیں شرف صحبت بھی حاصل ہے) بیان کی انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی طاری کر دی گئی الحدیث۔ اور اس میں ہے: مہاجرین مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوئے اور کہنے لگے: چلو ہمارے ساتھ ہمارے انصار بھائیوں کی طرف ہم انہیں اس معاملہ میں اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں پھر انصار نے کہا: ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک امیر تم میں سے ہوگا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کون ہے جس کے لیے اس کی مثل تین وصف ہوں؟ ثَانِيَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِي الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کون ہے جو ان دو کی مثل ہو؟ راوی کا بیان ہے: پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر لوگوں نے بھی انتہائی حسین و جمیل انداز میں آپ کی بیعت کر لی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: ثَانِيَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِي الۡغَارِ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، کیونکہ خلیفہ ہمیشہ ثانی (دوسرا) ہی ہوتا ہے۔ اور میں نے ہمارے شیخ امام ابوالعباس احمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے لیے ثانی اثنین کہا جائے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انہوں نے معاملات کو اسی طرح قائم کیا جیسے پہلے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قائم کیا۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا تو سارا عرب مرتد ہو گیا اور مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور جعواث (بحرین میں ایک جگہ ہے) کے بغیر کہیں اسلام باقی نہ رہا۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور آپ نے انہیں دین میں داخل کرنے کے لیے ان کے ساتھ قتال کیا جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ پس اس اعتبار سے آپ اس کے مستحق ہیں کہ آپ کے حق میں ثانی اثنین (دو میں سے دوسرے) کہا جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احادیث صحیحہ موجود ہیں، جن کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلیفہ ہیں اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور کوئی مخالف باقی نہیں رہا۔ اور آپ کی خلافت میں شک اور جرح، قدح کرنے والا بالیقین خطاکار اور فاسق ہے۔ کیا وہ کافر ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ الفتح میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کتاب و سنت اور اقوال علماء سے جو بات قطعی ہے اور واجب ہے کہ دل اس کے ساتھ ایمان لائیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام سے افضل و اعلیٰ ہے اور اہل تشیع اور اہل بدعت کے اقوال کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ان کفر کرنے والوں جن کی گردنیں ماری جاتی ہے اور بدعت و فسق کا ارتکاب کرنے والوں کے درمیان ہیں ان کی کوئی بات قبول نہ کی جائے گی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ افضل

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 939

ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں لوگوں کے درمیان چناؤ اور انتخاب کا اختیار دیا جاتا تھا تو ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہلے پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو چنتے تھے۔ ائمہ اہل سلف نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں اختلاف کیا ہے؟ ان میں سے جمہور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم جانتے ہیں۔ اور امام مالک کے بارے روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اس بارے میں توقف کیا ہے۔ اور ان کے بارے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے جمہور کے موقف کی طرف رجوع کر لیا ہے اور یہی اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی تسکین نازل فرمائی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمارے علماء نے کہا ہے: یہی زیادہ قوی ہے، کیونکہ آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے قوم سے خوف لاحق ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو امن عطا فرما کر آپ پر تسکین اور راحت کو نازل فرمایا اور آپ کا اضطراب پرسکون ہو گیا، آپ کا ڈر اور خوف ختم ہو گیا اور امن و سکون حاصل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ثمامہ (ایک بوٹی کا نام ہے) کو اگا دیا اور اس میں کبوتری کے گھونسلا بنانے کا الہام کیا۔ اور مکڑی کو بھیجا پس اس نے اس پر جالا بن دیا۔ تو ظاہر دکھائی دینے میں یہ لشکر کتنا کمزور ہے اور باطنی معنی کے اعتبار سے یہ کتنا قوی ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت فرمایا جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جھگڑا کیا: ''کیا تم میرے لیے میرے صاحب (رفیق) کو چھوڑ دو گے، بے شک تمام لوگوں نے کہا: آپ جھوٹے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا آپ سچے ہیں''۔ اسے ابودرداء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا یعنی ملائکہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ أیدہ میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور دونوں ضمیریں مختلف ہیں۔ اور قرآن کریم اور کلام عرب میں یہ کثیر الاستعمال ہے۔ وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى اس سے مراد کلمہ شرک ہے۔ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا کہا گیا ہے کہ مراد لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مدد و نصرت کا وعدہ ہے۔ اعمش اور یعقوب نے كَلِمَةُ اللّٰهِ کو جعل پر محمول کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے استئناف کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور فراء نے یہ گمان کیا ہے کہ نصب کی قراءت بعید ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ تیرا قول یہ ہوتا ہے أعتق فلان غلام أبیہ (فلاں نے اپنے باپ کا غلام آزاد کیا) اور تو یہ نہیں کہتا: غلام أبی فلان اور ابوحاتم نے جو کہا ہے وہ اس کے قریب قریب ہے۔ انہوں نے کہا: واجب ہے کہ کہا جائے: و کلمتہ ھی العلیا۔ نحاس نے کہا ہے: جو کچھ فراء نے کہا ہے وہ آیت سے مشابہت نہیں رکھتا، لیکن سیبویہ نے جو شعر بیان کیا ہے وہ اس سے مشابہت رکھتا ہے:

لا أری الموت یسبق الموت شیء نغص الموت ذا الغنی والفقیرا

پس یہ بہت اچھا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں، بلکہ ماہر نحوی کہتے ہیں: اس طرح کے محل میں دوبارہ ذکر کرنا فائدہ مند ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں تعظیم کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۙ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۙ (الزلزلۃ) پس اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اور کلمہ کی جمع کلم ہے۔ اور تمیم کہتے ہیں: ھی کلمۃ یعنی کاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور فراء نے اس میں تین لغات بیان کی ہیں: کَلِمۃ وکِلْمۃ وکَلْمۃ جیسا کہ کَبِد، کِبْد اور کَبْد اور وَرِق، وِرْق اور وَرْق ہے۔ اور الکلمہ ایک طویل قصیدہ بھی ہے، اسے جوہری نے کہا ہے۔

اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

”(جہاد کے لیے) نکلو (ہر حال میں) ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم (اپنا نفع نقصان) جانتے ہو“۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت سفیان نے حصین بن عبدالرحمن سے انہوں نے ابو مالک غفاری سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: سورۂ براءت میں سے جو آیت سب سے اوّل نازل ہوئی وہ اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ہے۔ اور ابوالضحیٰ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اس کے بعد اس کا اوّل اور اس کا آخر نازل ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس میں دس اقوال ہیں: (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے انفروا ثبات کا معنی ذکر کیا گیا ہے، متفرق جماعتوں اور دستوں کی صورت میں نکلو (۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نکلو اس حال میں کہ چست ہو اور غیر چست ہو (۳) خفیف سے مراد غنی اور امیر ہے اور ثقیل سے مراد فقیر اور مفلس ہے۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (۴) خفیف سے مراد جوان ہے اور ثقیل سے مراد بوڑھا ہے۔ یہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۵) خفیف سے مراد وہ ہے جو کاروبار میں لگا ہوا ہو اور ثقیل سے مراد وہ جس کا کوئی کاروبار نہ ہو۔ یہ زید بن علی اور حکم بن عتیبہ نے کہا ہے (۶) ثقیل سے مراد وہ ہے جس کے اہل و عیال ہوں اور خفیف سے مراد وہ ہے جو عیال دار نہ ہو، یہ زید بن اسلم نے کہا ہے (۷) ثقیل وہ ہے جس کی جائیداد اور زمین ہو جسے چھوڑنا وہ ناپسند کرتا ہو اور خفیف وہ ہے جس کی جائیداد اور زمین نہ ہو۔ یہ ابن زید نے کہا ہے (۸) خفاف سے مراد پیدل ہیں اور ثقال سے مراد گھڑسوار ہیں۔ یہ امام اوزاعی نے کہا ہے (۹) خفاف سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ کی طرف آگے بڑھ جاتے ہیں جیسا کہ مقدمۃ الجیش وغیرہ اور ثقال سے مراد سارے کا سارا لشکر ہے (۱۰) خفیف سے مراد شجاع اور بہادر ہے اور ثقیل سے مراد بزدل ہے۔ اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ آیت کے معنی میں صحیح یہ ہے کہ تمام لوگوں کو حکم دیا گیا ہے، یعنی نکلو تم پر حرکت کرنا سہل اور آسان ہو یا مشکل۔ روایت ہے کہ حضرت ابن مکتوم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: کیا مجھ پر بھی نکلنا لازم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں“ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيۡسَ عَلَى

اَلْاَعْمٰی حَرَجٌ (النور:61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے)

اور یہ اقوال بلاشبہ ثقل وخفت میں مثال کے معنی کی بنا پر ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی (التوبہ:91) (نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر)

بعض نے کہا ہے: اس کے لیے ناسخ یہ ارشاد گرامی ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ (التوبہ:122) (تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلے سے چند آدمی۔

اور صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے اس قول باری تعالیٰ: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: مراد جوان اور بوڑھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی کا عذر نہیں سنا، پس وہ شام کی طرف نکلے اور جہاد کیا یہاں تک کہ فوت ہو گئے رضی اللہ عنہ۔

حماد نے ثابت اور علی بن زید سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے سورت براءت پڑھی پس وہ اس آیت پر پہنچے اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا تو فرمایا: اے میرے بچو! میرے لیے تیاری کرو میرے لیے سامان جہاد تیار کرو۔ تو آپ کے بیٹوں نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، تحقیق آپ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہو گیا اور آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معیت میں مصروف جہاد رہے یہاں تک کہ وہ بھی وصال فرما گئے پس اب ہم آپ کی طرف سے جہاد کریں گے۔ تو انہوں نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم میرے لیے سامان جہاد تیار کرو۔ چنانچہ انہوں نے سمندر میں جہاد کیا اور سمندر میں ہی فوت ہوئے۔ تو مسلمانوں نے ان کے لیے کوئی جزیرہ نہ پایا جس میں انہیں دفن کرتے مگر سات دن گزرنے کے بعد۔ اور پھر انہوں نے آپ کو اس میں دفن کیا اور آپ میں کوئی تغیر اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔ (1)

علامہ طبری نے اس آدمی کی سند سے بیان کیا ہے جس نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو حمص میں صراف کے تابوت پر دیکھا اور وہ اپنے موٹا ہونے کے سبب تابوت پر بھاری تھے اور وہ جہاد کی تیاری کر رہے تھے۔ تو آپ کو عرض کی: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا: ہمارے پاس سورۃ البعوث اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا آ چکی ہے۔ اور زہری نے کہا ہے: حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ غزوے کی طرف نکلے درآنحالیکہ آپ کی ایک آنکھ کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ آپ کو کہا گیا: بلاشبہ آپ بیمار ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر خفیف (صحت مند) اور ثقیل (بیمار) کو نکلنے کے لیے فرمایا ہے۔ پس اگر اس نے مجھے جنگ لڑنے کی قدرت نہ دی تو میں تعداد میں اضافہ کروں گا اور سامان کی حفاظت کروں گا۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ بعض لوگوں نے شام کے غزوات میں ایک آدمی کو دیکھا بڑھاپے کی وجہ سے اس کے دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے تھے، تو اس آدمی نے اسے کہا: اے چچا! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھے معذور قرار دیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا: اے

1۔ طبقات ابن سعد، جلد 3، صفحہ 507

میرے بھتیجے! تحقیق ہمیں جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے اس حال میں کہ ہم خفیف (جوان) ہوں یا ثقیل (بوڑھے) ہوں۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد کے دن کہا۔ ان کا اسم گرامی عمرو تھا: میں نابینا آدمی ہوں، تو انہوں نے جھنڈا میرے سپرد کر دیا، کیونکہ جب علمبردار شکست کھا جائے تو پورا لشکر شکست سے دو چار ہو جاتا ہے اور میں نہیں جانتا تھا کہ کون اپنی تلوار کے ساتھ میرا قصد کرے گا پس میں کھڑا رہا۔ اس دن علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پکڑا تھا اس کا بیان سورۂ آل عمران میں پہلے گزر چکا ہے۔ پس اس وجہ سے اور جو کچھ اس کی مثل صحابہ کرام اور تابعین علیہم الرضوان سے مروی ہے ہم نے کہا ہے کہ نسخ کا بیان صحیح نہیں ہے۔ اور کبھی ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں تمام کا نکلنا واجب ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 4۔ جب جہاد ملک کے حصص میں سے کسی حصہ میں دشمن کے غلبہ پا لینے کے سبب یا اس کے اپنا لشکر اتار لینے کے سبب متعین ہو جائے (یعنی فرض عین ہو جائے) تو ایسے حالات میں اس ملک کے جملہ باسیوں پر واجب ہے کہ وہ اس کی طرف نکلیں، کوچ کریں ہلکے ہوں یا بوجھل، جوان ہوں یا بوڑھے، ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق شریک ہوگا، جس کا باپ ہو وہ اس کی اجازت کے بغیر نکلے اور وہ بھی جس کا باپ (زندہ) نہ ہو، جو بھی خروج کی قدرت رکھتا ہے وہ پیچھے نہیں رہے گا، چاہے وہ جنگجو ہو یا تعداد میں اضافہ کرنے والا۔ اور اگر اس ملک کے باسی اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہوں تو پھر جو ان کے قریب رہ رہے ہیں اور ان کے پڑوس اور جوار میں واقع ہیں ان پر اسی طرح خروج لازم ہے جس طرح اس ملک کے اپنے باسیوں پر یہاں تک کہ وہ جان لیں کہ ان میں دشمن کے سامنے کھڑا ہونے اور ان کا دفاع کرنے کی طاقت آگئی ہے۔ اور اسی طرح ہر اس پر خروج لازم ہے جسے دشمن کے مقابلے میں ان کی کمزوری کا علم ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ وہ انہیں پا لے گا اور ان کے لیے ان کی مدد کرنا ممکن ہوگا تو اس پر بھی ان کی طرف نکلنا لازم ہے۔ پس مسلمان تمام کے تمام ان کے خلاف ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں جو ان کے سوا ہیں، یہاں تک کہ جب اس علاقے کے لوگ دشمن کو روکنے پر قادر ہو گئے جہاں دشمن اترا ہوا تھا تو پھر دوسروں سے وہ فرض ساقط ہو جائے گا۔ اگر دشمن دار الاسلام کے قریب آ گیا اور وہ اس میں داخل نہ ہوا تو پھر بھی اس کی طرف خروج کرنا ان پر لازم ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب آ جائے، ملک بچا لیا جائے، سرحدیں محفوظ ہو جائیں اور دشمن کو ذلیل و رسوا کر لیا جائے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (1)

واجب جہاد میں دوسری قسم یہ ہے کہ امام وقت پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر سال ایک بار ایک طائفہ دشمن کی طرف بھیجے اور بذات خود ان کے ساتھ نکلے یا اسے بھیجے جس پر اسے مکمل یقین اور وثوق ہو تا کہ وہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دے اور انہیں رغبت دلائے اور ان کی اذیتوں کو روکے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ان پر کھول کر بیان کرے، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا وہ (احسان کے بدلے) جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔

اور جہاد میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ نفل ہے۔ اور وہ امام وقت کا یکے بعد دیگرے مختلف دستے روانہ کرنا اور غفلت و بے خبری کے اوقات میں اور فرصت کے لمحات میں سرایا بھیجنا ہے، ایسی جگہوں میں چھاؤنیاں بنا کر ان کی تاک میں رہنا ہے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 943

جہاں سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہو اور اپنی قوت و طاقت کا اظہار کرنا ہے۔ پس اگر کہا جائے: ایک آدمی کیسے کر سکتا ہے جب بقیہ تمام کوتاہی اور غفلت برت رہے ہوں۔ تو وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 5۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: وہ ایک قیدی کا قصد کر سکتا ہے اور وہ اس کا فدیہ دے سکتا ہے، کیونکہ جب اس نے ایک کا فدیہ دے دیا تو اس نے ایک کے بارے میں اس سے زیادہ ذمہ داری ادا کر دی جو پوری جماعت پر لازم تھی، کیونکہ اگر اغنیاء قیدیوں کا فدیہ تقسیم کر لیں تو ان میں سے ہر ایک فقط درہم سے کم ہی ادا کرے گا۔ اور وہ آدمی بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوگا اگر وہ اس پر قادر ہو ورنہ وہ لڑنے کے لیے ایک آدمی تیار کرے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کسی لڑنے والے کو ساز و سامان کے ساتھ تیار کیا تحقیق اس نے خود جنگ میں حصہ لیا اور جس نے خیر اور بھلائی کے ساتھ اس کے گھر والوں کی خبر گیری اور دیکھ بھال کی تحقیق وہ بھی جنگ میں شریک ہوا'' (1)۔ اسے الصحیح نے نقل کیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے، کیونکہ اس کا مکان اسے مستغنی نہیں کر سکتا اور اس کا مال اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ روایت ہے کہ کسی بادشاہ نے کافروں کے ساتھ معاہدہ کیا اس شرط پر کہ وہ کسی کو قیدی بنا کر محبوس نہیں کریں گے، پھر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی ان کے کسی شہر میں گیا اور اس کا گزر ایک بند گھر کے پاس سے ہوا، تو اسے ایک عورت نے آواز دی: میں قیدی ہوں، تو اپنے امیر تک میری خبر پہنچا دینا۔ پس جب وہ اس (امیر) سے ملا اور اسے اپنے پاس کھانے کی دعوت دی اور دونوں باتوں کے ضمن میں کش مکش کرنے لگے، تو اس نے بالآخر اس قیدی عورت کی خبر اس تک پہنچائی، ابھی اس کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ امیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور بالفور لڑنے کے لیے نکل پڑا اور سرحد کی طرف پیدل چل کر گیا یہاں تک کہ اس قیدی عورت کو نکال لایا اور اس جگہ کو اپنی ولایت میں لے لیا۔ رضی اللہ عنہ۔

اسے علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: تحقیق 527ھ میں دشمن ہماری طرف آنکلا (اللہ اسے ہلاک و برباد کرے) اور لوٹ مار کے لیے ہمارے گھروں میں آگھسا، اس نے ہمارے شرفاء کو قیدی بنا لیا اور وہ ہمارے شہروں میں اتنی تعداد میں داخل ہوا جس نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ تعداد بہت زیادہ اور کثیر تھی اگرچہ وہ اس حد کو نہ پہنچے جو انہوں نے بیان کی۔ تو میں نے والی اور مولی علیہ کو کہا: یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تحقیق یہ جال اور پھندے میں آچکا ہے، پس چاہیے کہ تمہارے پاس برکت ہو اور چاہیے کہ تم سے دین کی مدد و نصرت کا اظہار ہو تم پر حرکت کرنا (نکلنا) فرض عین ہو چکا ہے، پس چاہیے کہ اس کی طرف مقابلے کے لیے تمام لوگ نکلیں یہاں تک کہ تمام اطراف میں لوگوں میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے اور اس کا گھیراؤ کر لیا جائے، کیونکہ یہ لامحالہ ہلاک ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے سبب خوش کرنا ہے۔ پس گناہ غالب آگئے اور دل گناہوں کے سبب کانپ گئے اور لوگوں میں سے ہر کوئی لومڑی کی مثل ہو گیا جو اپنی بل میں پناہ لیتا ہے اگرچہ وہ اپنے پڑوس میں فریب اور جال دیکھ بھی لے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ (2)

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَّجَاهِدُوْا یہ جہاد کے بارے حکم ہے اور یہ امر الجھد سے مشتق ہے۔ بِاَمْوَالِكُمْ وَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 944 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 943

اَنْفُسِكُمْ ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مشرکوں کے ساتھ اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ساتھ جہاد کرو''۔ اور یہ وصف ہے جو جہاد کو کامل بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے نفع بخش بناتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کمال اوصاف پر برانگیختہ کیا اور ذکر میں مال کو اس لیے مقدم کیا، کیونکہ یہ جہاد کی تیاری میں پہلے خرچ ہونے والا ہے، لہٰذا امر کو اسی طرح مرتب کیا جیسے وہ فی نفسہ ہے۔ (1)

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿۴۲﴾

''اگر ہوتا وہ مال نزدیک یا سفر آسان تو ضرور پیچھے چلتے آپ کے لیکن دور معلوم ہوتی ہے انہیں مسافت۔ اور ابھی قسم کھائیں گے اللہ کی (اور کہیں گے) کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور نکلتے تمہارے ساتھ، ہلاک کر رہے ہیں اپنے آپ کو اور اللہ جانتا ہے کہ وہ قطعاً جھوٹے ہیں''۔

جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے قوم کا نفاق ظاہر کر دیا۔ العرض سے مراد وہ جو منافع دنیا میں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کا معنی ہے: اگر مال غنیمت قریب ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے خبر دی ہے کہ اگر انہیں مال غنیمت کی طرف بلایا جاتا تو وہ ضرور اس کی اتباع کرتے۔

عَرَضًا یہ کان کی خبر ہے۔ قَرِيبًا یہ اس کی صفت ہے۔ وَّسَفَرًا قَاصِدًا یہ اس پر معطوف ہے۔ اور کان کا اسم محذوف ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: لوکان المدعو الیہ عرضاً قریباً وسفراً قاصداً لاتبعوك (اگر وہ جس کی طرف دعوت دی گئی ہے وہ قریب ترین مال غنیمت ہوتا اور سفر آسان ہوتا جس کے راستے معلوم ہوتے تو وہ ضرور آپ کے پیچھے چلتے) یہ اشارہ منافقین کے لیے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، کیونکہ وہ فی الجملہ ان لوگوں میں داخل ہیں جنہیں جہاد کے لیے نکلنے کا خطاب کیا گیا ہے اور یہ کلام عرب میں موجود ہے، وہ جملہ کا ذکر کرتے ہیں پھر وہ ضمیر لاتے ہیں جو ان میں سے بعض کی طرف لوٹ رہی ہوتی ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں کہا گیا ہے: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: 71) (اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا) کہ اس ہاء سے مراد قیامت ہے۔ پھر اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾ (مریم) (پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے) اس میں اللہ تعالیٰ نے ھا ضمیر سے مراد جہنم لی ہے۔ معنی کے اعتبار سے اس آیت کی نظیر سنت میں بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لویعلم أحدھم انّه یجد عظما سمینا أو مرماتین حسنتین لشھد العشاء (اگر ان میں سے کوئی جان لے کہ وہ موٹی ہڈی یا دو نرم گوشت والی بوٹیاں پالے گا تو وہ ضرور عشاء کی نماز میں حاضر ہو) آپ فرما رہے ہیں: اگر ان میں سے کوئی جانتا کہ وہ کسی شے کو موجود اور جلدی پالے گا تو وہ یقیناً اس کی وجہ

1۔ المحرر الوجیز

سے مسجد میں آئے۔ وَ لٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ابوعبیدہ وغیرہ نے بیان کیا ہے: الشقه سے مراد دور دراز زمین کی طرف سفر کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: منه شقه شاقة (یہاں سے سفر مشقت آمیز ہے) اور اس سے مراد غزوۂ تبوک ہے۔ اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ شُقہ اور شِقہ کہا جاتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: الشقه ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد ہے کپڑوں کی پھٹن۔ اور الشقه کا معنی دور دراز کا سفر بھی ہے اور بسا اوقات انہوں نے اسے کسرہ کے ساتھ الشقة بھی کہا ہے۔ اور الشقق وہ پھٹن ہے جو تختی یا لکڑی میں پائی جاتی ہے۔ اور غصے والے آدمی کے لیے کہا جاتا ہے: احتد فطارت منه شقة (وہ غضبناک ہوا پس اس سے مشقت دور ہوگئی۔)

وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا یعنی اگر ہمارے لیے سواری اور مال کی وسعت ہوتی۔ لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ تو ہم ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: 97) (اور اللہ کے لیے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی) حضور نبی مکرم ﷺ نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: مراد "زادراہ اور سواری ہے" اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ یعنی وہ جھوٹ اور نفاق کے ساتھ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس علت اور سبب کے بیان میں قطعاً جھوٹے ہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

"درگزر فرمایا ہے اللہ نے آپ سے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے آپ پر وہ لوگ جنہوں نے سچ کہا اور آپ جان لیتے جھوٹوں کو"۔

قولہ تعالیٰ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کہا گیا ہے کہ یہ افتتاح کلام ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: أصلحك الله و أعزك و رحمك (اللہ تعالیٰ نے تیری اصلاح فرمادی، تجھے عزت عطا فرمادی اور تجھ پر رحم فرمایا) یہ بھی اسی طرح کا جملہ ہے۔ اس تاویل کی بنا پر اس قول عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پر وقف کرنا اچھا ہے۔ اسے مکی، مہدوی اور نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذنب سے قبل عفو کی خبر دی ہے تاکہ آپ کا قلب اطہر کسی خوف و اضطراب میں واقع نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ سے درگزر فرمایا ہے آپ کے اس ذنب کے بارے میں جو آپ کے انہیں اجازت دینے کی صورت میں صادر ہوا۔ تو اس تقدیر پر عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ پر وقف کرنا اچھا نہیں (عفا الله عنك ما كان من ذنبك في أن أذنت لهم) اسے مہدوی نے بیان کیا ہے اور اسے نحاس نے اختیار کیا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ اذن (اجازت دینے) کے بارے دو قول ہیں (۱) آپ نے انہیں اپنے ساتھ نکلنے کی کیوں اجازت دے دی تھی، حالانکہ بغیر تیاری اور سچی نیت کے بغیر ان کے نکلنے میں فساد ہے (۲) آپ نے انہیں بیٹھے رہنے کی اجازت کیوں دے دی تھی جب انہوں نے طرح طرح کے عذر پیش کیے، ان دونوں کو علامہ قشیری نے بیان کیا ہے، فرمایا: یہ لطف بھرا عتاب ہے۔ کیونکہ پہلے فرمادیا: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے اس بارے میں وحی نازل ہوئے بغیر ہی اجازت عطا فرمادی تھی۔ حضرت قتادہ اور عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ نے

کہا ہے: دو کام ہیں جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے درآنحالیکہ آپ کو ان کے بارے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقین کی جماعت کو اپنے سے پیچھے رہنے کے بارے میں اجازت دینا، حالانکہ اس کے بارے وحی کے ذریعہ کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیدیوں کا فدیہ لینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب فرمایا جیسا کہ تم سن رہے ہو۔ بعض علماء نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک اولیٰ صادر ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے عفو و درگزر کا ذکر اس خطاب سے مقدم کیا جو عتاب کی صورت میں فرمایا۔

قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ تاکہ آپ کے لیے ظاہر ہو جاتے وہ جنہوں نے سچ بولا ان سے جنہوں نے نفاق اختیار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منافقین کو نہ پہچانتے تھے، بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سورۃ التوبہ نازل ہونے کے بعد پہچانا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ قوم ہے جنہوں نے کہا: ہم (پیچھے) بیٹھے رہنے کی اجازت طلب کریں، پس اگر آپ نے ہمیں اجازت عطا فرما دی تو ہم بیٹھ رہیں گے اور اگر آپ نے ہمیں اجازت نہ دی تو بھی ہم بیٹھ رہیں گے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت سورۃ النور کی اس آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (النور:62) (پس جب وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لیے، تو اجازت دیجئے ان میں سے جسے آپ چاہیں) اسے نحاس نے معانی القرآن میں ذکر کیا ہے۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

”نہ اجازت مانگیں گے آپ سے جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر کہ نہ (جہاد) کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے پرہیزگاروں کو۔ صرف وہی اجازت مانگتے ہیں آپ سے جو نہیں ایمان رکھتے اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر اور شک میں مبتلا ہیں ان کے دل تو وہ شک میں ڈانواں ڈول ہیں“۔

قولہ تعالیٰ: لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی وہ بیٹھنے کے بارے میں اجازت نہیں مانگیں گے اور نہ خروج کے بارے میں، بلکہ جب آپ انہیں کسی شے کے بارے حکم دیں گے تو وہ فوراً اسے بجا لائیں گے، تو گویا اس وقت بغیر عذر کے اجازت مانگنا نفاق کی علامات میں سے تھا۔ اسی لیے فرمایا: اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اسے اس آیت نے منسوخ کیا ہے جو سورۃ النور میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ تا قولہ

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۲﴾ (النور)۔

اَنْ یُّجَاهِدُوْا یہ فی کو مضمر کرنے کے سبب محل نصب میں ہے۔ یہ زجاج سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر عبارت یہ ہے کراھیۃ ان یجاھدوا (جہاد کرنے کو ناپسند کرتے ہوئے) جیسا کہ یہ ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (النساء: 176) صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام تا کہ گمراہ نہ ہو جاؤ) وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ اور ان کے دلوں نے دین میں شک کیا ہے۔ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ یعنی وہ اپنے شک میں ہی جا رہے ہیں اور لوٹ رہے ہیں (یعنی ڈانواں ڈول ہیں)

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اگر انہوں نے ارادہ کیا ہوتا (جہاد پر) نکلنے کا انہوں نے تیار کیا ہوتا اس کے لیے کچھ سامان لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑے ہونے کو اس لیے پست ہمت کر دیا اور کہہ دیا گیا تم بیٹھے رہو بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً یعنی اگر انہوں نے جہاد کا ارادہ کیا ہوتا تو وہ سامان سفر ضرور تیار کرتے۔ پس ان کا تیاری کو ترک کرنا ہی ان کے پیچھے رہنے کے ارادہ پر دلیل ہے۔

وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ لیکن ان کے آپ کے ساتھ نکلنے کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا۔ فَثَبَّطَهُمْ اس لیے اس نے انہیں آپ سے روک دیا اور انہیں رسوا کر دیا، کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا: اگر آپ نے ہمیں بیٹھے رہنے کی اجازت نہ دی تو ہم فساد برپا کریں گے اور ہم مومنین کے خلاف (لوگوں کو) اکسائیں گے، برانگیختہ کریں گے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کے بعد اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو بجز فساد کے تم میں کچھ اضافہ نہ کرتے۔ وَقِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ یہ اس قول میں سے ہے جو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول میں سے ہے۔ اور یہی وہ اجازت ہے جو آپ نے انہیں دی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

کہا گیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غضب کی حالت میں انہیں یہ فرمایا اور انہوں نے اس کے ظاہر الفاظ کو پکڑ لیا اور کہنے لگے: تحقیق آپ نے ہمیں اجازت عطا فرما دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خذلان اور رسوائی سے عبارت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں بیٹھے رہنے کا تصور ڈال دیا۔ اور مَعَ الْقٰعِدِیْنَ کا معنی ہے یعنی ان لوگوں کے ساتھ جو تکلیف زدہ، اندھے، اپاہج، عورتیں اور بچے ہیں تم بیٹھے رہو۔

لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِیْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾

"اگر نکلتے تمہارے (لشکر) میں تو نہ زیادہ کرتے تم میں بجز فساد کے اور دوڑ دھوپ کرکے تمہارے درمیان فتنہ پردازی کرتے۔ اور تم میں ان کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو"۔

قولہ تعالیٰ: لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا یہ مومنوں کو تسلی دی جا رہی ہے اس بارے میں کہ منافق ان سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور الخبال سے مراد فساد برپا کرنا، چغل خوری کرنا، اختلاف پیدا کرنا اور جھوٹی خبریں اڑانا ہے۔ اور یہ استثنا منقطع ہے، ای مازادوکم قوۃ ولکن طلبوا الخبال (یعنی وہ تمہاری قوت اور طاقت میں اضافہ نہ کرتے بلکہ وہ فساد اور اختلاف پیدا کرتے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ تمہارے لیے اس میں اضافہ نہ کرتے سوائے فساد کے جس بارے میں وہ رائے کے اعتبار سے ڈانواں ڈول ہیں۔ تو اس صورت میں یہ استثنا منقطع نہ ہوگا۔ لا یزید ونکم فیما یترددون (فیہ) من الرأی إلا خبالا۔

قولہ تعالیٰ: وَلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ اس کا معنی ہے کہ وہ بڑی تگ و دو اور محنت کے ساتھ تمہارے درمیان فساد برپا کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ راجز نے کہا ہے:

یا لیتنی فیہا جَذَع أخُبُّ فیہا وأَضَعْ

کہا جاتا ہے: وَضَعَ البعیر جب اونٹ دوڑنے لگے یضع وضعا وضوعا جب چال زیادہ تیز ہو۔ اور أوضعتہ اس کا معنی ہے میں نے اسے دوڑنے پر ابھارا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الایضاع سے مراد ایسی چال ہے جو دوڑ کی چال کی مثل ہو۔ اور الخلل کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان شگاف کا ہونا، اس کی جمع الخلال ہے، مراد وہ شگاف ہیں جو صفوں کے درمیان ہوتے ہیں، یعنی وہ فساد برپا کرکے اور چغل خوری کے ذریعے تمہارے درمیان خلل اور دراڑیں ڈالنے کی کوشش کرتے۔ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ یہ مفعول ثانی ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ تمہارے لیے فتنہ تلاش کرتے، یعنی فساد برپا کرکے اور (فساد پر) اکسا کر۔ اور کہا جاتا ہے: أبغیتہ کذا میں نے اس کی طلب اور تلاش میں اس کی مدد کی اور بغیتہ کذا میں نے اسے اس کے لیے تلاش کیا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے۔

وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ اور تم میں ان کے جاسوس ہیں جو ان کی طرف تمہاری خبریں پہنچاتے ہیں۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور تم میں وہ لوگ ہیں جو ان کی بات قبول کرتے ہیں اور ان کی اطاعت و پیروی کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: پہلا قول زیادہ اولیٰ ہے، کیونکہ دونوں معنوں میں سے غالب معنی یہ ہے کہ سماع کا معنی ہے وہ کلام کو سنتا ہے۔ اور اسی کی مثل سماعون للکذب بھی ہے اور دوسرا قول اس میں فقط سامع کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ قائل۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸

"(اے حبیب!) وہ کوشاں رہے فتنہ انگیزی میں پہلے بھی اور الٹ پلٹ کرتے تھے آپ کے لیے تجویزیں یہاں تک کہ آ گیا حق اور غالب ہوا اللہ کا حکم اور وہ ناخوش تھے"۔

قولہ تعالیٰ: لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ یعنی انہوں نے فساد برپا کرنے اور اختلاف پیدا کرنے کی کوشش اور تگ و دو کی اس سے پہلے کہ ان کا معاملہ ظاہر ہو اور اس کے بارے وحی نازل ہو جسے انہوں نے مخفی اور پوشیدہ رکھا اور اس کے بارے جو وہ عنقریب کریں گے۔ ابن جریج نے کہا ہے: مراد منافقین کے بارہ آدمی ہیں، وہ عقبہ کی رات ثنیۃ الوداع پر ٹھہرے تاکہ (نعوذ باللہ) وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ یعنی جو دین آپ لے کر آئے ہیں اس کو باطل کرنے کے بارے میں اپنی آراء اور تجاویز کو بدلتے رہتے تھے اور گھماتے رہتے تھے

حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ یعنی حق آ گیا اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو گیا۔ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (اور وہ ناخوش تھے)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰

''اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: اجازت دیجئے مجھے (کہ گھر ٹھہرا رہوں) اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے، خبردار فتنہ میں تو وہ گر چکے ہیں۔ اور بے شک جہنم گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔ پہنچے آپ کو کچھ بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے آپ کو کوئی مصیبت تو کہیں گے کہ ہم نے درست کر لیا تھا اپنا کام پہلے ہی اور لوٹتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ یہ أذن یأذن سے ہے۔ اور جب امر بنایا گیا تو اس میں ہمزہ مکسور زائد کیا گیا اور اس کے بعد ایک ہمزہ ہے جو فعل کا فاکلمہ ہے اور دو ہمزے جمع نہیں ہو سکتے۔ پس دوسرے کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدل دیا گیا تو تو نے ایذن کہا۔ اور جب یہ وصل کلام میں ہو تو دو ہمزوں کے جمع ہونے کی علت ساقط اور زائل ہو جاتی ہے چنانچہ وہ یا پھر ہمزہ ہوئی۔ اور تو نے یہ پڑھا: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ۔

ورش نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے: ومنهم من يقول أوذن لي انہوں نے ہمزہ کو مخفف کیا ہے (یعنی اس کا ماقبل لام مضموم ہونے کی وجہ سے اسے واؤ سے بدل دیا ہے) نحاس نے کہا ہے: کہا جاتا ہے ایذن لفلان ثم ایذن له پہلے اور دوسرے کے ہجے لکھنے میں ذال سے پہلے الف اور یا کے ساتھ ایک ہیں۔ اور اگر تو کہے: ایذن لفلان و أذن لغيره اس میں دوسرا بغیر یا کے ہے اور اسی طرح فاکلمہ بھی ہے۔ اور ثم اور واؤ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ثم پر وقف کیا جاتا ہے اور کلام منفصل ہو جاتی ہے اور واؤ اور فا ان دونوں پر وقف نہیں کیا جاتا اور نہ یہ دونوں جدا ہو سکتے ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو بنی مسلمہ کے بھائی جد بن قیس کو فرمایا: ''اے جد! کیا تیرے لیے بنی الاصفر کی اونٹنیوں میں رغبت ہے تو ان سے لونڈیاں اور خدمت گار غلام بھی پالے گا''۔ تو جد نے کہا: میری قوم جانتی ہے کہ میں عورتوں کا دلدادہ ہوں اور بلاشبہ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے بنی الاصفر کو دیکھ لیا تو پھر میں ان سے صبر نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے آپ مجھے آزمائش اور فتنہ میں نہ ڈالیے اور مجھے گھر پر ہی بیٹھے رہنے کی اجازت عطا فرما دیجئے اور میں آپ کے

ساتھ مالی تعاون کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے اعراض فرمالیا اور فرمایا: ''تیرے لیے اجازت ہے''۔ تب یہ آیت نازل ہوئی، یعنی آپ مجھے ان کے چہروں کی چمک اور خوبصورتی کے ساتھ فتنہ میں نہ ڈالیے۔ اور اس کا سبب نفاق کے سوا اور کچھ نہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: اصفر حبشہ میں رہنے والا ایک آدمی تھا اس کی بیٹیاں تھیں ان کے وقت میں ان سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا اور اس کی رہائش بلاد روم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہیں یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ حبشہ والے روم پر غالب آگئے اور ان کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں پس انہوں نے روم کی سفیدی اور حبشہ کی سیاہی اپنے اندر سمولی نتیجۃً وہ سیاہی مائل سرخ رنگ کی ہوگئیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن اسحاق کے قول میں فتور اور کمزوری ہے۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم جہاد کرو تم بنات اصفر کو غنیمت میں پاؤ گے''۔ تو جد نے آپ کو کہا: آپ ہمیں اجازت عطا فرمادیجئے اور عورتوں کے ساتھ ہمیں فتنہ میں مبتلا نہ کیجئے۔ یہ (قول) پہلے کے سوا اور سے نکالا گیا ہے اور یہ نفاق اور عداوت کے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم ﷺ نے بنی سلمہ کو کہا ..... اور جد بن قیس ان میں سے تھا: ''اے بنی سلمہ! تمہارا سردار کون ہے؟'' انہوں نے کہا: جد بن قیس، مگر وہ بخیل اور بزدل ہے۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''کون سا عیب ہے جو بخل سے بڑھ کر قبیح ہو بلکہ تمہارا سردار خوبرو نوجوان بشر بن براء بن معرور ہے''۔ پس حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں فرمایا:

و سوّد بشر بن البراء لجوده　　وحقّ لبشر بن البراء أن يُسَوَّدَا

إذا ما أتاه الوفد أذهب ماله　　وقال خذوه إننى عائد غدا

أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا یعنی وہ گناہ اور معصیت میں واقع ہو چکے۔ اور وہ نفاق اور حضور نبی مکرم ﷺ سے پیچھے رہنا ہے۔

وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكٰفِرِينَ یعنی بلاشبہ ان کا سفر جہنم کی آگ کی طرف ہے اور وہ انہیں چاروں طرف سے گھیر لے گی۔

قولہ تعالیٰ: إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ یہ شرط و جزا ہے اور اسی طرح وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا اس پر معطوف ہے۔ اور الحسنة سے مراد غنیمت اور کامیابی ہے۔ اور المصيبة سے مراد شکست اور پسپائی ہے۔ اور ان کے اس قول: أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے ہم نے اپنے نفسوں کے بارے احتیاط برتی ہے اور ہم نے انتہائی حزم و احتیاط کو لازم پکڑا ہے لہٰذا ہم قتال کی طرف نہیں نکلے۔ وَيَتَوَلَّوْا اور وہ ایمان سے پیٹھ پھر لیتے ہیں۔ وَّهُمْ فَرِحُونَ درآنحالیکہ وہ اس پر اتراتے اور اظہار فخر کرتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

''آپ (ﷺ) فرمایئے ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں کوئی تکلیف بجز اس کے جو لکھ دی ہے اللہ نے ہمارے لیے وہی ہمارا حامی و ناصر ہے اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے مومنوں کو''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّنْ يُّصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جس کے بارے اس نے ہمیں اپنی کتاب میں خبر دی ہے کہ میں کون ہوں یا تو ہم کامیاب ہوں گے پس

کامیابی و کامرانی ہمارے لیے اچھی ہوگی اور یا ہم شہید کر دیئے جائیں گے تو شہادت ہمارے لیے بہت عظیم نیکی اور سعادت ہوگی، چنانچہ معنی یہ ہے ہر شے قضا و قدر کے مطابق ہے۔ سورۂ اعراف میں پہلے یہ گزر چکا ہے کہ علم، قدر اور کتاب سب برابر اور یکساں ہیں۔ هُوَ مَوْلٰىنَا یعنی وہ ہمارا حامی اور ناصر ہے۔ اور توکل سے مراد اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور جمہور کی قراءت میں یصیبنا، لن کے سبب منصوب ہے۔ ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ بعض عرب اس کے ساتھ جزم دیتے ہیں۔ اور طلحہ بن مصرف نے هل یصیبنا پڑھا ہے۔ اور رے کے قاضی اعین کے بارے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَّآ نون مشددہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ غلطی ہے، کیونکہ نون کے ساتھ اسے مؤکد نہیں کیا جاتا جو خبر ہو اور اگر یہ طلحہ کی قراءت میں ہوتا تو جائز ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ (الحج) (آیا دور کر دیا ہے اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو)(1)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

"فرمایئے کیا تم منتظر ہو ہمارے متعلق (کہ ہم مارے جائیں، یہ مرنا نہیں) مگر ایک بھلائی ان دو بھلائیوں سے (جن کے ہم خواہاں ہیں) اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے لیے کہ پہنچائے تمہیں اللہ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ کوفی لام کو تا میں ادغام کرتے ہیں، پس جہاں تک لام المعرفہ کا تعلق ہے تو اس میں ادغام کے سوا کچھ جائز نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: التائبون کیونکہ ان (عربوں) کے کلام میں لام معرفۃ کا استعمال کثیر ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: قل تعالوا میں ادغام جائز نہیں، کیونکہ اس میں قل معتل ہے، لہٰذا اس میں دو تعلیلیں جمع نہیں ہو سکتیں اور التربص کا معنی انتظار کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے: تربص بالطعام یعنی تو اناج کا انتظار کر اس کے مہنگا ہونے کے وقت تک۔ اور الحسنی، الاحسن کی تانیث ہے۔ اور حسنیین کا واحد حسنیٰ ہے اور جمع الحسن ہے۔ اور اسے فقط معرف باللام بولنا جائز ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا: رأیت امرأۃ حسنی، اور الحسنیین سے مراد غنیمت اور شہادت ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ سے منقول ہے۔ اس میں لفظ استفہام موجود ہے اور وہ زجر و توبیخ کے معنی کے لیے ہے۔ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ یعنی اللہ تمہیں اپنے پاس سے ایسی سزا اور عذاب دے جو تمہیں ہلاک و تباہ کر دے، جیسا کہ اس نے تم سے پہلے امم ماضیہ کو پہنچایا۔ اَوْ بِاَيْدِيْنَا یعنی وہ ہمیں تمہارے قتال کے بارے میں اجازت عطا فرما دے۔ فَتَرَبَّصُوْٓا یہ تہدید (جھڑک) اور وعید ہے یعنی تم شیطان کے وعدوں کا انتظار کرو بے شک ہم تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے منتظر ہیں۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

"فرمایئے خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا تم سے، بے شک تم ایک نافرمان قوم تھے"۔

1۔ اعراب القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 219

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت جد بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جب اس نے یہ کہا: مجھے گھر بیٹھے رہنے کی اجازت عطا فرما دیجئے اور یہ میرا مال ہے میں اس کے ساتھ آپ کی اعانت کروں گا۔ اور اَنْفِقُوْا کا لفظ امر ہے اور اس کا معنی شرط اور جزا ہے۔ عرب اسی طرح اس معنی میں استعمال کرتے ہیں، وہ او کے ساتھ لاتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أسيئی بنا أو أحسنی لا ملومۃٌ لدینا ولا مَقْلِيَّةٌ إن تَقَلَّتِ

اور اس کا معنی ہے اِن أساتِ أو أحسنتِ فنحن علی ما تعرفین (اگر تو نے گناہ کیا یا نیکی کی پس ہم اسی حال پر ہیں جس پر تو جانتی ہیں) اور آیت کا معنی ہے: إن أنفقتم طائعین أو مکرھین فلن یقبل منکم (اگر تم خرچ کرو گے خوشی سے یا ناخوشی سے وہ ہرگز تم سے قبول نہیں کیا جائے گا) پھر اللہ تعالیٰ نے وضاحت بیان فرمائی کہ ان سے کیوں نہیں قبول کیا جائے گا؟ تو ارشاد فرمایا: وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ (اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ) پس اس بارے میں واضح ترین دلیل یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ اس بنا پر ہے کہ کافر کے افعال جب نیکی اور خیر کے ہوں مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا اور مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ ان پر ثواب نہیں دیا جائے گا اور نہ آخرت میں اسے ان سے کوئی نفع حاصل ہوگا، مگر یہ کہ دنیا میں ان کے عوض اسے رزق اور نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے آپ فرماتی ہیں: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا، تو کیا وہ اسے کوئی نفع دے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ اسے نفع نہیں دے گا، بے شک اس نے ایک دن بھی نہیں کہا: اے میرے رب! قیامت کے دن میرے گناہوں کی مغفرت فرما دے"۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ کسی مومن پر ظلم نہیں کرے گا اس کی نیکی کا اجر اسے دنیا میں بھی عطا فرمایا جائے گا اور آخرت میں بھی اس کے بدلے اسے جزا دی جائے گی۔ اور رہا کافر تو دنیا میں اس نے جو نیک اعمال کیے ان کے بدلے دنیا میں اسے اجر عطا کیا جاتا ہے مگر جب وہ آخرت میں جا پہنچے گا تو اس کے لیے کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے" اور یہ نص ہے۔

پھر کہا گیا ہے: کیا اس سچے وعدہ کے حکم کے مطابق ضروری ہے کہ وہ کافر کو عطا کرے اور دنیا میں اس کی نیکیوں کا بدلہ اسے دے یا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مقید ہے جس کا ذکر اس ارشاد میں کیا گیا ہے: عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء: 18) (ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں)۔ دونوں قولوں میں سے یہی صحیح ہے، واللہ اعلم۔

کافر سے صادر ہونے والے عمل کو نیکی کا نام دینا بلاشبہ یہ کافر کے ظن اور گمان کے مطابق ہے ورنہ اس سے قربت کا حاصل ہونا صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ شرط جو اسے صحیح قرار دیتی ہے وہ موجود نہیں ہے اور وہ ایمان ہے۔ یا پھر اسے حسنہ (نیکی) کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہ صورۃً اور ظاہراً مومن کی نیکی کے مشابہ ہوتی ہے اس میں بھی دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ پس اگر کہا جائے: امام مسلم نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا ان امور کے بارے کیا خیال ہے جو عبادت، صدقہ، غلام کو آزاد کرنے یا صلہ رحمی وغیرہ میں زمانہ جاہلیت میں کرتا تھا کیا ان کا اجر ہوگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان پر ہی اسلام لایا ہے جو تو نے ماضی میں خیر کے اعمال کیے''۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: أسلمتَ علی ما أسلفتَ من خیر اس کا ظاہر اصول کے خلاف ہے، کیونکہ کافر کو اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس کی طاعت و عبادت پر ثواب ہو جائے، کیونکہ قرب حاصل کرنے والے کے لیے شرط ہے کہ وہ اسے پہچانتا ہو جس کے وہ قریب ہو رہا ہے، پس جب شرط معدوم ہوگئی تو مشروط کے صحیح ہونے کی بھی نفی ہوگئی۔ پس حدیث میں معنی یہ ہے: بے شک تو نے جاہلیت میں حسین و جمیل مزاج اور طبیعت بنائی تو اسی اچھی اور خوبصورت عادت نے تجھے اسلام میں پہنچا دیا۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت حکیم رضی اللہ عنہ ایک سو بیس برس تک زندہ رہے، ساٹھ سال اسلام میں اور ساٹھ سال جاہلیت کی حالت میں رہے۔ پس آپ نے جاہلیت میں ایک سو غلام آزاد کیے اور سو اونٹوں پر سوار کیا؟ اور اسی طرح آپ نے اسلام میں بھی کیا اور یہ بالکل واضح ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بعید نہیں ہے کہ وہ اسے اس کے اس فعل پر ثواب عطا فرمائے جو اس نے اسلام کے سبب کیا، جیسا کہ وہ اس سے ان گناہوں کو ساقط کر دیتا ہے جن کا ارتکاب اس نے حالت کفر میں کیا۔ اور بلاشبہ اسے اجر و ثواب نہیں دیا جائے گا جو نہ اسلام لایا اور نہ اس نے توبہ کی اور حالت کفر میں ہی مر گیا۔ اور یہ حدیث کا ظاہراً معنی ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نیکی اور خیر کا جو عمل وہ کرتا ہے اس پر ثواب نہ ہونے کا سبب ایمان کی شرط کا نہ پایا جانا نہیں ہے، پھر وہ اسلام لایا اور مسلمان ہونے کی حالت میں ہی فوت ہوا شرط عقلی کے مطابق وہ تبدیل نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ اس کا عمل ضائع کر دے جب کہ اس کا اسلام حسین ہو۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی جود و عطا اور کرم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کا عمل ضائع نہ کرے جب کہ اس کا اسلام حسین اور خوبصورت ہو) حربی نے حدیث کی اس معنی پر تاویل کی ہے اور کہا ہے: أسلمت علی ما اسلفت یعنی تو نے جو پہلے نیکی اور خیر کے اعمال کیے ہیں پس وہ تیرے لیے ہی ہیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أسلمت علی ألف درھم تو اسلام لایا ہزار درہم کی شرط پر یعنی اس شرط پر کہ اس نے اپنے لیے انہیں محفوظ کر لیا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ پس اگر کہا جائے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ابو طالب آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کی مدد و نصرت کرتے تھے، تو کیا اس کا انہیں کوئی نفع اور فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، میں نے انہیں آگ کی شدت اور سختی میں پایا تو میں نے انہیں تھوڑی آگ کی طرف نکال دیا''۔ آپ کو عرض کی گئی: بعید نہیں ہے کہ وہ کافر سے اس کے عمل خیر کے بدلے عذاب میں

تخفیف کر دے، لیکن شفاعت ملنے اور حاصل ہونے کے ساتھ جیسا کہ ابو طالب کے بارے میں آیا ہے، لیکن رہا اس کے بغیر تو قرآن کریم نے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيۡنَ ۞ (المدثر) (پس انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت) اور کافروں کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ ۙ وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ ۞ (الشعراء) (تو (آج) نہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی اور نہ کوئی غم خوار دوست)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے چچا حضرت ابو طالب کا ذکر کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا: "شاید قیامت کے دن میری شفاعت انہیں فائدہ اور نفع دے گی پس انہیں تھوڑی سی آگ میں رکھا جائے گا جو ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس سے ان کا دماغ کھول جائے گا"۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: "اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے درک اسفل میں ہوتے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ اس میں فاسقین سے مراد کافرین ہیں۔

وَمَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوۡلِهٖ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمۡ كُسَالٰى وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ ۞

"اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کیے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور نہیں آتے نماز ادا کرنے کے لیے مگر سست اور نہیں خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ اس میں پہلا اَنۡ محل نصب میں ہے اور دوسرا محل رفع میں ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے: اور انہیں نہیں منع کیا ہے کہ ان کے اخراجات ان سے قبول کیے جائیں سوائے ان کے کفر کے۔ اور کوفیوں نے اَن یقبل منھم یا کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ نفقات اور انفاق دونوں ایک ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَاۡتُوۡنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمۡ كُسَالٰى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اگر وہ جماعت کے ساتھ ہو تو نماز پڑھے اور اگر منفرد ہو تو نماز نہ پڑھے اور یہی وہ ہے جو نماز پر کسی اجر و ثواب کی امید نہیں رکھتا اور وہ اسے ترک کرنے میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرتا نہیں ہے، پس نفاق بالیقین عبادت میں سستی کا وارث بنا دیتا ہے۔ اس بارے میں تفصیلی گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے اور وہاں ہم نے حضرت علاء کی حدیث مکمل طور پر ذکر کر دی ہے۔ والحمد للہ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ کیونکہ وہ اسے ایک جرمانہ اور چٹی شمار کرتے ہیں۔ اور اسے غنیمت جان کر روک کر رکھتے ہیں۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے تو وہ قبول نہیں اور نہ ہی کوئی اس پر اجر و ثواب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝

''سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں''۔

یعنی آپ اسے اچھا نہ سمجھیں جو ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اور نہ آپ اس کی طرف مائل ہوں کیونکہ وہ استدراج ہے۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے زکوٰۃ نکالنے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ اور یہ علامہ طبری کی پسند ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اور معنی یہ ہے پس دنیوی زندگی میں ان کے مال اور ان کی اولاد تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں۔ یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ انہیں آخرت میں ان کے ساتھ عذاب دے۔ اور یہ اکثر اہل العربیہ کا قول ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ انہیں ان تمام میں تگ و دو اور مشقت کرنے کے سبب عذاب دے۔ اور اس تاویل اور حضرت حسن کے قول کی بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ اور یہ حسن ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس ان کے مال تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں اور نہ ان کی اولاد یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ انہیں ان کے ساتھ دنیا میں عذاب دے کیونکہ وہ منافق ہیں۔ چونکہ وہ ناخوش ہو کر خرچ کرتے ہیں پس وہ ان کے سبب عذاب دیئے جائیں گے جو وہ خرچ کرتے ہیں (1)۔ وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ یہ اس بارے میں نص ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ مریں اس حال میں کہ وہ کافر ہوں۔ اس کے بارے پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ بیان فرمایا کہ منافقین کے اخلاف میں سے یہ قسم اٹھانا ہے کہ وہ مومن ہیں اس کی نظیر یہ آیت ہے: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ الآیہ (المنافقون: 1) ((اے نبی مکرم!) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں) الفرق کا معنی خوف ہے، یعنی وہ ڈرتے ہیں وہ نظریہ ظاہر کرنے سے جس پر وہ ہیں کہ وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝

''اگر مل جائے انہیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو (دیکھیے گا) وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اسی طرح اس پر وقف ہے۔ اور لکھنے میں دو الف ہیں: پہلا ہمزہ ہے اور دوسرا تنوین کے

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 3، صفحہ 218

عوض ہے۔ اور اسی طرح رایت جزا ہے۔ اور ملجا کا معنی قلعہ ہے۔ یہ حضرت قتادہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی پناہ گاہ ہے۔ اور یہ دونوں معنی برابر ہیں۔ کہا جاتا ہے: لجات إلیہ لجاء و ملجا اور التجات الیہ (میں نے اسی کی طرف پناہ لی) یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اور وہ جگہ بھی لجا و ملجا کہلاتی ہے۔ اور التلجئۃ کا معنی اکراہ، مجبور کرنا ہے۔ اور ألجاتہ إلی الشئ کا معنی ہے (میں نے اسے اس کی طرف مجبور کر دیا) اور ألجات أمری إلی اللہ میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ اور عمرو بن لجا تیمی شاعر ہے اور یہ جوہری سے منقول ہے۔

أَوْ مَغٰرٰتٍ یہ مغارۃ کی جمع ہے اور یہ غار یغیر سے ماخوذ ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ أغار یغیر سے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الحمد للہ مُمسانا و مُصبحنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: المغارات سے مراد غاریں اور تہہ خانے ہیں اور یہ وہ جگہیں ہیں جن میں چھپا جا سکتا ہے۔ اور اسی سے غار الماء اور غارت العین (پانی نیچے اتر گیا) ہے۔

أَوْ مُدَّخَلًا یہ مفتعل کے وزن پر ہے اور دخول سے بنایا گیا ہے، مراد ایسا راستہ ہے جس میں داخل ہونے کے ساتھ ہم چھپ جاتے ہیں۔ اور لفظ مختلف ہونے کی وجہ سے اس کا اعادہ کیا (کیونکہ مفہوم تو دونوں لفظوں کا ایک ہے) نحاس نے کہا ہے: اس میں اصل مدتخل ہے، تا کو دال سے بدلا گیا ہے۔ کیونکہ دال حروف مجہورہ میں سے ہے اور تا مہموسہ میں سے اور یہ دونوں ایک مخرج سے ادا ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں اصل متدخل بروزن متفعل ہے، جیسا کہ حضرت ابی کی قراءت میں ہے: أو متدخلا اور اس کا معنی ہے دخول بعد دخول (یکے بعد دیگرے داخل ہونا) یعنی وہ قوم جوان کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔ مہدوی نے کہا ہے: متدخلا یہ تدخل سے ہے جیسے تفعل جب کوئی دخول میں تکلف کرے۔ اور حضرت ابی سے یہ بھی مروی ہے: مندخلا یہ اندخل سے ہے اور یہ شاذ ہے، کیونکہ یہ سیبویہ اور اس کے اصحاب کے نزدیک ثلاثی غیر متعدی ہے۔ اور حسن، ابن ابی اسحاق اور ابن محیصن نے أو مَدْخلا میم کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: او مدخلا میم کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ پہلا دخل یدخل سے ہے اور دوسرا أدخل یدخل سے۔ اسی طرح مصدر، ظرف مکان اور ظرف زمان بھی ہیں جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

مُغَارَ ابنِ همامٍ علی حَیِّ خَثْعَمَا

اور حضرت قتادہ، عیسیٰ اور اعمش رحمۃ اللہ علیہم سے **أَوْ مُدَّخَلًا** دال اور خا کی تشدید کے ساتھ مروی ہے(1)۔ اور جمہور نے صرف دال کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ مکان جس میں وہ اپنے نفسوں کو داخل کر لیتے ہیں۔ پس یہ چھ قراءتیں ہیں۔ **لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ** یعنی وہ اس کی طرف لوٹ جائیں۔ **وَهُمْ يَجْمَحُونَ** یعنی وہ تیزی کرتے ہیں کوئی شے ان کے چہروں کو واپس نہیں لوٹا سکتی۔ یہ جمح الفرس سے ہے جب لگام گھوڑے کو نہ لوٹا سکے۔ شاعر نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 46

سَبُوحًا جَمُوحًا واحضارها كَمُعْمِعَة السَّعَف المُوقَدِ

اور اس کا معنی ہے: اگر وہ ان مذکورہ چیزوں میں سے کسی کو پالیں تو وہ مسلمانوں سے بھاگتے ہوئے تیزی کے ساتھ اس کی طرف پھر جائیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم) کے بارے میں سو اگر انہیں دیا جائے ان سے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں نہ دیا جائے ان سے تو اس وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ یعنی ان میں سے بعض آپ پر طعن کرتے ہیں، یہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حسن نے کہا ہے: وہ آپ پر عیب لگاتے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ آپ کا امتحان لیتے ہیں اور آپ سے سوال کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اہل لغت کے نزدیک وہی قول ہے جو حضرت قتادہ اور حسن رحمہما اللہ کا قول ہے۔ کہا جاتا ہے: لمزہ یلمزہ جب وہ اس کو عیب لگائے۔ اور اللمز لغت میں وہ عیب ہے جو سرأ اور خفیہ طور پر لگایا جائے (1)۔ جوہری نے کہا ہے: اللمز کا معنی عیب ہے اور اس کا اصل معنی تو آنکھ وغیرہ کے ساتھ اشارہ کرنا ہے۔ اور لمزہ کا یَلْمِزُہ اور یَلْمُزُہ دونوں طرح (یعنی باب ضرب یضرب اور باب نصر ینصر) آتا ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم کے بارے میں)

اور رجل لماز و لمزۃ یعنی بہت زیادہ عیب لگانے والا آدمی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: لمزہ یلمزہ جب کوئی کسی کو دور ہٹائے اور اسے مارے۔ اور الھمز بھی اللمز کی طرح ہی ہے۔ اور الھامز اور الھماز بھی کثرت سے عیب لگانے والے کو کہا جاتا ہے اور الھمزۃ بھی اسی کی مثل ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل ھمزۃ اور امراۃ ھمزۃ بھی ہے۔ اور ھمزہ کا معنی ہے اس نے اسے دور کیا اور اسے مارا۔ پھر یہ کہا گیا ہے کہ اللمز وہ عیب ہے جو چہرے پر اور سامنے لگایا جائے، اور الھمز جو پیٹھ کے پیچھے لگایا جائے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک قوم کے بارے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقات کی تقسیم کے بارے طعنہ زنی کی۔ اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ فقراء ہیں تاکہ آپ انہیں عطا فرمائیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال تقسیم فرما رہے تھے کہ اچانک خوارج کا سردار بلکہ اصل حرقوص بن زہیر آپ کے پاس آگیا اور اس کو ذوالخویصرۃ تمیمی کہا جاتا ہے، تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم انصاف اور عدل کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ہلاکت ہو اور کون عدل کرے گا جب میں عدل نہ کروں''۔

تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی معنی کے مطابق ایک صحیح حدیث ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اور اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت عطا فرمایئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ تو

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 3، صفحہ 220

آپ ﷺ نے فرمایا: ''معاذ اللہ لوگ باتیں کریں گے کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہوں بے شک یہ اور اس کے ساتھی قرآن کریم پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے تجاوز نہیں کرے گا وہ اس سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر اپنے نشانہ سے پار نکل جاتا ہے'' (1)۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿59﴾

''اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ خوش ہو جاتے اس سے جو دیا تھا انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ۔ عطا فرمائے گا ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اس کا رسول، ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت کرنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ، لو کا جواب محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہے لکان خیرا لھم تو وہ یقیناً ان کے لیے اچھا ہوتا۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿60﴾

''زکوٰۃ تو صرف ان کے لیے ہے جو فقیر، مسکین اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والے ہیں اور جن کی دلداری مقصود ہے، نیز گردنوں کو آزاد کرانے اور مقروضوں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے، یہ سب فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے''۔

اس میں تیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بعض کی نسبت بعض لوگوں کو وافر مال عطا فرمایا ہے اور یہ اس کی جانب سے ان پر بہت بڑا انعام اور احسان ہے اور ان پر بطور شکرانہ ایک خاص حصہ نکالنا لازم کر دیا ہے کہ وہ وہ حصہ اس کو ادا کریں جس کے پاس مال نہیں ہے۔ اور یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے نیابت ہے اس بارے میں جس کی ضمانت اس نے اپنے اس قول میں دی ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: 6) (اور نہیں کوئی جاندار زمین میں مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق) (2)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ یہ مصارف صدقات اور محل کی وضاحت ہے، تاکہ تو ان سے باہر نہ نکلے۔ پھر اختیار اور پسند تقسیم کرنے والے کے پاس ہے (یعنی ان میں سے جسے چاہے دے دے) یہ قول امام مالک، امام ابو حنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: السرج للدابۃ والباب للدار (زین گھوڑے کے لیے اور دروازہ گھر

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 11537

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 945

کے لیے ہے)۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں لام تملیک کے لیے ہے، جیسا کہ تیرے اس قول میں ہے: المال لزید و عمرو و بکر، تو ان تمام مذکورہ افراد کے درمیان مساوات اور برابری قائم کرنا لازم اور ضروری ہے۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا: یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی دو معین صنفوں کے لیے یا دو معین قوموں کے لیے وصیت کرے۔ اور انہوں نے انما کے لفظ سے استدلال کیا ہے کہ یہ آٹھوں اصناف پر صدقات کے موقوف ہونے کے بارے حصر کا تقاضا کرتا ہے اور انہوں نے اسے زیاد بن حارث صدائی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تقویت دی ہے انہوں نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ میری قوم کی طرف لشکر بھیجنے والے تھے تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کو روک لیجئے پس میں آپ کو ان کے اسلام لانے اور طاعت اختیار کرنے کے بارے میں یقین دلاتا ہوں، پھر میں نے اپنی قوم کی طرف لکھا تو انہوں نے اسلام اور طاعت کو اختیار کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا اخا صداء المطاع فی قومه (اے صدائی مطاع (جس کی اطاعت کی جاتی ہے) اپنی قوم میں) آپ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی: بل من الله علیهم وهداهم بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اور انہیں ہدایت عطا فرما دی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: پھر ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور وہ آپ سے صدقات کے بارے سوال کرنے لگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقات کے بارے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ راضی اور خوش ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے آٹھ اجزاء میں تقسیم کر دے پس اگر تو ان اجزاء والوں میں سے ہوا تو میں تجھے عطا کر دوں گا'' (1)۔ اسے ابوداؤد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ اور زین العابدین سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس مقدار کے بارے بتا دیا ہے جو زکوٰۃ میں سے دی جائے گی اور اس کے بارے جس کے ساتھ ان اصناف کی کفایت ہو سکے گی اور اسے ان تمام کا حق قرار دیا ہے، پس جس کسی نے انہیں اس سے روکا تو وہ ان کے لیے ان کے رزق کے بارے میں ظالم اور زیادتی کرنے والا ہے۔ اور ہمارے علماء نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ: 271) (اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لیے)

اور صدقہ جب قرآن کریم میں مطلق ذکر کیا جائے تو مراد فرض صدقہ ہوتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء پر لوٹا دوں''۔ اور یہ قرآن و سنت میں سے آٹھ اصناف میں سے کسی ایک کے ذکر کے بارے نص ہے (2)۔ اور حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔ اور تابعین کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آدمی زکوٰۃ اور صدقہ آٹھوں اصناف کو دے اور ان میں سے جس صنف کو بھی تو نے دے دیا تو وہ جائز ہے۔ منہال بن عمرو نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے قول باری تعالیٰ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ کے

1۔ سنن ابی داؤد، باب من یعطی من الصدقۃ، حدیث نمبر 1389، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 947

بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان اصناف کا ذکر کیا ہے تا کہ انہیں پہچان لیا جائے اور ان میں سے کسی صنف کو تو نے دے دیا تو وہ تیرے لیے جائز ہوگا۔

حضرت سعید ابن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ کے بارے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس صنف کو بھی تو نے صدقہ دے دیا وہ تیری طرف سے جائز ہے۔ اور یہی قول حسن اور ابراہیم رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کا بھی ہے۔ الکیا طبری نے کہا ہے: حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ اجماع صحابہ مراد لے رہے ہیں، کیونکہ ان کو ان میں سے کوئی مخالف معلوم نہیں جیسا کہ ابوعمر نے کہا ہے، واللہ اعلم۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ جسے ہم نے اپنے اور ان کے درمیان فیصل قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ امت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر ہر صنف کو اس کا حصہ عطا کر دیا جائے تو اس کی تعمیم واجب نہیں۔ پس اسی طرح اصناف کی تعمیم بھی اسی کی مثل ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ علماء لغت اور اہل فقہ نے فقیر اور مسکین کے درمیان فرق بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے لہٰذا اس کے بارے نو اقوال ہیں۔ پس یعقوب بن سکیت، قتبی اور یونس بن حبیب نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ فقیر، مسکین سے احسن اور بہتر حالت میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: فقیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس اتنا مال ہو جو اس کی بعض حاجات و ضروریات کو پورا کر سکتا ہو اور وہ انہیں ادا کر سکتا ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کوئی شے نہ ہو۔ اور انہوں نے راعی کے قول سے استدلال کیا ہے:

أما الفقير الذى كانت حَلُوبَتُه   وَفْقَ العِيَال فلم يُترك له سَبَدُ

فقیر وہ ہے جس کے پاس عیال کے مطابق دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری ہو اور اس کے لیے (ضرورت سے زائد) کچھ نہ چھوڑا جائے۔

اہل لغت اور حدیث میں سے ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے امام ابوحنیفہ اور قاضی عبدالوہاب ہیں۔ اور الوفق اس موافقت سے ہے جو دو چیزوں کے درمیان پائی جاتی ہے جیسا کہ التحام (دو چیزوں کا آپس میں جڑ جانا) ہے۔ کہا جاتا ہے: حلوبته وفق عياله یعنی اس کا دودھ ان کی کفایت اور ضرورت کے برابر ہے، اس سے فالتو اور زیادہ نہیں ہے۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور دوسروں نے اس کے برعکس کہا ہے، پس انہوں نے مسکین کو فقیر سے احسن اور بہتر حالت میں قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (الکہف: 79) (وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں)

پس اس میں خبر دی گئی ہے کہ ان کے لیے سمندر کی کشتیوں میں سے ایک کشتی ہے اور بسا اوقات یہ تمام مال کے اعتبار سے مساوی اور برابر ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے اس نظریہ کو اس حدیث سے تقویت دی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر سے پناہ مانگی (2) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے دعا میں یہ عرض کی: اللّٰھم أحيني مسكينا

1۔ احکام القرآن للکیا الطبری، جلد 3، صفحہ 206

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی الاستعاذۃ، حدیث نمبر 1320، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وأمتني مسكينا (اے اللہ! مجھے مسکین حالت میں زندہ رکھ اور مسکین حالت میں موت عطا فرما) پس اگر مسکین کی حالت فقیر کی حالت سے زیادہ کمزور اور بری ہو تو دونوں خبروں کے درمیان تناقض آجائے گا، کیونکہ یہ محال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقر سے پناہ مانگیں اور پھر اس کے بارے سوال اور التجا کریں جو حالت کے اعتبار سے اس سے برا اور کمزور ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی اور آپ کی روح اس حال میں قبض فرمائی کہ آپ کے پاس اس مال میں سے کچھ تھا جو اللہ تعالیٰ نے بطور فے آپ کو عطا فرمایا تھا، لیکن اس کے ساتھ جملہ ضروریات کی کفایت نہ ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے اپنی زرہ رہن رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا ہے: رہا راعی کا شعر تو اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس فی الحال دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری ہو۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ کلام عرب میں فقیر کا معنی یہ ہے کہ وہ مفلس جس کی پیٹھ سے شدت فقر و افلاس کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی نکال لی جائے پس اس سے زیادہ شدید اور سخت اور کوئی حال نہیں ہوتا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول کے ساتھ خبر دی ہے: لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ (البقرہ:273)

اور انہوں نے شاعر کے قول سے بھی استدلال کیا ہے:

لما رأى لُبَدُ النُّسورِ تطايرت رفعَ القوادمَ كالفقيرِ الأعزلِ

یعنی وہ اڑنے کی طاقت نہیں رکھتا پس وہ اس کی طرح ہو گیا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے اور وہ زمین کے ساتھ چپک جائے۔ اسی کی طرف اصمعی وغیرہ بھی گئے ہیں اور اسے امام طحاوی نے کوفیوں سے بیان کیا ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک اور آپ کے اکثر اصحاب کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دوسرا قول بھی ہے: وہ یہ کہ فقیر اور مسکین دونوں برابر ہیں، معنوی اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں اگرچہ اسم اور نام کے اعتبار سے وہ الگ الگ ہیں۔ اور یہی تیسرا قول ہے اور اسی کو ابن القاسم اور تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسکین فقیر کا غیر ہے اور یہ کہ یہ دونوں صنفیں ہیں، مگر ان دونوں میں سے ایک دوسری کی نسبت زیادہ حاجت مند ہے۔ پس اسی وجہ سے یہ اس کے قول کے قریب ہے جس نے دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ان کے قول میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ (الکہف:79) کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ وہ ان کے لیے اجرت پر لیا گیا ہو، جیسے کہا جاتا ہے: یہ فلاں کا گھر ہے، جب وہ اس میں رہ رہا ہو اگرچہ وہ ملکیت کسی اور کی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل نار کے وصف میں کہا ہے: وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ (الحج) (اور ان (کو مارنے) کے لیے گرز ہوں گے لوہے کے) پس اللہ تعالیٰ نے اس کی اضافت ان کی طرف کی۔ اور مزید ارشاد گرامی ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ (النساء:5) (اور نہ دے دو نادانوں کو اپنے مال)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من باع عبدا وله مال (جس نے غلام بیچا اور اس کا مال ہو) اور اس کا استعمال بہت زیادہ ہے کہ ایک شے کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے حالانکہ وہ اس کی نہیں ہوتی اور اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: بباب

الدار (گھر کا دروازہ) جل الدابۃ (جانور کی کل)۔ سرج الفرس (گھوڑے کی زین) اور اس کی مشابہ تمام مثالیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ انہیں رحمت اور مہربانی کی جہت پر مساکین کا نام دیا گیا ہو، جیسا کہ جس کو مصیبت اور تکلیف کے ساتھ آزمایا جائے یا جسے آزمائش اور تکلیف میں ڈال دیا جائے اسے مسکین کہا جاتا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: مساکین اھل النار (اہل جہنم میں سے مساکین) اور شاعر نے کہا ہے:

مساكين أهل الحب حتى قبورهم عليها تراب الذل بين المقابر

اہل محبت میں سے مساکین وہ ہیں کہ قبرستان کے درمیان ان کی قبور پر بھی ذلت کی مٹی ہوتی ہے۔ اور رہی وہ جو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد سے تاویل کی ہے: اللهم أحيني مسكينا، الحدیث اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، تو وہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ یہاں اس کا معنی یہ ہے: وہ تواضع اور انکساری جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اس میں نہ کوئی جبر ہو اور نہ رعونت و نخوت اور نہ اس میں بڑائی ہو اور نہ فخر اور نہ اس میں تکبر ہو اور نہ کوئی شر، ابو العتاہیہ نے کتنا خوب کہا ہے:

إذا أردت شريف القوم كلهم فانظر الى ملك فى زى مسكين

جب تو ساری قوم کے شریف اور سردار کا ارادہ کرے تو تو بادشاہ کی طرف مسکین کے لباس میں دیکھ۔

ذاك الذى عظمت فى الله رغبته وذاك يصلح للدنيا و للدين

یہی وہ ہے جس کی رغبت اور چاہت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عظیم ہے اور وہ دین و دنیا کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور وہ سوال کرنے والا نہ ہو، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کو ناپسند کیا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ نے اس سیاہ عورت کے بارے میں فرمایا جس نے آپ کے راستے سے ہٹنے سے انکار کر دیا: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ انتہائی سرکش اور متکبر ہے''۔ اور رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ (البقرہ:273) ((خیرات) ان فقیروں کے لیے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لیے) چلنے پھرنے کی زمین میں) تو یہ ان کے لیے کوئی شے ہونے کے مانع نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور جس طرف امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے اصحاب گئے ہیں کہ یہ دونوں برابر ہیں وہ اچھا ہے۔ اور اس کے قریب قریب ہے وہ قول جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سحنون کی کتاب میں کہا ہے۔ فرمایا: فقیر وہ محتاج ہے جو متعفف (بتکلف پاک دامن بننا) ہو اور مسکین وہ ہے جو مانگنے والا ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اور یہ زہری نے کہا ہے اور اسے ابن شعبان نے اختیار کیا ہے اور یہی چوتھا قول ہے۔ اور پانچواں قول وہ ہے جو محمد بن مسلمہ نے کہا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کی رہائش گاہ اور خادم ہو یہاں تک کہ جو اس کے نیچے اور اسفل ہے وہ اس کے لیے ہو اور مسکین وہ ہے جس کا کوئی مال نہ ہو۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول اس کے برعکس ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔ کسی آدمی نے آپ سے سوال کیا اور کہا: کیا ہم مہاجرین کے فقراء میں سے نہیں ہیں؟ تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: کیا تیری

1۔ الناسخ والمنسوخ للنحاس، جلد 2، صفحہ 443

بیوی ہے جس کے ساتھ تو رہتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا تیرا گھر ہے جس میں تو رہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا: پھر تو اغنیاء میں سے ہے۔ اس نے کہا: میرا ایک خادم بھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: پھر تو ملوک میں سے ہے۔ (یعنی تو بادشاہ ہے)۔ اور چھٹا قول یہ ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ نے فرمایا: فقراء مہاجرین میں سے ہیں اور مساکین ان اعراب میں سے ہیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ یہ ضحاک نے کہا ہے۔

اور ساتواں قول یہ ہے کہ مسکین وہ ہے جو عاجزی اور فروتنی اختیار کرتا ہے اگرچہ وہ سوال نہ بھی کرے۔ اور فقیر وہ ہے جو لے لیتا ہے اور شے کو سرا قبول کر لیتا ہے اور عاجزی کا اظہار نہیں کرتا۔ عبید اللہ بن حسن نے کہا ہے۔ اور آٹھواں قول جو کہ حضرت مجاہد، عکرمہ اور زہری رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ مساکین وہ ہیں جو گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اور فقراء سے مراد مسلمانوں کے فقراء ہیں۔ اور نانواں قول جو عکرمہ نے بھی کہا ہے وہ یہ ہے کہ فقراء سے مراد مسلمانوں کے فقراء ہیں اور مساکین سے مراد اہل کتاب کے فقراء ہیں، عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور یہ فقراء اور مساکین کے درمیان اختلاف کا فائدہ ہے، کیا یہ دونوں ایک صنف ہیں یا ایک سے زیادہ؟ اس کا اظہار اس میں ہوتا ہے جو کوئی اپنے ثلث مال کی فلاں اور فقراء اور مساکین کے لیے وصیت کرتا ہے۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک صنف ہیں انہوں نے کہا ہے: فلاں کے لیے ثلث کا نصف ہوگا اور فقراء و مساکین کے لیے ثلث کا دوسرا نصف ہوگا۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہ دو صنفیں ہیں ان کے مطابق ثلث ان تینوں کے درمیان تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ فقر کی اس حد میں علماء کا اختلاف ہے جس کے ساتھ لینا جائز ہوتا ہے۔ محققین اہل علم میں سے اکثر کے اجماع کے بعد..... کہ جس کا گھر اور خادم ہو وہ ان سے مستغنی نہ ہو تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے اور دینے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ اسے دے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اگر گھر اور خادم کی قیمت سے فالتو رقم اس قدر نہ ہو جس کا ان کے ہوتے ہوئے وہ محتاج اور ضرورت مند ہے تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نخعی اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس کے پاس بیس دینار یا دو سو درہم ہوں تو وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ پس انہوں نے نصاب کا اعتبار کیا ہے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء سے صدقہ وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء میں لوٹا دوں'' (1)۔ یہ بالکل واضح ہے۔ اور اسے مغیرہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوری، احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہم وغیر ہم نے کہا ہے: جس کے پاس پچاس درہم ہوں یا ان کی مقدار سونا ہو تو وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اور نہ ہی پچاس درہم سے زیادہ زکوٰۃ میں سے کسی کو دیئے جا سکتے ہیں مگر یہ کہ وہ مقروض ہو۔ یہ امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 959

سے روایت کیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے جس کے پاس پچاس درہم ہوں“ (1)۔ اس کی سند میں عبدالرحمن بن اسحاق ضعیف راوی ہے۔ اور اس سے روایت کرنے والا بکر بن خنیس بھی ضعیف ہے۔ اور اسے حکیم بن جبیر نے محمد بن عبدالرحمن بن یزید سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور پچاس درہم کا ذکر کیا ہے۔ اور حکیم بن جبیر ضعیف ہے اسے شعبہ وغیرہ نے ترک کر دیا ہے۔ یہ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابو عمر نے کہا ہے: یہ حدیث حکیم بن جبیر کے گرد گھومتی ہے اور وہ متروک راوی ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اس آدمی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے جس کے پاس پچاس درہم یا ان کی قیمت کا سونا ہو (2)۔ اسے دار قطنی نے ذکر کیا ہے۔ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس کے پاس چالیس درہم ہوں وہ زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اور اسے واقدی نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔

اور اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جس نے لوگوں سے مانگا اس حال میں کہ وہ غنی ہو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشیں لگی ہوں گی اور وہ چھیلا ہوا ہوگا“ (3)۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ اس کا غنا کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”چالیس درہم“۔ اور امام مالک کی حدیث میں ہے جو انہوں نے زید بن اسلم سے، انہوں نے عطا بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے جس نے اس حال میں مانگا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ ہو یا اس کے برابر (مال سونا وغیرہ) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار مانگا اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے“ (4)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت مشہور ہے اسے ان سے ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کیا اسے زکوٰۃ دی جائے گی جس کے پاس چالیس درہم ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ابو عمر نے بیان کیا ہے: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ آدمی ہو جو کمانے کی طاقت رکھتا ہو اور اچھی طرح تصرف کر سکتا ہو۔ اور دوسرا وہ ہو جو کمانے سے کمزور اور ضعیف ہو یا وہ عیال دار ہو۔ واللہ اعلم

اور امام شافعی اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جو کمانے کی اور کوئی پیشہ اپنانے کی قوت رکھتا ہو اس کے ساتھ ساتھ اس کا بدن قوی اور طاقتور ہو اور اچھی طرح تصرف پر قادر ہو یہاں تک کہ وہ اسے لوگوں سے غنی کر دے تو اس پر صدقہ حرام ہے۔ اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کی حدیث سے استدلال کیا ہے: ”کسی غنی کے لیے اور کسی طاقتور صحیح الاعضاء کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے“ (5)۔ اسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اور ابو داؤد، ترمذی اور دار قطنی نے اسے نقل کیا

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 121۔ سنن ابن داؤد، باب من یعطی من الصدقۃ، حدیث نمبر 1385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب من سئل عن ظھر غنی، حدیث نمبر 1829، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 122 3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 1385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231۔ ایضاً، حدیث نمبر 1392۔ ابن ماجہ، من سئل عن ظھر غنی، حدیث 1828، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صدقہ آیا پس لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک یہ کسی غنی کے لیے، کسی صحیح الاعضاء (یا تندرست) کے لیے اور کسی کام کرنے والے (عامل) کے لیے مناسب اور جائز نہیں'' (1)۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

اور ابوداؤد نے عبید اللہ بن عدی بن خیار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: مجھے دو آدمیوں نے خبر دی ہے کہ وہ دونوں حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ صدقہ تقسیم فرمارہے تھے تو انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس میں سے کچھ مانگا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری طرف نظر اٹھائی اور پھر اسے جھکا لیا، پس آپ نے ہمیں مضبوط دیکھا تو ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں ورنہ اس میں کسی غنی اور کسی کمانے والے قوی آدمی کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے'' (2)۔ کیونکہ وہ اپنی کمائی کے سبب اس طرح غنی ہے جیسے کوئی دوسرا اپنے مال کے سبب غنی ہو پس دونوں میں سے ہر ایک سوال کرنے سے غنی ہو گیا ہے۔ اور یہ ابن خویز منداد نے کہا ہے، اور اسے ''المذہب'' سے بیان کیا ہے، اور یہ مناسب نہیں کہ اس پر بھروسہ کر لیا جائے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقراء کو عطا فرماتے تھے اور اسے (صدقہ کو) اپاہج پر موقوف کرنا باطل ہے۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں کہا ہے: جب آدمی قوی البدن محتاج ہو اور اس کے پاس کوئی شے نہ ہو اور اس پر صدقہ کر دیا جائے تو اہل علم کے نزدیک صدقہ کرنے والے کی طرف سے یہ جائز ہے (3)۔ اور بعض اہل علم کے نزدیک حدیث کی اطلاق سوال کی صورت میں ہے۔ اور الکیا طبری نے کہا ہے: ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنی قوت اور اپنے بدن کے تندرست ہونے کے باوجود فقیر ہے۔ اور اسی طرح امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے۔

اور عبید اللہ بن حسن نے کہا ہے: وہ آدمی جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اسے کافی ہو اور سال بھر اسے قائم رکھ سکتا ہو تو اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔ اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے ابن شہاب نے مالک بن اوس بن حدثان سے اور انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مال سے سال بھر کی خوراک جمع رکھتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور مال فے عطا فرمایا، پھر اس سے جتنا زائد ہوتا اسے گھوڑے اور ہتھیار خریدنے میں لگا دیتے اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ۝ (الضحیٰ)

اور بعض اہل علم نے کہا ہے: ہر ایک کے لیے صدقہ میں سے لینا ایسی حالت میں جائز ہے جس سے اسے کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: جس کے پاس رات کا کھانا ہو تو وہ غنی ہے۔ اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے ظہر غنیٰ کے ہوتے ہوئے سوال کیا تو اس نے اس کے ساتھ جہنم میں گرم کیے گئے پتھروں کو کثرت سے طلب کیا'' (4)۔ صحابہ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 119، حدیث نمبر 66 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، حدیث نمبر 589، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 121

کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ظہر الغنی کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رات کا کھانا''۔ اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: اس کی سند میں عمرو بن خالد ہے اور وہ متروک ہے۔ اور اسے ابوداؤد نے سہل بن حنظلیہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے: ''جس نے سوال کیا اس حال میں کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے غنی کررہا ہو تو بلاشبہ وہ آگ کی کثرت طلب کررہا ہے اور نفیلی نے ایک دوسرے مقام پر کہا ہے: ''وہ جہنم کے انگارے (کثرت سے اکھٹے کررہا ہے) تو صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کون سی شے اسے غنی کرسکتی ہے؟ اور نفیلی نے دوسری جگہ بیان کیا: وہ کون سا غنا ہے جس کے ہوتے ہوئے سوال نہیں کرنا چاہیے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اتنی مقدار جو صبح وشام کے کھانے میں کافی ہو''۔ اور نفیلی نے ایک دوسرے مقام میں کہا ہے کہ ''اس کے پاس دن اور رات یا رات اور دن پیٹ بھرنے کے لیے کھانا موجود ہو'' (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ذکر ہوا یہ اس فقر کا بیان ہے جس کے ساتھ زکوٰۃ لینا جائز ہوتی ہے اور مطلق لفظ فقراء اہل ذمہ کے بغیر صرف مسلمانوں کے ساتھ اختصاص کا تقاضا نہیں کرتا، البتہ اس بارے میں اخبار بالکل ظاہر ہیں کہ صدقات مسلمانوں کے اغنیاء سے لیے جائیں گے اور ان کے فقراء کو دے دیئے جائیں گے۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فقراء سے مراد فقراء المسلمین ہیں اور مساکین سے مراد اہل کتاب کے فقراء ہیں (2)۔ اور ابوبکر العبسی نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو نابینا حالت میں شہر کے دروازے پر پڑا ہوا دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تجھے کیا ہوا ہے؟ اس نے عرض کی: انہوں نے مجھے اس جزیہ میں کرایہ پر لیے رکھا، یہاں تک کہ جب میری نظر ختم ہوگئی تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا اور میرے لیے اب کوئی نہیں ہے جو مجھے کوئی شے دے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تب تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، چنانچہ آپ نے اس کے لیے اس کی خوراک اور اس شے کا حکم دیا جو اس کی ضرورت پوری کرسکتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: یہ ان میں سے ہے جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ، الآیہ اور وہ اہل کتاب کے اپاہج لوگ ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ، الآیہ اور جملے کا مقابلہ جملے کے ساتھ کیا اور یہ تمام صدقہ جملہ مصارف کے مقابل ہے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا جب انہیں یمن کی طرف بھیجا: ''تم انہیں آگاہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے وہ ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء میں لوٹا دیا جائے گا'' (3)۔ پس ہر شہر کے باسی اپنے شہر کی زکوٰۃ کے ساتھ خاص ہیں۔ اور ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ زیاد یا کسی اور امیر نے عمران بن حصین کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا، پس جب وہ لوٹ کر آئے تو اس نے عمران سے پوچھا: مال کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: مال کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا! ہم نے اسے وہاں سے لیا جہاں سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لیتے تھے اور ہم نے اسے وہاں رکھ دیا جہاں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 230۔ ایضاً، حدیث نمبر 1388، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 67　3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 223

کے زمانہ میں رکھتے تھے۔ اور دار قطنی اور ترمذی نے عون بن ابی جحیفہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہمارے پاس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صدقہ وصول کرنے والا آیا پس اس نے ہمارے اغنیاء سے صدقہ لیا اور اسے ہمارے فقراء کو ادا کر دیا پس میں ایک یتیم بچہ تھا تو اس نے مجھے اس میں سے ایک جوان اونٹنی دی (1)۔

ترمذی نے کہا ہے: اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جحیفہ کی حدیث مروی ہے وہ حدیث حسن ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ زکوٰۃ کو اپنی جگہ سے منتقل کرنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے اور اس بارے میں تین قول ہیں: وہ منتقل نہیں کی جائے گی۔ یہ سحنون اور ابن قاسم نے کہا ہے۔ اور یہ صحیح ہے ان دلائل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دیئے ہیں۔ ابن قاسم نے یہ بھی کہا ہے: اگر ضرورت کے تحت زکوٰۃ کا کچھ حصہ منتقل کیا گیا تو میں اسے صحیح اور درست قرار دیتا ہوں۔ اور سحنون سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: اگر امام وقت کو یہ خبر موصول ہو کہ کچھ علاقہ شدید حاجت مند ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بعض کی فرض زکوٰۃ ان کی طرف منتقل کر دے، کیونکہ جب وہ حاجت ظاہر ہو جائے تو پھر اسے اس پر مقدم کرنا واجب ہے جو محتاج نہیں ''اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اسے (کسی ظالم یا مصیبت) کے حوالے کرتا ہے اور نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے''(2) اور دوسرا قول یہ ہے کہ زکوٰۃ منتقل کی جا سکتی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے اور اس قول کی حجت وہ روایت ہے جو اس طرح مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کو کہا: تم مجھے خمیس (پانچ گز کپڑا) یا بوسیدہ پہننے کے کپڑے دے دو میں تم سے وہ جو (مکئی) اور جو کی جگہ صدقہ میں لوں گا کیونکہ یہ تم پر آسان ہیں اور مدینہ طیبہ کے مہاجرین کے لیے زیادہ نفع بخش ہیں (3)۔ اسے دار قطنی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس روایت میں لفظ الخمیس مشترک ہے اور یہاں اس سے مراد پانچ گز لمبا کپڑا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: اسے یہ نام اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ جس نے سب سے پہلے یہ عمل کیا وہ یمن کے بادشاہوں میں سے اخمس بادشاہ تھا۔ اسے ابن فارس نے مجمل میں اور جوہری نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے، جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یمن سے مدینہ طیبہ کی طرف زکوٰۃ منتقل کی اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تقسیم کے والی تھے۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے: **اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ** اور اس میں ایک شہر کے فقیر اور دوسرے شہر کے فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں بیان کیا گیا۔ واللہ اعلم

دوسرا قول: زکوٰۃ میں قیمت لینا ہے۔ تحقیق زکوٰۃ میں قیمت نکالنے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت مختلف ہے۔ آپ نے ایک بار اس کی اجازت عطا فرمائی اور دوسری بار اس سے منع کر دیا۔ جواز کی وجہ یہ حدیث ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی جواز کا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی: ''وہ آدمی جس کا اونٹوں میں سے صدقہ جذعہ (چار سال کا اونٹ) تک پہنچ چکا ہو اور اس کے پاس جذعہ نہ ہو بلکہ اس کے پاس حقہ (ایسا اونٹ جس کی عمر تین سال مکمل ہو چکی ہو) ہو تو اس سے وہ لے لیا جائے اور اس کے ساتھ دو بکریاں یا بیس درہموں

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 82۔ ایضاً، حدیث نمبر 587، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المظالم، جلد 1، صفحہ 330

3۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 100، حدیث نمبر 24

میں سے جو آسان ہو''(1)۔ الحدیث۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انہیں اس دن سوال سے غنی کردو''(2)۔ مراد یوم فطر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ انہیں اس چیز کے ساتھ غنی کیا جائے جو ان کی حاجت کو پورا کرسکتی ہے، پس جو چیز بھی ان کی حاجت ختم کرسکتی ہے وہ جائز ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ:103) (تم ان کے مالوں سے صدقہ لو) اسے رب کریم نے کسی شے کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زکوۃ کے بدلے گھر کی رہائش نہیں دی جاسکتی، مثلاً کسی پر پانچ درہم واجب ہوں اور وہ ان میں ایک فقیر کو ایک مہینہ گھر میں رہائش دے دے تو یہ جائز نہیں۔ فرمایا: یہ اس لیے ہے کیونکہ رہائش مال نہیں ہے۔

اور ان کے اس قول ''قیمت دینا جائز نہیں ہے''۔ اور یہی ان کا ظاہر مذہب ہے۔ کی وجہ یہ ہے کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ اونٹوں میں (بطور زکوۃ) ایک بکری ہے اور چالیس بکریوں میں ایک بکری ہے''(3)۔ پس یہ بکری کے بارے نص ہے پس جب اس نے اس پر عمل نہ کیا تو گویا اس نے مامور بہ پر عمل نہ کیا اور جب مامور بہ پر عمل نہ ہو تو امر اپنی حالت پر باقی رہتا ہے۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ فقراء اور مساکین کا حصہ اس جگہ تقسیم کیا جائے گا اور بقیہ تمام حصص امام کے اجتہاد کے ساتھ منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 7۔ کیا سال مکمل ہونے کے وقت مال کی جگہ کا بھی اعتبار ہے کہ صدقہ وہیں تقسیم کیا جائے یا مالک کی جگہ کا اعتبار ہے جب کہ مخاطب وہ ہے۔ اس بارے میں دو قول ہیں۔ دوسرے کو ابو عبداللہ محمد بن خویز منداد نے اپنے احکام میں اختیار کیا ہے انہوں نے کہا ہے: کیونکہ انسان ہی زکوۃ نکالنے کے حکم کا مخاطب ہے اور مال اس کے تابع ہے۔ پس واجب ہے کہ اس میں حکم مخاطب کے اعتبار سے ہو، جیسا کہ ابن سبیل (مسافر) وہ اپنے شہر میں غنی ہوتا ہے اور دوسرے شہر میں فقیر ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے حکم اس دوسرے اعتبار سے ہے۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں جس نے کسی مسلمان فقیر کو صدقہ دیا پھر ایک دوسری حالت میں یہ ظاہر ہوا کہ اس نے غلام یا کافر یا غنی کو دے دیا تو آپ نے ایک بار فرمایا: وہ اس کی طرف سے جائز ہوگا اور پھر فرمایا جائز نہیں ہوگا۔ وجہ الجواز... اور یہی اصح ہے۔ وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ''ایک آدمی نے کہا میں آج کی رات ضرور صدقہ ادا کروں گا چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور اس نے وہ زانیہ کے ہاتھ میں دے دیا جب انہوں نے صبح کی تو آپس میں باتیں کرنے لگے آج کی رات زانیہ کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس آدمی نے حیران ہو کر کہا: اے اللہ! تیرے لیے ہی حمد ہے کیا زانیہ کو دے دیا

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 195
2۔ سنن دار قطنی، کتاب الزکوۃ، جلد 2، صفحہ 153، حدیث نمبر 67
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 219۔ ایضاً، حدیث نمبر 1340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما جاء فی زکوۃ الذهب الخ، حدیث نمبر 564، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے؟ میں اس صدقہ کے بدلے ضرور صدقہ کروں گا، پھر وہ صدقہ لے کر نکلا اور ایک غنی کے ہاتھ میں دے دیا، پھر جب انہوں نے صبح کی تو باتیں کرنے لگے: غنی کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اس آدمی نے کہا: اے اللہ! حمد کے لائق تو ہی ہے کیا غنی کو دے دیا ہے؟ میں اس صدقہ کے عوض ضرور صدقہ دوں گا۔ چنانچہ وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور اسے چور کے ہاتھ میں دے دیا، پھر جب انہوں نے صبح کی تو وہ باتیں کرنے لگے: چور کو صدقہ دیا گیا ہے، تو اس نے کہا: اے اللہ! حمد تیرے لیے ہی ہے کیا زانیہ، غنی اور چور کو صدقہ دیا گیا ہے؟ چنانچہ اسے لایا گیا اور اسے کہا گیا: جہاں تک تیرے صدقہ کا تعلق ہے وہ قبول کر لیا گیا ہے، رہی زانیہ تو شاید وہ اس کے سبب اپنے زنا سے بچ جائے پاک دامن ہو جائے۔ اور شاید غنی اس لیے معتبر ہے کہ وہ اس سے خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے اور شاید چور اس کے ساتھ چوری سے محفوظ ہو جائے'' (1)۔ اور روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی اور اس نے وہ اپنے باپ کو دے دی۔ پس جب صبح ہوئی تو اسے اس بارے علم ہوا۔ پھر اس نے حضور نبی مکرم ﷺ سے اس بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا: ''تحقیق تیرے لیے تیری زکوٰۃ کا اجر اور صلہ رحمی کا اجر لکھ دیا گیا ہے پس تیرے لیے دو اجر ہیں''۔ اور معنی کی جہت سے یہ ہے کہ اس کے لیے معطی (جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے) کے بارے اجتہاد اور تتبع و تلاش کو جائز قرار دیا ہے، پس جب اس نے اجتہاد کیا اور اسے دیا جسے وہ اس کا اہل گمان کرتا ہے تو اس نے اپنا واجب ادا کر دیا۔

اور اس قول ''کہ وہ جائز نہیں ہے'' کی وجہ یہ ہے کہ اس نے وہ صدقہ اس کے مستحق کو نہیں دیا۔ پس یہ عمد (جان بوجھ کر عمل کرنا) کے مشابہ ہو گیا، کیونکہ اموال کی ضمان میں عمد اور خطا ایک ہی ہے پس واجب ہے کہ وہ اس کا ضامن ہو جو اس نے مساکین کا حصہ ضائع کیا ہے یہاں تک کہ اسے ان تک پہنچا دے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی نے زکوٰۃ اس کے محل کے وقت نکالی پھر وہ بغیر تفریط کے ضائع ہو گئی تو وہ ضامن نہ ہوگا، کیونکہ وہ فقراء کا وکیل ہے۔ اور اگر اس نے اسے اس کی مدت گزرنے کے بعد نکالا پھر وہ ضائع ہو گئی تو وہ ضامن ہوگا، کیونکہ اسے اس کے محل سے مؤخر کرنے کے سبب وہ اس کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو چکی ہے اس لیے وہ اس کا ضامن ہوگا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب امام وقت زکوٰۃ وصول کرنے اور اسے خرچ کرنے میں عدل کر رہا ہو تو پھر مالک کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بذات خود دراہم و دنانیر یا کسی اور مال میں تصرف کرنے کا والی بنے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک دراہم و دنانیر کی زکوٰۃ ان کے مالکوں پر ہے۔ اور ابن ماجشون نے کہا ہے: یہ تب ہے جب صرف فقراء اور مساکین کے لیے خرچ کرنا ہو۔ اور اگر ان دو کے علاوہ دیگر اصناف میں خرچ کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو پھر ان پر امام کے سوا کوئی تقسیم نہیں کر سکتا۔ اس باب کی فروع کثیر ہیں اور یہ ان کی اصل ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا مراد وہ بھاگ دوڑ کرنے والے اور خرچ وصول کرنے والے ہیں جنہیں امام وقت اپنا وکیل بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 329

ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسد کے ایک آدمی کو بنی سلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے عامل مقرر فرمایا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا، پس جب وہ آیا تو آپ نے اس سے حساب لیا (1)۔ اور علماء کا اس مقدار میں اختلاف ہے جو زکوٰۃ وصول کرنے والے لے سکتے ہیں اس بارے میں تین قول ہیں:

حضرت مجاہد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ آٹھواں حصہ ہے۔ ابن عمر اور امام مالک نے کہا ہے: انہیں ان کے کام کے برابر اجرت دی جائے گی، اور یہی قول امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم کا ہے (2)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ اس نے فقراء کی مصلحت اور منفعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہے، پس اس کی کفایت اور اس کے معاونین کی کفایت ان کے مال سے ہوگی، جیسا کہ عورت نے جب اپنے آپ کو خاوند کے حق کے لیے معطل کر دیا تو اس کا نفقہ اور اس کے تبعین چاہے وہ ایک خادم ہو یا دو ہوں کا نفقہ خاوند کے ذمہ ہے۔ اسے ثمن (آٹھواں حصہ) کے ساتھ مقرر نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس میں کفایت کا اعتبار کیا جائے گا چاہے وہ آٹھواں حصہ ہو یا اس سے زیادہ، جیسا کہ قاضی کی تنخواہ وغیرہ۔ اور ہمارے زمانے میں معاونین کی کفایت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ محض اسراف اور فضول خرچی ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ انہیں بیت المال سے دیا جائے گا۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے یہی قول صحیح ہے اس روایت کے مطابق جو ابن ابی اویس اور داؤد بن سعید بن زنبوعہ سے ہے اور یہ دلیل کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے حصے کے بارے خبر دی ہے وہ اس میں نص ہے تو پھر استقراء اور سبر کے ذریعہ اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے (3)۔ اور صحیح یہ ہے کہ اجرت مقرر کرنے میں اجتہاد کرنے، کیونکہ یہ بیان اصناف شمار کرنے کے بارے ہے بلاشبہ وہ محل کے لیے ہے نہ کہ مستحق کے لیے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

علماء نے ایسے عامل کے بارے میں اختلاف کیا ہے جب وہ ہاشمی ہو، پس امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے منع کیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال نہیں ہے بلاشبہ یہ لوگوں کی میل ہے'' (4)۔ اور یہ بھی من وجہ صدقہ ہے، کیونکہ یہ (زکوٰۃ) صدقہ کا ایک جز ہے۔ پس اسے کرامۃً اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو لوگوں کے غسالہ اور دھوون سے بچانے کے لیے من کل الوجوہ صدقہ سے ملحق کیا جائے گا۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اس کے عمل کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے کام کی اجرت بھی اسے دی جائے گی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اور آپ کو یمن کی طرف زکوٰۃ کا عامل بنا کر بھیجا (5) اور آپ کو بنی ہاشم کی ایک جماعت کا والی بنایا اور آپ کے بعد اسی طرح خلفاء والی بنے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ عامل مباح عمل پر بطور اجیر ہوتا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 203
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 962
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 962
4۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 344
5۔ سنن ابی داؤد، باب کیف القضاء، حدیث نمبر 3111، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
سنن ابن ماجہ، باب ذکر القضاء، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس میں ہاشمی اور غیر ہاشمی برابر ہوں جیسا کہ دیگر تمام کاروبار میں ہوتا ہے۔ احناف نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ آپ کے لیے صدقہ میں سے کچھ مقرر کیا گیا، پس اگر آپ کے لیے صدقہ کے علاوہ (کسی اور مال) سے اجرت مقرر کی گئی تو وہ جائز ہے اور یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام امور جو فرض کفایہ میں سے ہیں جیسے صدقات کی وصولی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، کاتب، قسام (زمین کی تقسیم کرنے والا) اور محصول چنگی لینے والا (عاشر) وغیرہ پس ان امور کو سرانجام دینے والے کے لیے اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور اس میں سے امامت بھی ہے، کیونکہ نماز اگرچہ تمام مخلوق کی طرف متوجہ ہے لیکن ان میں سے بعض کا امامت کے لیے آگے بڑھنا فروض کفایہ میں سے ہے، لہٰذا بلاشک اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اور یہ باب کی اصل ہے اور اس کی طرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول کے ساتھ اشارہ کیا ہے: ''میں نے اپنی زوجات کے نفقہ اور اپنے عاملین کی محنت اجرت کے سوا جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے''۔ یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ قرآن کریم میں صدقات کی تقسیم کے سوا کہیں مولفۃ قلوب کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو ابتدائے اسلام میں ان لوگوں میں سے تھے جو اسلام ظاہر کرتے تھے، ان کے یقین کمزور ہونے کی وجہ سے صدقہ میں سے انہیں حصہ دیئے جانے کے سبب وہ دوستی قائم رکھتے تھے۔ زہری نے کہا ہے: المولفہ وہ ہیں جو یہود و نصاریٰ میں سے اسلام لائے اگرچہ وہ غنی اور دولت مند ہوں (1)۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے: ان کی صفت اور تعریف میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ کفار کی ایک صنف ہیں انہیں اس لیے (صدقات) دیئے جاتے تھے تا کہ وہ اسلام کی طرف مائل رہیں اور وہ غلبہ اور تلوار کے زور پر اسلام قبول نہ کرتے تھے، لیکن وہ عطا اور احسان کے ساتھ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر اسلام لائے لیکن ان کے دلوں نے یقین نہ کیا، پس انہیں عطا کیا جاتا تھا تا کہ اسلام ان کے سینوں میں راسخ ہو جائے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مشرکین کے عظماء کی ایک جماعت ہے ان کے متبعین بھی تھے انہیں دیا جاتا تھا تا کہ ان کے متبعین اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔ فرمایا: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں، ان تمام سے مقصود ان کو عطا کرنا ہے جو عطا کے بغیر حقیقۃً اسلام لانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ تو گویا یہ جہاد کی ایک قسم ہے۔ اور مشرکین تین قسم کے ہیں: ایک قسم کی طرف دلائل قائم کر کے رجوع کیا جاتا ہے اور ایک قسم کی طرف قہر و غلبہ کے ساتھ اور ایک قسم کی طرف احسان و عطا کے ساتھ۔ اور وہ امام جو مسلمان کے لیے نظر و فکر کرنے والا ہے وہ ہر صنف کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جسے وہ کفر سے نجات اور خلاصی پانے کا سبب اور ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: ''بے شک میں ان لوگوں کو عطا کرتا ہوں جن کا زمانہ ابھی کفر کے قریب ہے تو میں ان کی تالیف قلوب کرتا ہوں'' (2)۔ الحدیث

1۔ المحرر الوجیز، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 49
2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 338

ابن اسحاق نے کہا ہے: آپ انہیں عطا فرماتے اور ان کی تالیف قلوب فرماتے اور آپ ان کے سبب ان کی قوم کی بھی تالیف کرتے تھے اور وہ اشراف اور سردار تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان بن حرب کو سو اونٹ دیئے اور اس کے بیٹے کو بھی سو اونٹ عطا فرمائے۔ حکیم بن حزام کو سو اونٹ دیئے، حارث ابن ہشام کو سو اونٹ دیئے، سہیل بن عمرو کو سو اونٹ عطا فرمائے، حویطب بن عبد العزی کو سو اونٹ دیئے اور صفوان بن امیہ کو سو اونٹ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح مالک بن عوف اور علاء بن جاریہ کو بھی عطا فرمائے۔ فرمایا: یہ سب اصحاب المئین ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش میں سے بعض لوگوں کو سو سے کم بھی دیئے ان میں سے مخرمہ بن نوفل الزہری، عمیر بن وہب جمحی، ہشام بن عمرو العامری ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: یہ وہ ہیں جن کے بارے میں نہیں جانتا کہ آپ نے انہیں کتنے عطا فرمائے؟ اور سعید بن یربوع کو پچاس اونٹ دیئے اور عباس بن مرداس السلمی کو تھوڑے اونٹ دیئے تو وہ اس پر ناراض ہو گیا۔ تو اس نے اس بارے میں یہ کہا:

كانت نِهابًا تَلافَيْتُها بِكَرّي على المُهْرِ في الأَجْرَعِ
وإيقاظِيَ القومَ أن يرقدوا إذا هَجَعَ النّاسُ لم أهجعِ
فأصبحَ نَهْبِي ونَهْب العُبَيْدِ بين عيينه والأقْرَعِ
وقد كنتُ في الحرب ذاتُدْرَءٍ فلم أُعْطَ شيئًا ولم أُمْنَعِ
إلّا أفائلَ أُعطيتُها عديدَ قوائِمه الأربعِ
وما كان حِصْنٌ ولا حابِسٌ يفوقان مِرْداسَ في المَجْمَعِ
وما كنتُ دون أمرئ منهما ومن تَضِعِ اليومَ لا يُرْفَعِ

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم جاؤ اور میرے بارے میں اس کی زبان بند کرو" (1)۔ چنانچہ انہوں نے اسے اتنا دیا یہاں تک کہ وہ راضی ہو گیا۔ تو گویا اس طرح اس کی زبان کٹ گئی۔ ابو عمر نے کہا ہے: مولفۃ قلوب میں نضیر بن حارث بن علقمہ ابن کلدہ کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ اس نضر بن حارث کا بھائی تھا جو بدر میں ڈٹا رہا اور مارا گیا۔ اور دوسروں نے ذکر کیا ہے کہ یہ ان میں سے تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پس اگر یہ ان میں سے ہے تو پھر اس کا مولفۃ قلوب میں سے ہونا محال ہے، کیونکہ جس نے سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کی تو وہ ان مہاجرین اولین میں سے ہوا جن کے دل میں ایمان راسخ ہو گیا اور اس نے اپنے سوا کے ساتھ قتال کیا اور وہ ان میں سے نہیں جن کی تالیف قلوب کی جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن عوف بن سعد بن یربوع نصری کو ان پر عامل مقرر کیا جو قبائل قیس میں سے اس کی قوم سے اسلام لائے اور اسے ثقیف کی لوٹ مار کرنے کا حکم دیا پس اس نے ایسا ہی کیا اور اس پر جینا تنگ کر دیا اور اس کا اسلام اور ان کے مولفۃ قلوب کا اسلام حسین اور اچھا ہو گیا، سوائے عیینہ بن حصن کے وہ ہمیشہ متہم رہتا۔ تمام مولفۃ قلوب فاضل لوگ تھے، ان میں سے بہترین اور عمدہ فاضل بھی ہیں جن کے فضل پر اجماع ہے، مثلاً حارث

1۔ دلائل النبوۃ، رجوع النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الجعرانۃ، جلد 5، صفحہ 183

بن ہشام، حکیم بن حزام، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور ان میں سے کچھ ان میں سے کم ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے تمام مومن بندوں کو آپس میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور وہ انہیں بہتر جانتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حکیم بن حزام نے وہ مال نکال دیا جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مولفۃ قلوب کی صورت میں عطا فرمایا تھا پس انہوں نے اس کے بعد اسے صدقہ کر دیا(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت حکیم بن حزام اور حضرت حویطب بن عبد العزی میں سے ہر ایک ایک سو بیس برس تک زندہ رہا، ساٹھ سال اسلام کی حالت میں اور ساٹھ برس زمانہ جاہلیت میں۔ اور میں نے امام الشیخ، الحافظ ابو محمد عبد العظیم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو آدمی ہیں جو زمانہ جاہلیت میں ساٹھ برس تک اور زمانہ اسلام میں بھی ساٹھ برس تک زندہ رہے اور وہ دونوں مدینہ طیبہ میں 54ھ میں فوت ہوئے۔ ان میں سے ایک حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ہیں، ان کی ولادت جوف کعبہ میں عام الفیل سے تیرہ سال پہلے ہوئی۔ اور دوسرے حضرت حسان بن ثابت بن منذر بن حرام الانصاری ہیں۔ اور اسے ابو عمر اور عثمان الشہر زوری نے بھی کتاب ''معرفۃ انواع علم الحدیث'' میں ذکر کیا ہے اور ان دونوں نے ان کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا۔ اور حویطب کا ذکر ابو الفرج علامہ الجوزی نے کتاب الوفاء فی شرف المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کیا ہے۔ اور اسے ابو عمر نے کتاب الصحابہ میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کیا اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی اور ایک سو بیس سال کی عمر میں ان کا وصال ہوا۔ اور انہوں نے حمنن ابن عوف جو کہ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں ان کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ حالت اسلام میں ساٹھ برس تک زندہ رہے اور جاہلیت میں بھی ساٹھ سال تک زندہ رہے۔ اور مولفۃ قلوبہم میں حضرت معاویہ اور ان کے والد ابو سفیان بن حرب کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

رہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ! تو آپ کا ان میں سے ہونا بعید ہے۔ اور آپ ان میں سے کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی قراءت پر امین بنایا اور انہیں اپنی ذات کے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام میں ان کی حالت اس سے زیادہ مشہور اور اظہر تھی۔ اور جہاں تک ان کے باپ کا تعلق ہے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ ان میں سے تھے۔ اور مولفۃ قلوبہم کی تعداد میں اختلاف ہے، بالجملہ وہ سب کے سب مومن تھے اور ان میں کوئی بھی کافر نہیں تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم واحکم۔

مسئلہ نمبر 13۔ علماء نے ان کے باقی رہنے میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت عمر، حسن اور شعبی وغیرہم نے کہا ہے: اسلام کے غلبے اور ظہور کے ساتھ یہ صنف ختم ہو چکی ہے۔ یہی امام مالک اور اصحاب رائے رحمۃ اللہ علیہم کا مشہور مذہب ہے۔ بعض علمائے حنفیہ نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اس کے ماننے والوں کو غلبہ عطا فرمایا اور کافروں کی جڑ کاٹ دی ..... اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت ہو تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دور میں ان کے حصہ کے ساقط ہونے پر اجماع کیا(2)۔ اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ ابھی باقی ہیں، کیونکہ امام وقت کو

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 963

2۔ تفسیر آیات احکام القرآن، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 64

بسا اوقات ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اسلام پر مائل کرے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دین کو غالب آتے دیکھ تو آپ نے انہیں ختم کر دیا۔ یونس نے کہا ہے: میں نے زہری سے ان کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں ان کے بارے میں نسخ کو نہیں جانتا۔ ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: پس اس بنا پر حکم ان کے بارے میں ثابت ہے، پس اگر کوئی ہو جس کی تالیف قلب کی ضرورت ہو اور ان کے بارے یہ خوف ہو کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی آفت آپہنچے گی یا یہ امید ہو کہ اس کا اسلام اس کے بعد اچھا ہو جائے گا تو اسے دے دیا جائے۔ قاضی عبدالوہاب نے کہا ہے: اگر بعض اوقات ان کی حاجت اور ضرورت پیش آ جائے تو انہیں صدقے میں سے دے دیا جائے۔ اور قاضی ابن عربی نے کہا ہے: جو میرے نزدیک ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اگر اسلام قوی اور طاقتور ہو تو وہ زائل ہو چکے ہیں (انہیں کچھ بھی نہ دیا جائے) اور اگر ان کی احتیاج اور ضرورت ہو تو ان کا حصہ انہیں دیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیتے تھے (1)، کیونکہ صحیح روایت میں ہے: "اسلام کا آغاز غریب حالت میں ہوا اور عنقریب وہ پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جائے گا جس پر وہ شروع میں تھا" (2)۔

مسئلہ نمبر 14۔ پس جب ہم نے اس پر تفریع ذکر کی ہے کہ ان کی طرف ان کا حصہ نہیں لوٹایا جائے گا کیونکہ وہ تمام اصناف کی طرف لوٹ جائیں گے یا اس کی طرف جسے امام مناسب دیکھے گا۔ اور زہری نے کہا ہے: ان کا نصف حصہ مساجد بنانے والوں کو دے دیا جائے گا۔ اور یہ تیری اس پر رہنمائی کرتی ہے کہ آٹھوں اصناف محل ہیں اور وہ سب برابر مستحق نہیں ہیں۔ اور اگر وہ مستحق ہوتے تو یقیناً ان کا حصہ ان کے سقوط کے ساتھ ساقط ہو جاتا اور وہ ان کے غیر کی طرف نہ ہوتا، جیسا کہ اگر کوئی دو معین قوم کے لیے وصیت کرے پھر ان میں سے ایک مر جائے تو اس کا حصہ ان میں سے باقی رہنے والوں کی طرف نہیں لوٹتا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَفِي الرِّقَابِ یعنی گردنیں آزاد کرانے میں۔ اسے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا ہے۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ پس امام کے لیے جائز ہے کہ مال صدقہ سے گردنیں (غلام) خریدے اور انہیں مسلمانوں کی جانب سے آزاد کر دے اور ان کی ولاء مسلمانوں کی جماعت کے لیے ہوگی۔ اور اگر صاحب زکوٰۃ (زکوٰۃ ادا کرنے والا مالک) انہیں خریدے اور پھر انہیں آزاد کر دے تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مذہب کا ماحصل ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور امام احمد، اسحاق، اور ابو عبید وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور ابو ثور نے کہا ہے: صاحب زکوٰۃ کسی نفس کو زکوٰۃ سے نہیں خرید سکتا کہ وہ اسے ولاء کے حصول کے لیے پھر آزاد کر دے۔ یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب الرائے کا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَفِي الرِّقَابِ پس جب صدقات میں گردنوں کی آزادی کا حصہ ہے تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک غلام خریدے اور اسے آزاد کر دے۔ اور اہل علم کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لیے گھوڑا خریدنا جائز ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں سوار ہو کر جائے گا۔ (یعنی جہاد کے لیے) تو جب اس کے لیے گھوڑا مکمل طور پر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 966
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84

زکوٰۃ سے خریدنا جائز ہے تو پھر اس کے لیے غلام مکمل طور پر خریدنا بھی جائز ہوگا۔ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: وَفِي الرِّقَابِ یہ ولاء میں اصل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ گردن آزاد ہو جائے گی اور اس کی ولاء مسلمانوں کے لیے ہوگی۔ اور اسی طرح حکم ہے اگر اسے امام وقت نے آزاد کیا، تحقیق حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولاء بیچنے اور اسے ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ولاء بھی نسبی قرابت کی طرح قرابت ہے لہٰذا نہ اسے بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے“۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ولاء اس کے لیے ہوگی جس نے آزاد کیا“۔ اور عورتیں ولاء میں سے کسی شے کی وارث نہیں ہو سکتیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ”عورتیں ولاء میں کسی شے کی وارث نہیں ہوں گی سوائے اس کے جسے وہ آزاد کریں یا جسے اس نے آزاد کیا جسے انہوں نے آزاد کیا“ (1)۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کو غلام کی جانب سے نصف کا اور نصف کا اس کی بیٹی کو وارث بنایا (2)۔ اور جب آزاد کرنے والا مذکر اور مونث اولاد چھوڑے تو ولاء اس کی اولاد میں سے مذکر افراد کے لیے ہوگی نہ کہ مونث کے لیے۔ اور اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے۔ اور ولاء کا وارث محض وہ ہوتا ہے جسے عصبہ بنایا جاتا ہے اور عورتیں عصبہ نہیں بن سکتیں پس وہ ولاء میں سے کسی شے کی وارث نہیں بن سکتیں۔ پس تو سمجھ لے تو منزل کو پالے گا۔

مسئلہ نمبر 17۔ علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے کہ کیا مکاتب کی صدقات سے مدد کی جائے گی؟ تو کہا گیا ہے: نہیں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب گردن (غلام آزاد کرنے) کا ذکر کیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اس نے کامل آزادی کا ارادہ کیا ہے۔ اور رہا مکاتب تو وہ غارمین (مقروض) کے کلمہ میں داخل ہے اس وجہ سے کہ اس پر کتابت کا دین (قرض) ہے۔ پس وہ الرقاب میں داخل نہ ہوگا (3)۔ واللہ اعلم۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مدنیین کی روایت سے مروی ہے اور زیاد نے ان سے روایت کی ہے کہ مال صدقہ سے مکاتب کی اس کی کتابت کی آخر میں اتنے مال سے مدد کی جائے گی کہ وہ آزاد ہو جائے (4)۔ اور اسی بناء پر جمہور علماء نے قول باری تعالیٰ: وَفِي الرِّقَابِ کی تاویل کی ہے۔ اور ابن وہب، امام شافعی، لیث اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم نے کہا ہے۔ اور علی بن موسی القمی الحنفی نے اپنی احکام میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مکاتب مراد ہے۔ اور گردنیں آزاد کرنے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے: الکیا طبری نے کہا ہے: اور انہوں نے اس کے انکار اور منع میں واضح اور بین وجہ ذکر کی ہے اور کہا ہے: بے شک آزاد کرنا ملکیت کو باطل کرنا ہے اور تملیک (مالک بنانا) نہیں ہے اور جو مکاتب کو دیا جائے گا وہ تملیک (مالک بنانا) ہے اور صدقہ کے حق میں سے ہے کہ وہ جائز نہیں ہوتا مگر تب جب اس میں تملیک جاری ہو۔ اور اس کے لیے یہ بات بھی باعث تقویت ہے کہ اگر مقروض کی جانب سے اس کے حکم کے بغیر کوئی زکوٰۃ میں سے اس کا قرض ادا کر دے تو وہ اس حیثیت سے

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب البیوع، جلد 8، صفحہ 363، حدیث نمبر 16030

2۔ سنن ابن ماجہ، باب میراث الولاء، حدیث نمبر 2723، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 967 4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 968

جائز نہیں کہ وہ اس کا مالک نہیں بنا تو وہ ادائیگی عتق میں بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگی۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ عتق بھی ولاء کو اپنی ذات کی طرف لاتا ہوتا ہے اور وہ مکاتب کو دینے میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ غلام کے ثمن جب اس نے ایک غلام کو دے دیئے تو غلام اس کا مالک نہیں ہو سکتا اور اگر اس نے وہ اس کے آقا کو دیئے تو اس نے اسے آزاد کرنے کا مالک بنا دیا۔ اور اگر اس نے اسے شراء اور عتق کے بعد دیئے تو وہ قرض کو پورا کرنے والا ہوگا اور وہ زکوٰۃ میں جائز نہ ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حدیث موجود ہے جو اس معنی پر نص ہے جو ہم نے غلام کو آزاد کرنے اور مکاتب کی مدد کرنے کے جواز کے بارے ذکر کیا ہے، دارقطنی نے اسے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا اور اس نے عرض کی: آپ میری ایسے عمل پر راہنمائی فرمایئے جو مجھے جنت کے قریب کر دے اور مجھے جہنم کی آگ سے دور کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تو خطبہ مختصر اور چھوٹا کرے تو تو نے مسئلہ (سوال) سے اعراض کیا، تو ایک آدمی کو آزاد کرا اور گردن چھوڑ دے''۔ تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں ایک نہیں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، نفس اور آدمی کو آزاد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ تو اسے آزاد کرنے میں منفرد ہو اور فک الرقبۃ کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کے ثمن میں معاونت کرے''(1)۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

مسئلہ نمبر 18۔ مال زکوٰۃ سے قیدیوں کو آزاد کرانے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اصبغ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے۔ اور ابن قاسم کا قول ہے اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ جائز ہے(2)، کیونکہ یہ گردن ہے جس کا غلامی کی ملکیت کے ساتھ مالک بنایا گیا ہے پس یہ غلامی سے آزادی کی طرف نکل جاتی ہے اور یہ ان گردنوں کو آزاد کرنے کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے جو ہمارے قبضے میں ہیں، کیونکہ جب مسلمان کی غلامی سے مسلمان کو آزاد کرانا عبادت اور صدقہ کے مال سے جائز ہے، تو پھر زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے کہ کافر کی غلامی اور ذلت سے مسلمان کی گردن آزاد ہو۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: وَالْغٰرِمِيْنَ مراد وہ لوگ ہیں جن پر قرض ہو اور ان کے پاس اسے ادا کرنے کی طاقت نہ ہو اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، مگر وہ آدمی جس نے سفاہت اور بے وقوفی کی وجہ سے قرض لیا تو اس کی طرف سے مال زکوٰۃ یا کسی دوسرے مال سے قرض ادا نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے(3)۔ اور اس کا قرض مال زکوٰۃ میں سے ادا کیا جائے گا جس کے پاس مال ہو اور اس پر اتنا قرض ہو جو اس سارے مال کو محیط ہو جس کے ساتھ وہ اپنا قرض پورا کر سکتا ہے اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو اور اس پر قرض ہو تو وہ فقیر بھی ہے اور غارم (مقروض) بھی لہٰذا دونوں وصفوں کے عوض اسے دیا جائے گا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس پھل میں جو اس نے خریدا تھا خسارہ پڑ گیا اور اس کا قرض بہت زیادہ ہو گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس پر صدقہ کرو''۔ چنانچہ لوگوں نے اس پر صدقہ کیا اور وہ اس کے قرض کی پوری مقدار کو نہ پہنچ سکا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 2، صفحہ 135　2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 968　3۔ ایضاً

قرض خواہوں کو فرمایا: ”تم وہ لے لو جو تم پاؤ اور تمہارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں“ (1)۔

مسئلہ نمبر 20۔ صلح اور نیکی کے لیے دیت یا جرمانہ وغیرہ کا بوجھ برداشت کرنے والے کے لیے جائز ہے کہ اسے صدقہ میں سے اتنا دیا جائے جس سے وہ اسے ادا کر سکے جو بوجھ اس نے اٹھایا ہے بشرطیکہ وہ اس پر واجب ہو اگرچہ وہ غنی ہو، جب کہ وہ اپنے مال سمیت برباد کیا جا رہا ہو جیسا کہ مقروض۔ اور یہ امام شافعی، آپ کے اصحاب اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اور کئی دوسروں نے کہا ہے۔ اور جس نے یہ مذہب اختیار کیا ہے اس نے قبیصہ بن مخارق کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے ایک ذمہ داری (بوجھ) اٹھائی اور میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تا کہ اس بارے میں آپ سے سوال کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو ٹھہر یہاں تک کہ ہمارے پاس صدقہ آ جائے تو ہم تیرے لیے اس سے حکم دیں گے.... پھر فرمایا...... اے قبیصہ! بے شک مانگنا، سوال کرنا تین آدمیوں میں سے ایک کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہوتا ایک وہ جس نے کسی کا بوجھ (دیت، خون بہا وغیرہ) اٹھا رکھا ہو تو اس کے لیے مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہو جائے پھر وہ مانگنے سے رک جائے۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے کوئی تکلیف اور مصیبت آ پہنچی ہو اس کا مال برباد ہو گیا ہو تو اس کے لیے مانگنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ مضبوط زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے فاقے نے آلیا ہو یہاں تک کہ اس کی قوم کے تین آدمی شہادت دیں کہ تحقیق فلاں کو فاقے نے آلیا ہے تو اس کے لیے سوال کرنا حلال ہے یہاں تک کہ وہ مضبوط اور صحیح زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اے قبیصہ! ان کے سوا سوال کرنا حرام ہے اور سوال کرنے والا اس طرح حرام کھائے گا“ (2)۔ پس آپ کا قول: ثم یمسك اس پر دلیل ہے کہ اب وہ غنی ہے، کیونکہ فقیر پر رکنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”بے شک سوال کرنا، مانگنا حلال نہیں ہے مگر تین میں سے ایک کے لیے ایک وہ جو شدید فقر میں مبتلا ہو یا وہ جو شدید اور پریشان کن قرض میں مبتلا ہو (3) یا جو دردناک اور تکلیف دہ دیت اور خون بہا کے بوجھ میں مبتلا ہو“۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ”سوائے پانچ کے کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہو گا“ (4)۔ الحدیث۔ عنقریب آئے گی۔

مسئلہ نمبر 21۔ اس میں اختلاف ہے کیا صدقہ کے مال سے میت کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صدقہ سے میت کا قرض ادا نہیں کیا جا سکتا اور یہی قول ابن المواز کا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید کہا: مال صدقہ میں سے اسے بھی نہیں دیا جا سکتا جس پر کفارہ ہو اور حقوق اللہ میں سے اسی طرح کی کوئی اور شے لازم ہو، بے شک غارم وہ ہے جس پر ایسا قرض ہو جس میں اسے قید کیا جا سکتا ہو (5)۔ ہمارے علماء وغیرہم نے کہا ہے: مال صدقہ میں سے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث 1398، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 50

میت کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ غارمین میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں ہر مومن کے اس کی جان سے زیادہ قریب ہوں، جس کسی نے مال چھوڑا تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جس نے قرض یا عیال (فقیر اور محتاج اولاد) چھوڑے تو وہ میری طرف اور میرے ذمہ ہے“(1)۔

مسئلہ نمبر 22۔ قولہ تعالیٰ: وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس سے مراد جنگ لڑنے والے لشکری اور چھاؤنیوں کی جگہیں ہیں، انہیں وہ مال دیا جائے گا جو وہ اپنی جنگ میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ اغنیاء ہوں یا فقراء۔ یہ اکثر علماء کا قول ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کا ماحصل ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے ہیں۔ امام احمد اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے اسے ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ ان دونوں نے کہا ہے: سبیل اللہ حج ہے(2)۔ اور بخاری میں ہے: اور ابولاس سے ذکر کیا جاتا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم نے حج کے لیے صدقہ کے اونٹ پر سوار کیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا جاتا ہے: آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ سے (غلام) آزاد کرا سکتا ہے(3) اور حج میں دے سکتا ہے۔ ابو محمد عبد الغنی الحافظ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن خیاش نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا ابو غسان مالک بن یحییٰ نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا: یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا، انہوں نے کہا مہدی بن میمون نے محمد بن ابی یعقوب سے انہوں نے عبد الرحمن ابن ابی نعم سے اور ان کی کنیت ابو الحکم ہے، ہمیں خبر دی کہ انہوں نے کہا: میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے کہا: اے ابا عبد الرحمن! بے شک میرے خاوند نے اپنے مال کے بارے میں فی سبیل اللہ کے لیے وصیت کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس وہ اسی طرح ہے جیسے اس نے فی سبیل اللہ کہا ہے۔ تو میں نے ان کو کہا: جس بارے اس نے سوال کیا ہے تم نے اس کے لیے سوائے غم اور پریشانی کے کسی شے کا اضافہ نہیں کیا۔ انہوں نے فرمایا: اے ابن ابی نعم تو مجھے یہ مشورہ دے رہا ہے کہ میں اسے یہ حکم دیتا کہ وہ اپنا مال وصیت ان لشکروں کو دے دے جو نکلتے ہیں اور زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے ہیں۔ تو میں نے پوچھا: تو آپ اسے کیا حکم دو گے؟ انہوں نے فرمایا: میں اسے حکم دے رہا ہوں کہ وہ یہ مال صالحین کی جماعت کو دے۔ بیت اللہ الحرام کو حج کرنے والوں کو دے۔ وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ رحمن کا وفد ہیں، وہ شیطان کے وفد کی مثل نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ جملہ تین بار کہا۔ میں نے کہا: اے ابا عبد الرحمن! شیطان کا وفد کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ قوم ہے جو ان امراء پر داخل ہوتے ہیں اور ان کے پاس جا کر باتوں کی چغلی کھاتے ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں جھوٹی باتیں کرتے ہیں۔ پس انہیں انعامات دیئے جاتے ہیں اور اس پر انہیں عطایا دیئے جاتے ہیں اور محمد بن عبد الحکم نے کہا ہے: صدقہ کے مال سے گھوڑوں، ہتھیاروں اور دیگر تمام آلات جن کی جنگ میں ضرورت ہوتی ہے دیا جا سکتا ہے اور سرحد سے دشمن کو روکنے کے لیے، کیونکہ یہ سب کا سب جنگ کی راہ اور اس کی منفعت میں سے ہے۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل بن ابی حثمہ پر آنے والی آفت

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 285
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 969
3۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

میں اس فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لیے سو اونٹ عطا فرمائے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابو داؤد نے بشیر بن یسار سے بیان کیا ہے کہ انصار کا ایک آدمی جسے سہل بن ابی حثمہ کہا جاتا تھا اس نے انہیں خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے صدقہ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ بطور دیت دیئے (2) یعنی اس انصاری کی دیت جو خیبر میں قتل ہوا تھا۔ اور عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے صدقہ حلال ہوتا ہے، بلاشبہ یہ اس کے لیے حلال ہوتا ہے جس کے پاس اس کا مال موجود نہ ہو اور یہ مذہب امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور جمہور اہل عالم رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین نے کہا ہے: مجاہد کو صدقہ کا مال نہیں دیا جائے گا مگر جب کہ وہ فقیر ہو اور لشکر سے کٹ جانے والا ہو۔ اور یہ نص پر زیادتی ہے اور آپ کے نزدیک نص پر زیادتی نسخ کہلاتی ہے۔ اور نسخ ثابت نہیں ہوتا مگر قرآن کریم کے ساتھ یا خبر متواتر کے ساتھ اور وہ یہاں معدوم ہے (3)، بلکہ صحیح سنت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے اس کا خلاف ثابت ہے: ''کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہوتا سوائے پانچ کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے یا زکوۃ وصول کرنے والے عامل کے لیے یا اس آدمی کے لیے جس نے صدقہ کو اپنے مال سے خرید لیا ہو یا غارم (مقروض) کے لیے یا اس آدمی کے لیے جس کے پڑوس میں کوئی مسکین ہو اور وہ اس مسکین پر صدقہ کرے پھر وہ مسکین کسی غنی کو بطور ہدیہ دے دے'' (4)۔ اسے امام مالک رحمہ اللہ نے زید بن اسلم عن عطاء بن یسار سے مرسل ذکر کیا ہے اور معمر نے زید بن اسلم عن عطا بن یسار عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرفوع ذکر کیا ہے۔ پس یہ حدیث آیت کے معنی کے لیے مفسر ہے۔ اور یہ کہ بعض اغنیاء کے لیے صدقہ لینا جائز ہوتا ہے اور یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے لیے مفسر ہیں: ''صدقہ حلال نہیں کسی غنی کے لیے اور نہ کسی طاقت ور تندرست کے لیے'' (5)۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مجمل ہے اور یہ اپنے عموم پر نہیں ہے اس کی دلیل مذکورہ پانچ اغنیاء والی روایت ہے۔ اور ابن القاسم کہتے تھے: کسی غنی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ صدقہ میں سے ایسا مال لے جس سے جہاد میں وہ مدد حاصل کر سکتا ہے اور اسے فی سبیل اللہ خرچ کر سکتا ہے اور بلاشبہ یہ فقیر کے لیے جائز ہے۔ فرمایا: اور اسی طرح غارم (مقروض) بھی ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ صدقہ سے اتنا مال لے جس کے ساتھ وہ اپنا مال بچا سکتا ہو اور اس سے وہ اپنا قرض ادا کرے حالانکہ وہ اس (صدقہ) سے غنی ہو۔ فرمایا: جب مجاہد اپنے غزوہ میں محتاج ہو جائے حالانکہ وہ غنی تھا اس کا مال ہو جو اس سے غائب ہو (یعنی اس کے پاس موجود نہ ہو) تو وہ صدقہ میں سے کوئی شی نہ لے اور قرضہ لے لے اور پھر جب وہ اپنے شہر پہنچے تو اپنے مال سے اسے ادا کر دے۔ یہ سب کچھ ابن حبیب نے ابن القاسم سے ذکر کیا ہے اور انہوں نے یہ

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 969 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 266 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 269

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 231۔ ایضاً، حدیث نمبر 1393، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب لی تحل لہ الصدقۃ، حدیث نمبر 1830، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 231

گمان کیا ہے کہ ابن نافع وغیرہ نے اس بارے میں ان کی مخالفت کی ہے۔ ابوزید وغیرہ نے ابن قاسم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: زکوٰۃ سے غازی کو حصہ دیا جائے گا اگرچہ دوران جنگ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے کافی ہو اور وہ اپنے شہر میں غنی (دولت مند) ہو یہی صحیح ہے، کیونکہ ظاہر حدیث یہ ہے: ''سوائے پانچ کے کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہوتا'' (1)۔ اور ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ مال زکوٰۃ میں سے مجاہدین اور گھوڑے باندھنے کی جگہوں یا سرحد کے قریب ان کی حفاظت کے لیے چھاؤنیوں وغیرہ کے لیے دیا جائے گا چاہے وہ فقراء ہوں یا اغنیاء۔

مسئلہ نمبر 23۔ قولہ تعالیٰ: وَابْنِ السَّبِيْلِ سبیل کا معنی راستہ ہے اور مسافر کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اسے لازم پکڑنے والا ہوتا ہے اور اس کا گزر اس پر ہوتا ہے، جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

إن تسألوني عن الهوى فأنا الهَوَى وابن الهَوَى وأخو الهَوَى وأبوهُ

مراد یہ ہے کہ جب کسی نے اپنے شہر، اپنی قیام گاہ اور اپنے مال سے سفر اختیار کر لیا اور راستے میں اس کے اسباب ختم ہو گئے، تو مال زکوٰۃ میں سے اسے دیا جائے گا اگرچہ وہ اپنے شہر میں غنی ہو اور اس میں یہ لازم نہیں کہ اس کا ذمہ قرض حسنہ سے مشغول ہو۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سحنون کی کتاب میں کہا ہے: جب وہ ایسے آدمی کو پا لے جو اس کا قرض ادا کر دے گا تو پھر اسے مال زکوٰۃ میں سے نہ دیا جائے گا (2)۔ اور پہلا قول اصح ہے، کیونکہ اس کے لیے لازم نہیں ہے کہ وہ کسی ایک کے احسان کے نیچے داخل ہو حالانکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے احسان کو پا لیا ہے۔ اور اگر اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے غنی کر دے تو پھر ابن سبیل ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے مال زکوٰۃ لینے کے جواز میں دو روایتیں ہیں: مشہور یہ ہے کہ اسے مال زکوٰۃ نہیں دیا جائے گا۔ اور اگر اس نے لے لیا تو پھر اسے لوٹانا اس کے ذمہ لازم نہ ہو گا جب وہ اپنے شہر کی طرف جائے اور نہ بطور زکوٰۃ اسے (دیگر افراد کو دینا) اس پر لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 24۔ اگر کوئی آئے اور مذکورہ اوصاف میں سے کسی وصف کا دعویٰ کرے، تو کیا اس کا قول قبول کیا جائے گا یا نہیں اور اسے یہ کہا جائے گا کہ جو تو کہہ رہا ہے اسے ثابت کر؟ تو جہاں تک دین کا تعلق ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اسے ثابت کرے اور رہیں تمام صفات تو ظاہر حال اس کی شہادت دیتا ہے اور ان میں اسی پر اکتفا کر لیا جائے گا۔ اور اس پر دلیل دو صحیح حدیثیں ہیں۔ دونوں کو اہل الصحیح نے روایت کیا ہے اور یہی قرآن کریم کا ظاہر معنی بھی ہے۔ امام مسلم نے جریر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا: دن کے آغاز میں ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ فرمایا: پس ایک قوم آپ کے پاس حاضر ہوئی وہ پراگندہ حال، ننگے پاؤں، سیاہ و سفید دھاری دار قمیصیں یا عبائیں پہنے ہوئے تھے اور تلواریں لٹکائے ہوئے تھے، ان میں سے عام قبیلہ مضر سے تھے بلکہ وہ تمام کے تمام ہی مضر میں سے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مقدس اس وقت متغیر ہو گیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فاقہ کی حالت میں دیکھا، پس آپ اندر تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا پس انہوں نے اذان اور اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 231 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 970

پڑھی۔ پھر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ...... الآیہ تا قولہ...... رَقِیْبًا۝ (النساء) (اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں الخ)

اور وہ آیت جو سورۂ حشر میں ہے: وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر:18) (اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے کل کے لیے) ہر آدمی اپنے درہم و دینار میں سے، اپنے کپڑے میں سے اور اپنی گندم کے صاع میں سے صدقہ کرے، حتیٰ کہ فرمایا: اگرچہ وہ آدھی کھجور ہی ہو''۔ فرمایا: پس انصار میں سے ایک آدمی ایک تھیلی لے کر آیا جس سے اس کا پہلو جھکنے کے قریب تھا بلکہ وہ جھکا ہوا تھا، فرمایا: پھر لوگ لگاتار تسلسل کے ساتھ آنے لگے یہاں تک کہ میں نے وہاں کھانے پینے کی چیزوں کے دو ڈھیر لگے ہوئے دیکھے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا تو وہ چمک رہا تھا گویا کہ اس پر سونے کا طلاء کیا گیا ہو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہوگا اور اس کا اجر بھی جس نے اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان کے اجروں میں سے کوئی شے کم نہیں کی جائے گی اور جس نے اسلام میں برا طریقہ رائج کیا اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور اس کا بوجھ بھی جس نے اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا لیکن ان کے اپنے بوجھ اور گناہوں میں سے کسی شے کی کمی نہیں کی جائے گی'' (1)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہر حال پر اکتفاء کیا اور آپ نے صدقہ دینے پر برانگیختہ کیا اور ان سے کوئی گواہ طلب نہ کیا اور نہ اس کی چھان بین کی کہ کیا ان کے پاس مال ہے یا نہیں؟ اور اسی کی مثل ابرص، اقرع اور اعمٰی والی حدیث ہے جسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اور یہ ان کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک بنی اسرائیل میں ایک برص کا مریض، ایک گنجا اور ایک اندھا تھا پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ انہیں آزمائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا وہ پہلے برص والے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کون سی شی تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا خوبصورت رنگ اور اچھی جلد اور مجھ سے یہ بیماری دور ہو جائے جس کے سبب لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں، فرمایا: پس اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اس سے سارے داغ ختم ہو گئے اور اسے خوبصورت رنگ اور اچھی جلد عطا کر دی گئی۔ اس نے کہا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا اونٹ یا کہا گائیں، یہ شک اسحاق کو ہے، مگر یہ کہ برص والے یا گنجے میں سے ایک نے اونٹ کہا اور دوسرے نے گائے کہا۔ بیان کیا: پس اسے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی دے دی گئی اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھے اس میں برکت عطا فرمائے بعد ازاں وہ گنجے کے پاس آیا اور اس سے کہا: کون سی شے تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: خوبصورت بال اور وہ مجھ سے ختم ہو گئے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: پس اس نے اسے ہاتھ پھیرا تو اس سے گنجاپن دور ہو گیا اور اسے خوبصورت بال عطا کر دیئے گئے پھر اس نے پوچھا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ تو اس نے کہا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 327

گائے چنانچہ اسے حاملہ گائے عطا کر دی گئی اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرے لیے اس میں برکت عطا فرمائے۔ فرمایا: پھر وہ اندھے کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: کون سی شے تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے؟ اس نے کہا: یہ کہ اللہ تعالیٰ میری نظر مجھے واپس لوٹا دے کہ میں اس کے ساتھ لوگوں کو دیکھ سکوں۔ فرمایا: پس اس نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بصارت اسے واپس لوٹا دی، پھر اس نے پوچھا: کون سا مال تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: بکریاں پس اسے بچے جننے والی بکری عطا کر دی گئی۔ پس ان دونوں (گائے اور اونٹنی) اور اس بکری نے بچوں کو جنم دیا۔ فرمایا پس اس کے لیے اونٹوں کی ایک وادی ہوگئی اور دوسرے کے لیے گائیوں کی وادی ہوگئی اور تیسرے کے لیے بکریوں سے وادی بھر گئی۔ فرمایا: پھر وہ فرشتہ ایک اور صورت اور ہیئت میں اس برص والے کے پاس آیا اور کہا: میں مسکین آدمی ہوں میرے پاس اسباب سفر ختم ہو چکے ہیں آج میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ اور تیرے کوئی نہیں ہے میں تجھ سے اس ذات کے وسیلہ سے مانگ رہا ہوں جس نے تجھے حسین رنگ، خوبصورت جلد اور اونٹوں کی صورت میں مال عطا فرمایا کیا تو میرے اس سفر میں اس میں سے کچھ معاونت کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: حقوق بہت زیادہ ہیں۔ تو اس نے اسے کہا: میں تجھے پہچانتا ہوں کیا تو برص زدہ نہ تھا لوگ تجھے فقیر ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تجھے (یہ مال) عطا فرمایا؟ تو اس نے جواب دیا: بلاشبہ میں تو اپنے جد اعلیٰ کی جانب سے پشت در پشت اس مال کا وارث ہوں۔ تو اس نے کہا: اگر تو جھوٹ بول رہا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تجھے اسی حالت پر کر دے جس پر تو پہلے تھا، پھر وہ گنجے کے پاس اپنی صورت میں آیا اور اس سے اسی طرح کی گفتگو کی جیسے اس پہلے سے کی تھی، تو اس نے بھی اسے اس پہلے کی طرح جواب دیا تو اس (فرشتے) نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ تجھے اسی حالت پر کر دے جس پر تو پہلے تھا۔ فرمایا: پھر وہ اپنی اسی صورت اور ہیئت میں اندھے کے پاس آیا اور کہا: میں مسکین اور ابن سبیل (مسافر) آدمی ہوں مجھ سے میرے اسباب سفر منقطع ہو گئے پس آج میرے لیے سوائے اللہ تعالیٰ اور تیرے کوئی سہارا نہیں میں تجھ سے اس ذات کے وسیلہ سے مانگ رہا ہوں جس نے تجھے بصارت اور بکریاں عطا فرمائیں کیا تو ان کے ساتھ میرے سفر میں کوئی معاونت کر سکتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تحقیق میں اندھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف میری بصارت لوٹا دی تو جو چاہے لے لے اور جو چاہے چھوڑ دے قسم بخدا! آج کے دن میں تجھے کسی مشقت میں نہیں ڈالوں گا تو اسے اللہ تعالیٰ کے نام پر لے لے تو اس نے کہا: تو اپنا مال اپنے پاس رکھ، کیونکہ تم آزمائے گئے تجھ سے رضا اور خوشی حاصل ہوئی اور تیرے دونوں ساتھیوں پر ناراضگی ہوئی"(1)۔ اس میں اس پر بڑی واضح دلیل ہے کہ جس نے اپنے فقیر پر زیادتی کا دعویٰ کیا عیال یا غیر عیال وغیرہ کا تو اس سے کوئی شواہد نہیں لیے جائیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے یہ کہا کہ اس سے شواہد لیے جائیں گے اگر وہ قادر ہو، کیونکہ حدیث میں ہے "کہ ایک مسکین آدمی اور ابن سبیل (مسافر) نے کہا میں تجھ سے بکری کا سوال کرتا ہوں" تو وہ اسے سفر ثابت کرنے کا مکلف اور پابند نہ بنائے اور رہا مکاتب تو وہ کتابت ثابت کرنے کا پابند ہوگا، کیونکہ اس میں غلامی اصل ہے یہاں تک کہ حریت (آزادی) ثابت ہو جائے (2)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 2، صفحہ 408 2۔ احکام القرآن لابن العربی

مسئلہ نمبر 25۔ زکوٰۃ کی رقم اسے دینا جائز نہیں ہوتا جس کا نفقہ (خرچہ) آدمی کے ذمہ لازم ہوتا ہے اور وہ والدین، اولاد اور بیوی ہے اور اگر امام وقت نے کسی آدمی کا صدقہ اس کی اولاد، اس کے والدین اور اس کی بیوی کو دے دیا تو یہ جائز ہے۔ اور اگر اس نے یہ بذات خود دیا تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس طرح وہ اپنے آپ سے ایک فرض ساقط کر دیتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کوئی آدمی مال زکوٰۃ اپنے پوتے، اپنے نواسے کو نہیں دے سکتا اور نہ ہی وہ اپنے مکاتب غلام، مدبر غلام، ام ولد لونڈی (اور لونڈی جس سے آقا کی اولاد ہو جائے) اور وہ غلام جس کا نصف حصہ اس نے آزاد کر رکھا ہو کو دے سکتا ہے''۔ کیونکہ اسے فقیر کو (سوال سے) روکنے کے واسطہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زکوٰۃ دینے اور نکالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور املاک کے منافع اس کے اور ان کے درمیان مشترک ہیں، اسی وجہ سے ان میں سے بعض کی شہادت بعض کے لیے قبول نہیں کی جاتی۔ فرمایا: مکاتب وہ غلام ہے جس پر ابھی ایک درہم بھی باقی ہو (1) اور بسا اوقات وہ عاجز ہوتا ہے اور کمائی اس کے لیے ہو جاتی ہے۔ وہ غلام جس کا بعض حصہ آزاد کیا گیا ہو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مکاتب کے قائم مقام ہے۔ اور صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک وہ اس آزاد کے قائم مقام ہے جس پر قرض ہو پس اسے زکوٰۃ دینا جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 26۔ اور اگر زکوٰۃ انہیں دی جن کا نفقہ اس کے ذمہ لازم نہیں تو پھر اس میں اختلاف ہے۔ پس ائمہ میں سے بعض نے اسے جائز قرار دیا ہے اور بعض نے اسے مکروہ کہا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں تعریف کا خوف ہے۔ اور مطرف نے بیان کیا ہے: میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زکوٰۃ اپنے اقارب کو دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور واقدی نے کہا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: افضل ترین آدمی جسے تو اپنی زکوٰۃ دے سکتا ہے وہ تیرے وہ رشتہ دار ہیں جن کا تو محتاج نہ ہو۔ تحقیق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ کو فرمایا: ''تیرے لیے دو اجر ہیں ایک قرابت کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر''۔ عورت کا اپنی زکوٰۃ اپنے خاوند کو دینے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس ابن حبیب سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ کے بارے میں اس مال سے مدد لیتے تھے جو وہ انہیں (بطور زکوٰۃ) دیتی تھیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے، لیکن صاحبین نے ان سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: یہ جائز ہے۔ اور یہی اصح ہے، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی: بے شک میں اپنے خاوند پر صدقہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں کیا وہ میرے لیے جائز ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں تیرے لیے دو اجر ہوں گے ایک صدقہ کا اجر اور دوسرا قرابت کا اجر'' (2)۔

اور صدقہ مطلقہ سے مراد زکوٰۃ ہے اور اس لیے بھی کہ اس پر خاوند کا نفقہ لازم نہیں ہے، پس وہ اجنبی آدمی کے قائم مقام ہو گئی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ان دونوں کے درمیان املاک کے منافع مشترک ہیں، یہاں تک کہ ان دونوں میں سے ایک کی شہادت دوسرے کے لیے قبول نہیں کی جاتی۔ اور حدیث طیبہ کو نفلی صدقہ پر محمول کیا جائے گا۔

1۔ سنن ابی داود، باب فی المکاتب، حدیث نمبر 3425، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

امام شافعی، ابوثور اور اشہب رحمہم اللہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، جب کہ وہ اسے عورت کی طرف اس مال (نفقہ) میں خرچ نہ کرے جو مرد پر اس کے لیے لازم ہوتا ہے۔ بے شک وہ اسے اپنے نفقہ اور لباس میں اپنی ذات پر خرچ کر سکتا ہے جو وہ اس سے لیتا ہے اور اس پر اپنے مال سے خرچ کرے گا۔

مسئلہ نمبر 27۔ دی جانے والی مقدار میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے، پس غارم (مقروض) کو اس کے قرضے کی مقدار کے برابر دیا جائے گا اور فقیر اور مسکین کو ان کی کفایت اور ان کے اہل وعیال کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا۔ نصاب کے برابر یا اس سے کم مقدار میں دینے کے جواز میں اختلاف ہے اور اس کا دارومدار اس سابقہ اختلاف پر ہے جو فقر کی تعریف میں ہے جس کے ساتھ اس کے لیے صدقہ لینا جائز ہوتا ہے۔

علی بن زیاد اور ابن نافع نے بیان کیا ہے: اس میں کوئی مقرر حد نہیں ہے، بلکہ اس کا انحصار والی کے اجتہاد پر ہے۔ کبھی کبھی مساکین قلیل ہوتے ہیں اور صدقہ زیادہ ہوتا ہے پس ایک فقیر کو سال بھر کی خوراک دے دی جائے گی۔ اور مغیرہ نے بیان کیا ہے: نصاب سے کم مقدار دی جائے گی اور اسے نصاب تک نہیں پہنچایا جائے گا۔ اور بعض متاخرین نے کہا ہے: اگر شہر میں دو زکاتیں ہوں ایک نقد (درہم و دینار) اور دوسری حرث (عشر وغیرہ) تو وہ اتنی لے لے جو اسے دوسری تک پہنچا دے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ نصاب کی مقدار زکوٰۃ دے دے اگرچہ شہر میں دو یا اس سے زیادہ زکاتیں ہوں، کیونکہ غرض فقیر کو غنی کرنا ہے یہاں تک کہ وہ غنی ہو جائے۔ پس جب اس نے ایک لے لی تو اگر دوسری زکوٰۃ کا وقت آ گیا اور اس کے پاس اتنی مقدار ہو جو اسے کافی ہو تو اسے کوئی دوسرا لے لے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: نصاب کے برابر دینے میں یہ اصحاب الرائے کا مذہب ہے، تحقیق اسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواز کے ساتھ ساتھ مکروہ قرار دیا ہے اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ فرمایا: کیونکہ بعض اپنی حاجت کی وجہ سے فی الحال مشغول ہوتے ہیں۔ پس فی الحال اس کی حالت سے فالتو دوسو سے کم ہو اور جب اس نے اسے مجموعی طور پر دوسو سے زیادہ دیئے اور فی الحال اس کی حاجت سے فالتو دوسو کی مقدار ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ اور متاخرین حنفیہ میں سے بعض نے کہا ہے: یہ تب ہے جب اس کے اہل وعیال نہ ہوں اور نہ اس پر قرض ہو اور اگر اس پر قرض ہو تو پھر اسے دوسو یا اس سے زیادہ اتنی مقدار دینے میں کوئی حرج نہیں جس کے ساتھ اگر وہ اپنا قرض ادا کر دے تو اس کے پاس باقی دوسو سے کم رہ جائے۔ اور اگر وہ عیال دار ہو تو اسے اتنی مقدار دینے میں کوئی حرج نہیں کہ اگر وہ اسے اپنے بچوں پر تقسیم کرے تو ان میں سے ہر ایک کو دوسو سے کم ملے، کیونکہ اس پر صدقہ کرنا معنوی طور پر اس پر اور اس کے اہل وعیال پر صدقہ کرنا ہے۔ اور یہ اچھا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 28۔ تو جان کہ قول باری تعالیٰ: لِلْفُقَرَآءِ مطلق ہے اس میں نہ کوئی شرط ہے اور نہ کوئی قید، بلکہ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جملہ فقراء پر خرچ کرنا جائز ہے چاہے وہ بنی ہاشم میں سے ہوں یا ان کے سوا ہوں، مگر سنت کئی شروط کے اعتبار کے ساتھ وارد ہے۔ ان میں سے یہ ہے کہ وہ بنی ہاشم میں سے نہ ہوں اور وہ ان میں سے بھی نہ ہوں جن کا نفقہ صدقہ

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 973

کرنے والے پر لازم ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ کمانے کی قوت نہ رکھتا ہو، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی غنی کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے اور نہ ہی کسی طاقتور صحیح الاعضاء کے لیے" (1)۔ اس بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

اور مسلمان علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ فرضی صدقہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لیے حلال نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ہاشمی کا ہاشمی کو صدقہ دینا جائز ہے، اسے الکیا طبری نے بیان کیا ہے۔ اور بعض اہل علم نے اس سے علیحدگی اختیار کی ہے اور کہا: بے شک بنی ہاشم کے اموال پر صدقات میں سے کوئی شے حرام نہیں۔ اور یہ اختلاف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع کے غلام کو کہا تھا: "بے شک کسی قوم کا مولیٰ انہیں میں سے ہوتا ہے" (2)۔

مسئلہ نمبر 29۔ بنی ہاشم کے لیے نفلی صدقہ کے جائز ہونے میں اختلاف ہے۔ پس وہ نظریہ جس پر جمہور اہل علم ہیں اور وہی صحیح ہے ... کہ نفلی صدقہ بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لیے جائز ہے، دینے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرات علی، عباس اور فاطمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے صدقہ کیا اور بنی ہاشم کی جماعت پر ہی اسے وقف رکھا۔ اور ان کے صدقات موقوفہ معروف و مشہور ہیں۔ اور ابن ماجشون، مطرف، اصبغ اور ابن حبیب نے کہا ہے: بنو ہاشم کو نہ فرضی صدقہ میں سے کچھ دیا جائے گا اور نہ نفلی صدقہ میں سے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: بنو ہاشم کو نفلی صدقہ دیا جا سکتا ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: وہ حدیث جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: "آل محمد کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے"۔ بلاشبہ وہ نفلی زکوٰۃ کے بارے ہی ہے (3)۔ اور اس قول کو ابن خویز منداد نے اختیار کیا ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن القاسم نے کہا ہے: اور ان کے موالی کو دونوں صورتوں میں سے دیا جا سکتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے "الواضحہ" میں کہا ہے: نفلی صدقہ میں سے آل محمد کو نہیں دیا جائے گا۔ ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا: تو ان کے موالی کو؟ انہوں نے فرمایا: میں نہیں جانتا موالی کیا ہیں؟ تو میں نے ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے استدلال کیا: "کسی قوم کا مولیٰ انہیں میں سے ہوتا ہے" (4)۔ تب کہا تحقیق آپ نے کہا ہے: "کسی قوم کا بھانجا انہیں میں سے ہے۔ اصبغ نے کہا ہے: یہ حکم نیکی اور حرمت میں ہے (5)۔

مسئلہ نمبر 30۔ قولہ تعالیٰ: فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ یہ سیبویہ کے نزدیک مصدر کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فرض اللہ الصدقات فریضۃ (اللہ تعالیٰ نے یقیناً صدقات فرض کیے ہیں) اور امام کسائی کے قول کے مطابق قطع کی بنا پر رفع بھی جائز ہے، یعنی ھن فریضۃ۔ زجاج نے کہا ہے: میں نہیں جانتا کہ اسے اس کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابراہیم بن عبلہ نے اس کو (رفع) کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے خبر بنایا ہے جیسا کہ آپ کہتے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83 2۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 366 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 974
4۔ صحیح بخاری، کتاب الفرائض، جلد 2، صفحہ 1000 5۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 974

ہیں: انما زید خارج۔

وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو (اپنی بدزبانی سے) اذیت دیتے ہیں نبی (کریم) کو اور کہتے ہیں یہ کانوں کا کچا ہے۔ فرمایئے وہ سنتا ہے جس میں بھلا ہے تمہارا، یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مومنوں (کی بات) پر اور سراپا رحمت ہے ان کے لیے جو ایمان لائے تم میں سے اور جو لوگ دکھ پہنچاتے ہیں اللہ کے رسول کو ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ منافقین میں سے کچھ تھے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کے لیے غیبت اور تصدم کی زبان لمبی کرتے تھے اور کہتے تھے: اگر آپ نے مجھے جھڑکا تو میں قسم اٹھادوں گا کہ میں نے یہ نہیں کہا ہے، تو آپ اسے قبول کرلیں گے، کیونکہ آپ کانوں کے کچے ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل اذن جب وہ آدمی ہر ایک کی بات سنتا ہو۔ اس میں واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں۔ اور علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: هُوَ اُذُنٌ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: وہ آدمی جو سننے والا اور قبول کرنے والا ہو۔ یہ آیت عتاب بن قشیر کے بارے میں نازل ہوئی، اس نے کہا: بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سنتے ہیں اور ہر اس بات کو قبول کرتے ہیں جو انہیں کہی جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نبتل بن حارث تھا۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ نبتل عظیم الجثہ آدمی تھا اس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ اور بکھرے ہوئے تھے، رنگ گندمی تھا، آنکھیں سرخ تھیں، رخسار سرخی مائل سیاہ رنگ کے تھے اور وہ بہت بدشکل تھا اور یہ وہی ہے جس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شیطان کو دیکھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ نبتل بن حارث کو دیکھ لے''(1)۔ السفعة (ضمہ کے ساتھ) ایسی سیاہی جس میں سرخی کی آمیزش ہو۔ اور الرجل أسفع (ایسا آدمی جس کا رنگ سیاہ سرخی مائل ہو) یہ جوہری کے نزدیک ہے اور اذن ذال کے ضمہ اور سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ، ای هو أذن خیر لا أذن شر یعنی وہ خیر اور بھلائی کی بات سنتا ہے اور شر اور برائی کی نہیں سنتا۔ اور قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ رفع اور تنوین کے ساتھ حسن اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اضافت کے ساتھ اور حمزہ نے رحمة کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے أذن پر عطف کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور تقدیر کلام ہے: قل هو أذن خير وهو رحمة یعنی وہ خیر اور بھلائی سننے والا ہے شر سننے والا نہیں، یعنی وہ اسے سنتا ہے جس کا سننا وہ پسند کرتا ہے اور وہ رحمت ہے۔ اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ خير پر عطف کی وجہ سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اہل عربیہ کے نزدیک بعید ہے، کیونکہ اس

1۔ اسباب النزول، صفحہ 130، دار الکتب العلمیہ بیروت

کا دو اسموں کے درمیان ہونا بعید ہے اور مخفوض (مجرور) میں قبیح ہوتا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: اور جس نے رحمۃ کو جر دی ہے تو وہ خیر پر عطف کی بنا پر ہے اور معنی ہے خیر کو سننے والا اور رحمت کو سننے والا، کیونکہ رحمۃ خیر اور بھلائی میں ہی ہے اور رحمت کا عطف المومنین پر کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا معنی بنتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین رکھتا ہے اور مومنین کی تصدیق کرتا ہے۔ تو کوفیوں کے قول کے مطابق اس میں لام زائدہ ہے اور اس کی مثال لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ۝ (الاعراف) ای یرهبون ربهم (وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں) اور ابو علی نے کہا ہے: اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے رَدِفَ لَكُمْ (النمل: 72) اور یہ مبرد کے نزدیک اس مصدر کے متعلق ہے جس پر فعل دلالت کرتا ہے، تقدیر عبارت ہے: ایمانه للمؤمنین یعنی اس کا مومنین کی تصدیق کرنا نہ کہ کفار کی یا یہ اس معنی پر محمول ہوگا کیونکہ یؤمن کا معنی یصدق (تصدیق کرنا) ہے پس اسے لام کے ساتھ متعدی کیا گیا جیسا کہ اس قول میں لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (آل عمران: 3)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝

”(منافق) قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی تمہارے سامنے تاکہ خوش کریں تمہیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی کریں اگر وہ ایمان دار ہیں“۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ منافقین کی ایک قوم جمع ہوئی، ان میں جلاس بن سوید، ودیعہ ابن ثابت تھے اور ان میں انصار کا غلام بھی تھا جسے عامر بن قیس پکارا جاتا تھا، تو انہوں نے اسے بہت حقیر قرار دیا اور گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا: اگر وہ حق ہے جو محمد (مصطفی ﷺ) کہتے ہیں تو یقیناً ہم گدھوں سے زیادہ شریر ہیں۔ تو وہ غلام غضب ناک ہو گیا اور اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ جو وہ کہتے ہیں وہ حق ہے اور تم گدھوں سے زیادہ شریر ہو، پھر اس نے ان کے قول کے بارے حضور نبی مکرم ﷺ کو خبر دی، تو انہوں نے قسم اٹھا دی کہ عامر جھوٹا ہے، تو عامر نے کہا: وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور اس پر اس نے قسم کھائی اور کہا: اے اللہ! تو ہمیں متفرق نہ کرنا یہاں تک کہ سچ بولنے والے کا سچ اور جھوٹ بولنے والے کا جھوٹ واضح اور ظاہر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس میں ہے: يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور سیبویہ کا مذہب ہے کہ تقدیر عبارت ہے: واللہ أحق أن یرضوہ ورسولہ أحق أن یرضوہ (حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے راضی کریں اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتا ہے کہ وہ اسے راضی کریں) پھر اس سے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ بعض نے کہا ہے:

نحن بما عندنا وأنت بما　عندك راضٍ والرأيُ مختلِفُ(2)

ہم اس کے ساتھ جو ہمارے پاس ہے اور تو اس کے ساتھ جو تیرے پاس ہے راضی ہیں اور رائے مختلف ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 130　2۔ المحرر الوجیز، جلد 11، صفحہ 53

اور محمد بن یزید نے کہا ہے: کلام میں کوئی عبارت محذوف نہیں ہے اور تقدیر عبارت واللہ أحق أن یرضوہ و رسولہ (اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے راضی کریں اور اس کے رسول کو) یہ تقدیم و تاخیر کی بنا پر ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے و رسولہ أحق أن یرضوہ اور لفظ اللہ افتتاح کلام میں ہے، جیسے تو کہتا ہے: ما شاء اللہ و شئت (جو اللہ تعالیٰ چاہے اور تو چاہے) نحاس نے کہا ہے: سیبویہ کا قول ان میں سے اولیٰ ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں اس سے نہی وارد ہے کہ یہ کہا جائے: ماشاء اللہ و شئت اور کسی شی میں تقدیم و تاخیر مقدر نہیں کی جاسکتی اور اس کا معنی صحیح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں، کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کو ان کی رضا میں رکھا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ اس نے فرمایا ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: 80) (جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی) اور ربیع بن خثیم جب اس آیت سے گزرتے تو وقف کرتے اور کہتے: ایک حرف ہے اور کتنا ہی شاندار حرف ہے، ان کے سپرد کر دیا گیا ہے پس وہ ہمیں خیر کے سوا کوئی حکم نہیں دیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ آیت قسم کھانے والے کی قسم کو قبول کرنے کو متضمن ہے اگرچہ محلوف لہ کی رضامندی لازم نہیں اور قسم مدعی کا حق ہے۔ اور یہ اس کو متضمن ہے کہ قسم اللہ تعالیٰ کی ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو قسم اٹھائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے اور وہ جس کے لیے قسم اٹھاتا ہے پس اسے چاہیے کہ وہ اس کی تصدیق کرے'' (1)۔ قسم اور اس میں استثنا کے متعلق مکمل بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۳﴾

''کیا وہ نہیں جانتے کہ جو کوئی مخالفت کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو اس کے لیے آتش جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں یہ بہت بڑی رسوائی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا یعنی کیا وہ منافق نہیں جانتے۔ ابن ہرمز اور حسن نے تعلموا صیغہ خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ انہ یہ یعلموا کے سبب محل نصب میں ہے۔ اور ہا، حدیث یعنی گفتگو سے کنایہ ہے۔ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ، مَنْ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور المحادۃ اس کا معنی ہے اس کا اس کی حد میں داخل ہونا اور اس کا اس کی حد میں واقع ہونا، جیسا کہ المشاقۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: حاد فلان فلانا یعنی فلاں اپنی حد کے سوا دوسرے کی حد میں داخل ہو گیا۔ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ کہا جاتا ہے: شرط میں فا کا مابعد مبتدا ہے۔ پس واجب ہے کہ فان ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہو۔ تحقیق خلیل اور سیبویہ نے فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ میں ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: اور یہ جید اور عمدہ ہے اور یہ شعر بھی کہا ہے:

وعلمي بأسدام المياه فلم تزل   قلائص تخدي في طريق طلائح

1۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 983

وأني إذا ملّت ركابي مُناخها	فإني على حظّي من الأمر جامحُ

مگر عام قراءت فان ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پس خلیل نے بھی اور سیبویہ نے کہا ہے: بے شک أنّ ثانیہ پہلے سے بدل ہے (1)۔ اور مبرد کا گمان ہے کہ یہ قول مردود ہے اور صحیح وہ ہے جو جرمی نے کہا ہے، انہوں نے کہا: بے شک دوسرا أنّ تو کید کے لیے مکرر لایا گیا ہے کیونکہ کلام طویل ہو گیا اور اس کی نظیر وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿﴾ (النمل) ہے اور اسی طرح فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا (الحشر: 17) ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فوجوب النار له پس آگ کا وجوب اس کے لیے ہے۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: یہ اس وجہ سے غلط ہے بے شک أنّ مفتوحہ مشددہ سے ابتدا نہیں کی جا سکتی اور خبر کو مضمر کیا جا رہا ہے۔ اور علی بن سلیمان نے کہا ہے: اس کا معنی ہے فالواجب أن له نار جهنم پس واجب ہے کہ اس کے لیے جہنم کی آگ ہو، کیونکہ دوسرا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر کلام ہے فله أنّ له نار جهنم کیونکہ اسے فا اور ان کے درمیان ضمیر مجرور کی بنا پر ظرف مستقر کے ساتھ رفع دیا گیا ہے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''ڈرتے رہتے ہیں منافق کہ کہیں نازل (نہ) کی جائے اہل ایمان پر کوئی سورت جو آگاہ کر دے انہیں جو کچھ منافقوں کے دلوں میں ہے، آپ (انہیں) فرمایئے کہ مذاق کرتے رہو یقیناً اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم خوفزدہ ہو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ یہ خبر ہے اور امر نہیں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ خبر ہے اس کی جو اس کے بعد اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ہے کیونکہ انہوں نے عناد کی وجہ سے کفر اختیار کیا اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ منافقوں میں سے ایک نے کہا: میں تو پسند کرتا ہوں اگر مجھے آگے لایا جائے اور سو کوڑے مجھے مارے جائیں لیکن ہمارے بارے میں کوئی ایسی شے نازل نہ ہو جو ہمیں رسوا کر دے (2)۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یحذر بمعنی یتحرز وہ بچتے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے چاہیے کہ وہ ڈرے، پس یہ امر ہے (3)، جیسے کہا جاتا ہے: یفعل ذالك (چاہیے کہ وہ کرے)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ اس میں أنْ محل نصب میں ہے۔ یعنی مِن أنْ تنزل اور سیبویہ کے قول کی بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ یہ من کے حذف ہونے کی بنا پر محل جر میں ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یحذر کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہو (4)، کیونکہ سیبویہ نے اسے جائز قرار دیا ہے: حذرت زیدا اور یہ شعر بھی بیان کیا ہے:

حَذِرٌ أمورا لا تَضِير و آمِنٌ	ما ليس مُنْجِيه من الأقدار

اور مبرد نے اسے جائز نہیں قرار دیا، کیونکہ حذر (ڈرنا) ہیئت میں ایک شی ہے۔ اور علیہم کا معنی ہے علی المؤمنین۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 54	2۔ اسباب النزول، صفحہ 130	3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 54	4۔ ایضاً

سورۃ یعنی ایسی سورت جو منافقین کی شان میں ہو جو انہیں ان کی عداوت و دشمنی، ان کی برائی اور ان کے عیوب و نقائص کے بارے آگاہ کردے۔ اسی وجہ سے اس کا نام الفاضحہ المثیرہ اور المبعثرۃ کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: مسلمان اس سورت کو الحفارۃ کا نام دیتے تھے، کیونکہ جو کچھ منافقین کے دلوں میں تھا اس نے اسے کھود کر ظاہر کر دیا۔

مسئلہ نمبر3۔ قولہ تعالیٰ: قُلِ اسْتَهْزِءُوْا یہ امر وعید اور تہدید کے لیے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ بے شک اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ مَّا تَحْذَرُوْنَ اسے جس کے ظاہر ہونے سے تم ڈرتے ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اسماء نازل کیے اور وہ ستر آدمی تھے، پھر رافت و رحمت کے سبب انہیں قرآن کریم سے مٹا دیا، کیونکہ ان کی اولاد مسلمان تھی اور لوگ آپس میں ایک دوسرے کو عار دلاتے رہتے ہیں، پس اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اسے ظاہر کر کے پورا فرما دیا جب کہ ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کے ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے احوال اور ان کے اسماء سے آگاہ کر دیا نہ یہ کہ وہ قرآن کریم میں نازل ہوئے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد:30) (اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے) اور یہ الہام کی قسم ہے۔ اور منافقین میں سے کچھ متردد تھے نہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کا اعتقاد رکھتے تھے اور نہ آپ کی تصدیق کا اور ان میں بعض وہ تھے جو آپ کی سچائی کو پہچانتے تھے اور آپ کے ساتھ عناد رکھتے تھے۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶۵

"اور اگر آپ دریافت فرمائیں ان سے تو کہیں گے: بس ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ آپ فرمایئے (گستاخو!) کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسول سے تم مذاق کیا کرتے تھے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر1۔ یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی۔ علامہ طبری وغیرہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: اس اثنا میں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی طرف چل رہے تھے آپ کے آگے منافقوں کی ایک جماعت بھی چل رہی تھی تو انہوں نے کہا: تم دیکھو، یہ شام کے محلات فتح کرتا ہے اور بنی الاصفر کے قلعے لیتا ہے! تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع کر دیا جو ان کے دلوں میں تھا اور جس کے بارے وہ بات کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس جماعت کو میرے لیے روک لو"۔ پھر آپ ان کے پاس آئے اور فرمایا: "تم نے اس اس طرح کہا ہے"۔ تو انہوں نے قسمیں اٹھا دیں: ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے، ان کا ارادہ یہ تھا کہ ہم اس معاملہ میں سنجیدہ نہ تھے۔ اور علامہ طبری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے یہ بات کرنے والے ودیعہ بن ثابت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے تنگ کے ساتھ چمٹے ہوئے دیکھا وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے

اور وہ کہتا تھا: بلاشبہ ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (1) (کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسولوں سے تم مذاق کیا کرتے تھے) اور نقاش نے ذکر کیا ہے کہ یہ لٹکنے والا عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ اسی طرح قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ وہ تبوک میں حاضر نہ تھا۔ قشیری نے کہا ہے: اور کہا گیا ہے بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ودیعہ بن ثابت کے لیے ہے'' اور وہ منافقین میں سے تھا اور وہ غزوۂ تبوک میں حاضر تھا۔ اور الحوض کا معنی ہے پانی میں داخل ہونا، پھر یہ ہر اس دخول میں استعمال کیا گیا جس میں تلویث اور اذیت ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے: یہ اس سے خالی نہیں ہے کہ اس بارے میں جو انہوں نے کہا ہے وہ سنجیدہ ہو یا تمسخر اور مذاق ہو، وہ جس حالت میں بھی تھا وہ کفر تھا، کیونکہ کفر کے ساتھ تمسخر کرنا بھی کفر ہے اس میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ تحقیق أخو العلم والحق ہے اور ٹھٹھا مذاق أخو الباطل والجهل (2) ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھ: اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (البقرہ) (کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ نے کہا: میں پناہ مانگتا ہوں خدا کی اس سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں)

مسئلہ نمبر 3۔ تمام احکام میں مثلاً بیع، نکاح اور طلاق وغیرہ میں ہزل (ٹھٹھا، مذاق) میں علماء کا اختلاف ہے اور اس میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے: مطلقاً حکم لازم نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ ہے کہ مطلق حکم لازم ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ بیع وغیرہ کے درمیان اختلاف ہے۔ اور نکاح، طلاق میں حکم لازم ہو جاتا ہے۔ اور یہ طلاق میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے۔ اور بیع میں حکم لازم نہیں ہوتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب عہد میں کہا ہے: ہازل کا نکاح لازم ہو جاتا ہے۔ اور ابوزید نے ابن القاسم سے العتبیہ میں کہا ہے: وہ لازم نہیں ہوگا۔ اور علی بن زیاد نے کہا ہے: پہلے اور بعد اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اور ہازل کی بیع کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے علماء سے دو قول ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ابن المنذر نے بیان کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ طلاق سنجیدہ حالت میں ہو یا مذاق کی حالت میں دونوں برابر ہیں (یعنی دونوں حالتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی)۔ اور ہمارے اصحاب میں سے بعض متاخرین نے کہا ہے: اگر دونوں فریق نکاح اور بیع کی صورت میں ہزل (تمسخر) پر متفق ہوں تو پھر وہ لازم نہ ہوگا اور اگر ان کے درمیان اختلاف ہو تو پھر سنجیدگی ہزل پر غالب ہوگی (3)۔ اور ابوداؤد، ترمذی اور دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں ہیں جن میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں تمسخر و مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ) نکاح، طلاق اور رجعت ہیں'' (4)۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور دیگر اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 195　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 976　3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 977

4۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142۔ سنن ابی داؤد، باب فی الطلاق علی الهزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح حدیث میں والرجعة کے الفاظ ہیں۔ اور مؤطا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن سعید سے اور انہوں نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تین چیزیں ہیں جن میں لعب اور خوش طبعی نہیں ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتق (آزاد کرنا) ہیں (1)۔ اور اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ان تمام نے کہا: تین چیزیں ہیں جن میں نہ لعب ہے (اور نہ ان میں رجوع ہے) ان میں خوش طبعی کرنے والا بھی سنجیدگی سے کرنے والا شمار ہوگا (اور وہ) نکاح، طلاق اور عتق ہیں۔ اور حضرت سعید بن مسیب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: چار چیزیں ہیں جو ہر ایک پر جائز ہیں عتق (آزاد کرنا) طلاق، نکاح اور نذر ماننا۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تین چیزیں ہیں جن میں کوئی لعب اور خوش طبعی نہیں ہے اور وہ نکاح، طلاق اور نذر ماننا ہیں۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

"(اب) بہانے مت بناؤ، تم کافر ہو چکے (اظہار) ایمان کے بعد، اگر ہم معاف بھی کر دیں ایک گروہ کو تم سے تو عذاب دیں گے دوسرے گروہ کو کیونکہ وہی (اصلی) مجرم تھے"۔

قولہ تعالیٰ: لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ یہ زجر و توبیخ کے انداز میں (نہی) ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: تم وہ نہ کرو جو نفع بخش نہ ہوگا، پھر ان پر کفر اور گناہ سے معذرت (اور توبہ) نہ کرنے کا حکم لگا دیا۔ اس میں اعتذر بمعنی اعذر ہے اسی صار ذا عذر یعنی وہ عذر والا ہو گیا۔ لبید نے کہا ہے:

ومَنْ يَبْكِ حَوْلًا كاملا فقد اعتذر

اور جو پورا سال روتا رہا تحقیق اس نے عذر پیش کر دیا۔

اور الاعتذار کا معنی ہے: موجود شے کا اثر (نشان) مٹا دینا۔ کہا جاتا ہے: اِعتذرتِ المنازل منزلیں مٹ گئیں (ختم ہو گئیں) اور الاعتذار کا معنی الدروس (مٹانا) ہے۔ شاعر کا قول ہے۔

أم كنتَ تعرِفُ آياتٍ فقد جعلتْ أطلالُ إلْفِك بالوَدْكاءِ تَعتذِرُ

اور ابن اعرابی نے کہا ہے: اس کا اصل معنی ہے کاٹ دینا۔ اور اِعتذرت إليه کا معنی ہے میں نے وہ سب کاٹ دیا (ختم کر دیا) جو اس کے دل میں پایا جا رہا تھا۔ اور اسی سے عذرة الغلام ہے یعنی وہ چمڑا جو بچے کے ختنہ کے وقت کاٹ دیا جاتا ہے۔

اور اسی سے عذرة الجاریہ بھی ہے کیونکہ اس کے کنوارپن کی مہر کو کاٹ دیا جاتا ہے (مراد پردہ بکارت کو زائل کرنا ہے)۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ کہا گیا ہے: یہ تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو نے استہزاء کیا اور ایک ہنسا۔ پس ان میں سے جسے معاف کیا گیا وہ وہی ہے جو ہنسا اور اس نے کوئی بات نہ کی۔ اور

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 510

الطائفة سے مراد جماعت ہے۔ اور نفس معنی کی بنا پر واحد کو بھی طائفہ کہا جاتا ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے: جمع کے لفظ کا اطلاق واحد پر کیا جا سکتا ہے، جیسے تیرا قول ہے: خرج فلان علی البغال۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ الطائفة سے جب واحد مراد لیا گیا ہے تو وہ طائف ہو (1) اور ہا مبالغہ کے لیے ہو۔ اور وہ آدمی جس کو معاف کر دیا گیا اس کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے کہ اس کا نام مخشی بن حمیر ہے۔ یہ ابن اسحاق نے کہا ہے اور ابن ہشام نے کہا ہے: اس کے بارے میں ابن مخشی کہا جاتا ہے۔ اور خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں کہا ہے: اس کا نام مخاشن بن حمیر ہے۔ اور ابن عبد البر نے مخاشن حمیری ذکر کیا ہے۔ (اور سہیلی نے مخشن بن حمیر ذکر کیا ہے) اور تمام نے یہ ذکر کیا ہے کہ اسے جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا، اس نے توبہ کر لی تھی اور اس کا نام عبد الرحمن رکھا گیا تھا، اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اسے شہادت کی موت عطا کی جائے، اس کی قبر کے بارے معلوم نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی ہے کہ کیا وہ منافق تھا یا مسلمان؟ بعض نے کہا ہے: وہ منافق تھا پھر اس نے خالص سچی توبہ کر لی۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ مسلمان تھا، مگر یہ کہ اس نے منافقین سے بات سنی تو ان کے ساتھ ہنس پڑا اور ان کا انکار نہ کیا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ یَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں، حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے اور بند رکھتے ہیں اپنے ہاتھ (حقیقت یہ ہے کہ) انہوں نے بھلا دیا ہے اللہ کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں، بے شک منافق ہی نافرمان ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ یہ مبتدا ہے۔ بَعْضُهُمْ یہ مبتدا ثانی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس سے بدل ہو اور مِّنْۢ بَعْضٍ خبر ہو۔ اور بَعْضُهُمْ، مِّنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے وہ دین سے نکلنے میں ایک شے کی مثل ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ متصل ہے: یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ (التوبہ: 56) یعنی وہ مومنین میں سے نہیں ہیں۔ ولکن بعضهم من بعض یعنی وہ برائی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے میں باہم متشابہ اور ایک جیسے ہیں۔ ان کا اپنے ہاتھوں کو بند رکھنے سے مراد جہاد کو ترک کرنا ہے اور ہر اس چیز میں ہے جو ان پر حق میں سے واجب ہوتی ہے۔ اور یہاں نسیان کا معنی چھوڑنا ہے، یعنی انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کے بارے انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا، پس اللہ کریم نے انہیں اس شک کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ منسی (بھلا دیا گیا) کی طرح ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ثواب سے منسی کے قائم مقام کر دی۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: نسیهم یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں خیر اور نیکی سے فراموش کر دیا۔ اور رہا شر تو وہ انہیں نہ بھولا (2)۔ اور فسق سے مراد اطاعت اور دین سے نکلنا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ هِیَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 56 2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 351

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۶۸﴾

"وعدہ کیا ہے اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سے دوزخ کی آگ کا ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں، یہی کافی ہے انہیں، نیز لعنت کی ہے ان پر اللہ نے اور انہی کے لیے ہے دائمی عذاب"۔

قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ کہا جاتا ہے: اللہ تعالیٰ کے خیر اور بھلائی کے وعدہ کو وعدہ اور شر کے وعدہ کو وعید کہا جاتا ہے۔ خٰلِدِیْنَ یہ حال کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا عامل محذوف ہے۔ یعنی یصلونہا خالدین وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ جلیں گے۔ هِیَ حَسْبُهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں، یعنی یہ ان کے اعمال کی جزا کے طور پر کافی ووافی ہے۔ اور اللعن کا معنی بعد (دوری) ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ یعنی ان کے لیے ہمیشہ ثابت رہنے والا عذاب ہے۔

كَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

"(منافقو!) تمہاری حالت بھی ایسی ہے جیسے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے وہ زیادہ تھے تم سے قوت میں اور مال اور اولاد کی کثرت میں، سو لطف اٹھایا انہوں نے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور تم نے بھی لطف اٹھایا اپنے (دنیوی) حصہ سے اسی طرح جیسے لطف اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گزرے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور (لذتوں میں) تم بھی ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوبے رہے تھے، یہی وہ لوگ ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: كَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ زجاج نے کہا ہے: کاف محل نصب میں ہے، اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ جہنم کی آگ کا اسی طرح وعدہ کیا جیسے اس نے ان لوگوں سے وعدہ کیا جو ان سے پہلے گزرے (ای وعد اللہ الکفار نار جہنم وعدا کما وعد الذین من قبلھم) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم نے برائی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے میں ان لوگوں کے افعال کی طرح افعال کیے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ (فعلتم کافعال الذین من قبلکم فی الأمر بالمنکر والنھی عن المعروف) (1) پس مضاف حذف کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم ان کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے (أنتم کالذین من قبلکم) تو کاف محل رفع میں ہوا، کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور أشدّ غیر منصرف ہے کیونکہ افعل

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 78

کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ اور یہ اصل میں اشدد ہے، یعنی وہ قوت کے اعتبار سے تم سے زیادہ مضبوط تھے پس ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا اور نہ انہیں کسی نے اللہ تعالیٰ کا عذاب دور کرنے کی قدرت دی۔

مسئلہ نمبر 2۔ سعید نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگے جیسا کہ تم سے پہلی امتوں نے لیا ذراع کے بدلے ذراع، بالشت کے بدلے بالشت اور گز کے بدلے گز (دو بازوؤں کو پھیلانے کی جگہ تقریباً چھ فٹ) یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کی بل میں داخل ہوا تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے'' (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ لو: كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الخلاق سے مراد دین ہے۔ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ یہاں تک کہ وہ آیت سے فارغ ہو گئے۔ انہوں نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ نہیں ہیں مگر وہی''۔ اور صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم یقیناً اپنے سے پہلے والے لوگوں کے طریقہ کار کی اتباع اور پیروی کرو گے بالشت کے بدلے بالشت اور گز کے بدلے گز یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو یقیناً تم اس میں داخل ہو گے''۔ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہود و نصاریٰ؟ تو آپ نے فرمایا: ''تو اور کون ہیں''؟(2) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آج کی رات گزشتہ رات کے ساتھ کتنی مشابہت رکھتی ہے، وہ بنی اسرائیل ہیں ہم نے ان کے ساتھ مشابہت اختیار کی ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ یعنی انہوں نے دین میں سے اپنے حصے کے ساتھ نفع حاصل کیا جیسا کہ انہوں نے کیا جو ان سے پہلے گزرے۔ وَ خُضْتُمْ یہ غیب سے خطاب کی طرف خروج ہے۔ كَالَّذِيْ خَاضُوْا یعنی ان کے لذتوں میں ڈوبنے کی طرح تم بھی لذتوں میں ڈوبے رہے، پس کاف مصدر محذوف کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے (یعنی وخضتم خوضا کالذین خاضوا) اور الذی، من کی مثل اسم ناقص ہے، اس کے ساتھ واحد اور جمع کو تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: خضت الماء أخوضه خوضا و خیاضا (میں پانی میں غوطہ زن ہو گیا) اور اسم ظرف مخاضة ہے، مراد وہ جگہ جہاں لوگوں کے لیے پیدل اور سوار ہو کر جانا جائز ہو۔ اور اس کی جمع المخاض اور المخاوض بھی ہے۔ یہ ابو زید سے منقول ہے۔ اور أخضت دابتی فی الماء (میں نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا) اور اخاض القوم یعنی ان کے گھوڑے داخل ہو گئے۔ اور خضت الغمرات (میں سختیوں میں گھس گیا)۔ اور کہا جاتا ہے: خاضه بالسیف یعنی اس نے اپنی تلوار کو مضروب میں حرکت دی۔ اور خوض فی نجیعه (وہ اس کے خون میں اندر تک گھس گیا) اس کی تشدید مبالغہ کے لیے ہے۔ اور المِخْوَض للشراب کالمِجْدَح للسّویق (شراب بنانے کا آلہ اسی طرح ہے جیسے ستو گھولنے

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 199 2۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339 3۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 199

کا آلہ) اسی سے کہا جاتا ہے: خصت الشراب (میں نے شراب بنائی) اور خاض القوم فی الحدیث و تخاضوا یعنی قوم گفتگو میں مشغول ہوگئی اور باہم ایک دوسرے میں مشغول ہو گئے۔ پس اس کا معنی یہ ہے: تم لہو ولعب کے ساتھ اسباب دنیا میں ڈوب گئے، کھو گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم تکذیب اور جھٹلانے کے ساتھ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے میں مشغول ہو گئے۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ان کی نیکیاں باطل ہوگئیں، ضائع ہوگئیں۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

"کیا نہیں آئی ان کے پاس خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے (یعنی) قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا، آئے تھے ان سب کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر اور نہ تھا اللہ (کا یہ دستور) کہ ظلم کرتا ان پر بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ اس میں نبا کا معنی خبر ہے (کیا ان کے پاس خبر نہیں آئی) الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ہمزہ استفہام تقریر و تحذیر کے لیے ہے، یعنی کیا انہوں نے اس سے پہلے ہمارے کفار کو ہلاک کرنے کے بارے نہیں سنا۔ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ یہ الذین سے بدل ہے۔ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ یعنی نمرود بن کنعان اور اس کی قوم۔ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ اس میں مدین اس شہر کا نام ہے جس میں حضرت شعیب علیہ السلام سکونت پذیر تھے، وہ سب بادل کے دن کے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیئے گئے۔ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ کہا گیا ہے: اس سے قوم لوط مراد لی جا رہی ہے (1)، کیونکہ ان کی زمین ان کے ساتھ الٹ گئی تھی۔ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: الْمُؤْتَفِكٰتِ سے مراد ہر وہ ہے جو ہلاک کیا گیا، جیسے کہا جاتا ہے: انقلبت علیھم الدنیا (ان پر دنیا بدل گئی، الٹ گئی) اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مراد تمام انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان بستیوں کے رہنے والوں کے پاس ان کے رسول آئے۔ اس بنا پر تو ان کے رسول اکیلے حضرت لوط علیہ السلام تھے، لیکن انہیں ہر بستی میں رسول بنا کر بھیجا گیا (2)۔ اور وہ تین بستیاں تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چار تھیں۔ اور دوسری جگہ پر قول باری تعالیٰ ہے: وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ یہ جنس کے طریقہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسل سے مراد واحد لیا ہے، جیسا کہ اس قول میں ہے: يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ (المومنون: 51) (اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ) اور آپ کے زمانے میں اور کوئی نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ محل نظر ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں ہے: "بے شک اللہ تعالیٰ نے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 80
2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 201

مومنین کو خطاب کیا ان چیزوں کے بارے جن کا اس نے رسولوں کو حکم فرمایا(1)'' الحدیث۔ اور اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور مراد تمام رسول ہیں۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ دستور نہ تھا کہ وہ انہیں ہلاک کرتا یہاں تک کہ اس نے ان کی طرف انبیاء علیہم السلام کو بھیجا۔ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن انہوں نے حجت قائم ہونے کے بعد خود ہی اپنے اوپر ظلم کیے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

''نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، حکم کرتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی، یہی لوگ ہیں جن پر ضرور رحم فرمائے گا اللہ، بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ یعنی باہم مودت، محبت اور ایک دوسرے پر مہربان ہونے میں ان کے دل متحد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا ہے: بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (توبہ: 67) کیونکہ ان کے دلوں میں اختلاف تھا لیکن وہ حکم میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کی توحید اور وہ تمام امور جو ان کے تابع ہیں ان کا حکم کرتے ہیں۔ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور وہ بتوں کی عبادت اور وہ تمام امور جو اس کے تابع ہیں ان سے روکتے ہیں۔ علامہ طبری نے ابو العالیہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے تو وہ بتوں اور شیاطین کی عبادت سے نہی مراد ہے(2)۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے تفصیلی بحث سورۂ المائدہ اور آل عمران میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اس کے بارے گفتگو سورۂ بقرہ کے شروع میں ہو چکی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد پانچ فرض نمازیں ہیں اور اسی اعتبار سے یہاں زکوٰۃ مفروضہ مراد ہو سکتی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک نوافل پر مدح و تعریف کرنا زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ جو نوافل پر کاربند ہوتا ہے وہ فرائض کی ادائیگی کے زیادہ لائق ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ اور وہ فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔ وَرَسُوْلَهٗ اور اس کے رسول کی ان امور میں جو اس نے ان کے لیے سنت قرار دیئے ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ میں سین

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 326　　2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 202

وعدہ میں مہلت (اور وقفے) کو داخل کرنے کے لیے ہے تاکہ نفوس اس کی امید پر خوشحال اور خوش ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل اسے پورا کرنے کا ضامن ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغات کا رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں یہ ہمیشہ رہیں گے ان میں نیز (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں اور رضائے خداوندی ان سب نعمتوں سے بڑی ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ، جنات سے مراد باغات ہیں۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جنت کے درختوں اور کمروں کے نیچے ندیاں جاری ہوں گی۔ اور سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ وہ کھائیوں کے بغیر ہی منضبط اندازے اور مقدار کے مطابق بہہ رہی ہوں گی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً یعنی ان میں زبرجد، موتیوں اور یاقوت کے محلات ہوں گے اور اس کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے مہک رہی ہوگی۔ فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ مراد دار الاقامۃ ہے۔ کہا جاتا ہے: عدن بالمکان جب کوئی کسی جگہ مقیم ہو جائے۔ اور اسی سے معدن (کان) ہے۔ اور عطا خراسانی نے کہا ہے: جَنّٰتِ عَدْنٍ یہ جنت کا قصبہ ہے اور اس کی چھت عرش الرحمن ہے۔ اور حضرت ابن مسعود نے کہا ہے: اس سے مراد جنت کا وسط ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ سونے کا محل ہے جس میں سوائے نبی یا صدیق یا شہید یا عادل حاکم کے کوئی داخل نہ ہوگا۔ اسی طرح حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور مقاتل اور کلبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: عدن، جنت میں ایک اعلیٰ درجہ ہے اور اسی میں تسنیم کا چشمہ ہے اور باغات اردگرد سے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور یہ اس دن سے ڈھانپی ہوئی ہے جس دن سے اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیق فرمایا ہے یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، صالحین اور جن کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ اس میں اتر پڑیں گے (1)۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اس سے بھی بڑی اور عظیم ہے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (یہی تو بڑی کامیابی ہے)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

''اے نبی کریم! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور سختی کیجئے ان پر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 81

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے اور اس میں آپ کے بعد آپ کی امت داخل ہے۔ کہا گیا ہے: مراد یہ ہے کہ مومنین کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیجئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ کفار کے ساتھ تلوار سے جہاد کرنے اور منافقوں کے ساتھ زبان سے اور شدید جھڑک اور غصے کے اظہار کا حکم ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: منافقین کے ساتھ جہاد کیجئے اپنے ہاتھ سے اور اگر طاقت نہ رکھیں تو پھر اپنی زبان سے اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھیں تو پھر ان سے انتہائی ترش روئی اور سختی سے پیش آؤ۔ اور حسن نے کہا ہے: منافقین سے جہاد کرو ان پر حدود قائم کرنے کے ساتھ اور زبان کے ساتھ...... اور اسے حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے..... اور وہ اکثر حدود کے مرتکب ہو جاتے ہیں (1)۔

علامہ ابن عربی نے کہا ہے: رہا زبان کے ساتھ حجت قائم کرنا یہ تو دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے اور جہاں تک حدود کا تعلق ہے کہ اکثر حدود تک پہنچنا ان کے پاس ہوتا ہے (یعنی حدود کا اکثر ارتکاب ان کے پاس ہوتا ہے) تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں، حالانکہ گناہ اور معصیت کا ارتکاب کرنے والا منافق نہیں، بلاشبہ منافق اس شے کے سبب ہوتا ہے جو نفاق میں سے اس کے دل میں پوشیدہ ہوتی ہے، نہ کہ اس کے سبب جس کے بارے جوارح ظاہر التباس میں پڑ جاتے ہیں۔ اور محدودین کی اخبار کا سیاق اس کی شہادت دیتا ہے کہ وہ منافق نہیں ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ، الغلظ (سختی) یہ رأفت (نرمی) کی ضد ہے اور اس سے مراد امر کو نافذ کرنے کے لیے امر (حاکم) کا دل کو سخت کرنا ہے۔ اور یہ زبان میں نہیں ہوتی، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے حد کے کوڑے لگائے اور اس پر اسے جھڑکے نہیں'' (3)۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: 159) (اور اگر ہوتے آپ تند مزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے) اور اسی سے وہ قول بھی ہے جو عورتوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا: ''تم تو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تندخو اور سخت مزاج ہو (انت أفظ و أغلظ من رسول الله ﷺ) (4) اور الغلظ کا معنی ہے پہلو کا سخت ہونا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ضد ہے: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (شعراء) (اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے)

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) (اور جھکا دو ان کے لیے تواضع و انکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے) اور اس آیت نے عفو، صلح اور درگزر میں سے ہر شے کو منسوخ کر دیا ہے۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا ۚ وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 383
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 978
3۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، جلد 2، صفحہ 70
4۔ صحیح بخاری، فضائل الصحابہ، جلد 1، صفحہ 520

خَیۡرًا لَّهُمۡ ۚ وَ اِنۡ یَّتَوَلَّوۡا یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ مَا لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۷۴﴾

''قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا حالانکہ یقیناً انہوں نے کہی تھی کفر کی بات اور انہوں نے کفر اختیار کیا اسلام لانے کے بعد اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے۔ اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے، سو اگر وہ توبہ کر لیں تو یہ بہتر ہوگا ان کے لیے اور اگر وہ روگردانی کریں تو عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ عذاب الیم دنیا اور آخرت میں۔ اور نہیں ہوگا ان کا روئے زمین میں کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوۡا** روایت ہے کہ یہ آیت جلاس بن سوید بن صامت اور ودیعہ بن ثابت کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے اور انہوں نے کہا: قسم بخدا! اگر محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ان بھائیوں کے خلاف سچے ہیں جو ہمارے سردار اور ہمارے اشراف ہیں تو ہم یقیناً گدھوں سے برے ہیں۔ تو عامر بن قیس نے اسے کہا: ہاں! قسم بخدا بلاشبہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور آپ کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور بلاشبہ تو گدھے سے زیادہ برا اور شریر ہے۔ اور عامر نے اس کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ اور پھر جلاس آیا اور اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہا کہ عامر نے جھوٹ بولا ہے۔ اور عامر نے قسم کھائی۔ یقیناً اس نے یہ کہا ہے۔ اور پھر کہا: اے اللہ! اپنے سچے نبی پر اس بارے کوئی شے نازل فرما، پس یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور کہا گیا ہے: بے شک وہ جس نے یہ سنا وہ عاصم بن عدی تھا۔ بعض نے کہا ہے: وہ حذیفہ تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اسے اس کی بیوی کے بیٹے نے سنا تھا اور اس کا نام عمیر بن سعد تھا، اس بارے میں یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اس کا نام مصعب تھا۔ پس جلاس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ اس کی خبر کے بارے خبر نہ دے۔ تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: **وَ هَمُّوۡا بِمَا لَمۡ یَنَالُوۡا** (اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جلاس کو جب اس کے ساتھی نے کہا تھا: بلاشبہ میں تیرے قول کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کروں گا، تو اس نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا، پھر وہ ایسا نہ کر سکا، بلکہ اس سے عاجز آ گیا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **وَ هَمُّوۡا بِمَا لَمۡ یَنَالُوۡا** کے ساتھ اسی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے نازل ہوئی، اس نے بنی غفار کے ایک آدمی کو دیکھا جو جہینہ قبیلے کے ایک آدمی کے ساتھ لڑ رہا تھا اور جہینہ انصار کے حلیف تھے پس غفاری جہینی پر غالب آ گیا۔ تو ابن ابی نے پکار کر کہا: اے بنی اوس اور خزرج، اپنے بھائی کی مدد کرو! قسم بخدا! ہماری اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مثال تو اس طرح ہے جیسے کسی کہنے والے نے کہا: ''اپنے کتے کو موٹا کرتا کہ وہ تجھے کھائے''۔ اگر ہم مدینہ طیبہ لوٹ کر گئے تو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 82

وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا (1)۔ حضور نبی مکرم ﷺ کو اس بارے خبر دی گئی، تو عبداللہ بن ابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے قسم اٹھادی کہ اس نے یہ بات نہیں کی، یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ تمام منافقین کا قول ہے، یہ حسن نے کہا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ صحیح ہے، کیونکہ قول میں عموم ہے اور اس میں اور ان میں معنی موجود ہے اور اس میں ان تمام کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ نبی نہیں ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ نقاش نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا اس وعدے کو جھٹلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے فتح کے بارے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد جلاس کا قول ہے: بے شک حضرت محمد (ﷺ) جو لے کر آئے اگر وہ حق ہے تو ہم یقیناً گدھوں سے زیادہ شریر ہیں۔ اور عبداللہ بن ابی کا یہ قول ہے: اگر ہم مدینہ طیبہ لوٹ کر گئے تو یقیناً وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد حضور نبی مکرم ﷺ کو گالیاں دینا اور اسلام میں طعن و تشنیع کرنا ہے (3)۔ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ اور انہوں نے کفر اختیار کیا اس کے بعد کہ ان کے لیے اسلام کا حکم لگ چکا تھا، تو یہ اس پر دلیل ہے کہ منافقین کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا (المنافقون) ((ان کا) یہ (طریق کار) اس لیے ہے کہ وہ (پہلے) ایمان لائے پھر وہ کافر بن گئے) میں قطعی دلیل ہے۔

اور یہ آیت اس پر بھی دلیل ہے کہ کفر ہر اس (قول) کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے جو تصدیق اور معرفت کی نقیض اور ضد ہو، اگرچہ ایمان ثابت نہیں ہوتا مگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اس کے سوا اقوال و افعال میں سے کسی سے ثابت نہیں ہوتا مگر نماز میں (ثابت ہو جاتا ہے)۔ اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: تحقیق علماء نے نماز میں ایسی شے پر اجماع کیا ہے جس پر باقی ساری شریعت میں انہوں نے اجماع نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے بالاجماع کہا ہے: جس کا کفر پہچان لیا جائے پھر لوگوں نے اسے نماز اپنے وقت میں پڑھتے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ اس نے کثیر نمازیں پڑھیں اور انہیں اس کے اقرار باللسان کا علم نہ ہوا تو اس کے لیے ایمان کا حکم لگایا جائے گا اور انہوں (علماء) نے اس کے لیے روزے اور زکوٰۃ میں اس قسم کا حکم نہیں لگایا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا یعنی منافقین نے غزوۂ تبوک کے دوران لیلۃ العقبہ میں حضور نبی مکرم ﷺ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور وہ بارہ آدمی تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام بیان کیے حتی کہ آپ نے ان تمام کو شمار کیا۔ تو میں نے عرض کی: کیا آپ ان کی طرف (پیغام) نہیں بھیجیں گے کہ آپ انہیں قتل کر دیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ عرب کہیں کہ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کامیاب ہو گیا تو وہ انہیں قتل کرنے لگا بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں دبیلہ کے ساتھ کافی ہوگا'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! ﷺ یہ دُبیلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جہنم کا شعلہ ہے جو ان میں سے ہر ایک کی رگ دل پر پڑے گا یہاں تک کہ اس کی روح نکل جائے گی''۔ (4) (اور وہ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 131
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 979
3۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 83
4۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 369

ہلاک ہو جائے گا) پھر اسی طرح ہوا۔ اسی کے ہم معنی مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے ابن ابی کے سر پر تاج رکھنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ اس پر جمع ہو جائیں۔ اس بارے میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ یعنی وہ کسی شے کو ناپسند نہیں کرتے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے نابغہ نے کہا ہے:

ولا عَيْبَ فيهم غير أن سيوفهم　　بهنّ فُلول من قِراعَ الكَتائب(1)

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں لشکروں کو کاٹنے کے سبب کند ہو چکی ہیں۔

اور کہا جاتا ہے: نَقَمَ ینقِمُ اور نَقِمَ ینقَمُ شاعر نے عین کے کسرہ کی صورت میں کہا ہے:

ما نقِموا من بني أميّة إلّا　　أنهم يحلُمون إن غضبوا

اور زہیر نے کہا ہے:

يؤخّر فيوضع في كتاب فَيُدَّخَرْ　　ليوم الحساب أو يُعَجَّلْ فينقِمِ

یہ قاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ شعر میں کہا جاتا ہے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ دیت طلب کرتے تھے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے ان کے لیے فیصلہ فرما دیتے تو وہ غنی (دولت مند) ہو گئے۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ بارہ ہزار تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ بے شک مقتول جلاس کا غلام تھا۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے وہ انتہائی تنگ زندگی گزارتے تھے، نہ وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے اور نہ غنیمت تقسیم کرتے تھے، پس جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو وہ غنائم کے سبب غنی ہو گئے (2)۔ اور یہ مثل مشہور ہے (اتق شر من أحسنت إليه) تو اس کے شر سے بچ جس پر تو نے احسان کیا ہے۔

علامہ ابونصر قشیری نے کہا ہے: بجلی کو کہا گیا کیا آپ قرآن کریم میں یہ پاتے ہیں تو اس کے شر سے بچ جس پر تو نے احسان کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ روایت ہے کہ جلاس اس وقت کھڑا ہوا جب یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے استغفار اور توبہ کی۔ تو یہ ایسے کافر کی توبہ پر دلیل ہے جو کفر کو چھپاتا ہے اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہی وہ ہے جسے فقہاء زندیق کا نام دیتے ہیں۔ تحقیق اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زندیق کی توبہ معروف نہیں ہے، کیونکہ وہ ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے اور اس کا ایمان معلوم نہیں ہو سکتا مگر اس کے قول کے ساتھ۔ اور اسی طرح اب وہ کرتا ہے اور ہر وقت وہ کہتا ہے: میں مومن ہوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 60　　2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 83

حالانکہ جو کچھ وہ ظاہر کر رہا ہے اس کا خلاف وہ چھپا رہا ہے، پس جب وہ اس پر مطلع ہوا اور اس نے کہا: میں نے توبہ کی، تو اس کی حالت اس سے تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ پہلے تھا۔ پس جب وہ ہمارے پاس اپنی طرف سے توبہ کرتے ہوئے آیا اس سے پہلے کہ وہ اس پر مطلع ہو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی (1)۔ اور آیت سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا یعنی اگر وہ روگردانی کریں ایمان اور توبہ سے يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں قتل کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ عذاب دے گا۔ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ یعنی ان کے لیے روئے زمین پر کوئی بچانے والا نہ ہوگا جو انہیں بچائے گا۔ وَّلَا نَصِيْرٍ اور نہ کوئی معاون و مددگار ہوگا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

''اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے وعدہ کیا اللہ کے ساتھ کہ اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے اور ضرور ہو جائیں گے نیکوکاروں میں۔ پس جب اس نے عطا فرمایا انہیں اپنے فضل سے تو کنجوسی کرنے لگے اس کے ساتھ اور روگردانی کر لی اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں۔ پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے نفاق جما دیا ان کے دلوں میں اس دن تک جب ملیں گے اس کو اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف ورزی کی اللہ سے جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کے راز کو اور ان کی سرگوشی کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سارے غیبوں کا''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ یہ انصار میں سے ایک آدمی تھا اس نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کوئی شے عطا فرمائی تو میں ضرور اس میں اس کا حق ادا کروں گا اور یقیناً خیرات دوں گا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرمایا تو اس نے وہ کیا جو تم پر بیان کیا گیا ہے۔ پس تم جھوٹ سے بچو، کیونکہ وہ فجور تک پہنچا دیتا ہے۔ علی بن یزید نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی: اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 979

ہے اے ثعلبہ! وہ قلیل جس کا شکر ادا کیا جائے اس کثیر سے بہتر ہے جس کی تو طاقت نہ رکھے"۔ پھر وہ دوبارہ حاضر ہوا تو پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی کی مثل ہو اگر میں چاہوں کہ پہاڑ سونا بن کر میرے ساتھ چلیں تو وہ یقیناً چل پڑیں"۔ (أما ترضى أن تكون مثل نبي الله لوشئتُ أن تسير معي الجبال ذهبا لسارت) تو اس نے پھر عرض کی: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اگر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے تو میں ضرور ہر حق دار کو اس کا حق دوں گا۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا فرمائی، پس اس نے بکریاں لیں تو وہ اس طرح بڑھیں جیسے کیڑے بڑھتے ہیں، تو اس پر مدینہ طیبہ تنگ ہو گیا پس وہ اس سے دور چلا گیا اور اس کی وادیوں میں سے ایک وادی میں جا کر رہنے لگا یہاں تک کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھنے لگا اور ان کے سوا اس نے جماعت چھوڑ دی۔ پھر وہ اور بڑھیں اور اتنی زیادہ ہو گئیں کہ اس نے سوائے جمعہ کے ساری نمازیں چھوڑ دیں اور وہ بڑھتی رہیں یہاں تک کہ اس نے جمعہ بھی چھوڑ دیا۔ تو رسول اللہ نے فرمایا: یا ویح ثعلبه (ثعلبہ ہلاک ہو گیا) آپ نے یہ جملہ تین بار کہا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ:103) ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے اور آپ نے دونوں کو فرمایا: تم دونوں ثعلبہ اور فلاں کے پاس جاؤ ... یہ فلاں بنی سلیم کا ایک آدمی تھا...... اور تم ان سے زکوٰۃ لے آؤ"۔ چنانچہ وہ دونوں ثعلبہ کے پاس آئے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھ کر سنایا، تو اس نے کہا: یہ تو اخت جزیہ ہی ہے (یعنی زکوٰۃ جزیہ کی مثل ہی ہے) تم دونوں آگے جاؤ یہاں تک کہ جب فارغ ہو جاؤ تو پھر آنا۔ الحدیث اور یہ حدیث مشہور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثعلبہ کے غنا کا سبب یہ بنا کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے کا وارث بنا۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: کہا گیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب وہ ہے جس کے بارے وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ، الآیہ والی آیت نازل ہوئی (1)۔ جب اس نے زکوٰۃ کو روکا، فاللہ اعلم۔ اور جو اس کے بارے میں آیا ہے جو بدر میں حاضر ہوا تو اس کا معارض آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ، الآیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آیت کے سبب نزول کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ سے اس کا مال شام میں پیچھے رہ گیا، تو اس نے انصار کی ایک مجلس میں قسم کھائی، اگر وہ محفوظ رہا تو میں ضرور اس سے خیرات کروں گا اور اس سے صلہ رحمی کروں گا پس جب اسے صحیح سالم مل گیا تو اس نے اس کے ساتھ بخل کیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثعلبہ بدری انصاری اور ان میں سے ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایمان کی شہادت دی ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورہ ممتحنہ کے شروع میں آئے گا۔ پس اس کے بارے جو روایت کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: شاید اس کا قول جس نے ثعلبہ کے بارے یہ کہا ہے کہ اس نے اس زکوٰۃ کا انکار کیا جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی وہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ آیت منافقین میں سے نبتل بن

1۔ اسباب النزول، صفحہ 132

حارث، جد بن قیس اور معتب بن قشیر کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ نزول کے اعتبار سے ان کے ساتھ زیادہ موافق ہے، مگر یہ کہ قول باری تعالیٰ: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا وہ اس سے پہلے منافق نہ تھا، مگر یہ کہ معنی یہ ہو: اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق میں اضافہ کر دیا پس وہ موت تک اس پر ثابت رہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ، جیسا کہ اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ تو یہ اس کا احتمال رکھتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ اپنی زبان کے ساتھ کیا ہو اور اپنے دل سے اس کا اعتقاد نہ رکھا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ دونوں (زبان اور دل) کے ساتھ ہو پھر اسے سوء خاتمہ نے آ لیا ہو، کیونکہ اعمال اپنے خاتمہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور دل اپنے انجام اور اواخر کے ساتھ۔

اور من مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر مجرور میں ہے۔ اور قسم کا لفظ حدیث میں وارد ہے اور قرآن کریم کے ظاہر الفاظ میں یمین نہیں ہے مگر صرف ارتباط و التزام کے ساتھ، البتہ یہ معنوی اعتبار سے صیغہ قسم میں ہے کیونکہ لام اس پر دلالت کرتا ہے، یہ لفظ دو لاموں کے ساتھ مذکور ہے پہلا لام قسم کے لیے اور دوسرا لام الجواب ہے۔ اور یہ دونوں تاکید کے لیے ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: بے شک یہ دونوں لام برائے قسم ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ واضح اور اظہر ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ وعدہ اور طلاق اور ہر وہ حکم جس کے ساتھ آدمی منفرد ہو سکتا ہے اور کسی غیر کا اس میں محتاج نہیں ہوتا، بے شک وہ اسے لازم ہو جاتا ہے جب وہ اپنے قصد و ارادہ سے اس کا التزام کرتا ہے اگرچہ وہ اس کے الفاظ نہ بھی کہے۔ یہ ہمارے علماء نے کہا ہے۔ امام شافعی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: کسی پر کوئی حکم لازم نہیں ہوتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے الفاظ ادا کرے۔ اور یہی ہمارے علماء کا دوسرا قول ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو موقف ان دونوں ائمہ نے اپنایا ہے اس کے صحیح ہونے پر دلیل وہ روایت ہے جسے اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، تحقیق آپ سے پوچھا گیا: جب آدمی اپنے دل سے طلاق کی نیت کر لے اور زبان کے ساتھ اس کا تلفظ نہ کرے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ اسے لازم ہو جائے گی، جیسا کہ آدمی اپنے دل کے ساتھ مومن ہو جاتا ہے اور اپنے دل کے ساتھ ہی کافر ہو جاتا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ ایک عمدہ اصل ہے اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ کہا جائے: ایسا عقد جس میں آدمی اس کے التزام کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو تو فقط نیت کے ساتھ وہ اس پر منعقد ہو جائے گا۔ اس کی اصل ایمان اور کفر ہے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دوسرے قول کی حجت اور دلیل وہ روایت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے تجاوز اور

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 358　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 982

درگزر کی ہے ہر اس شے سے جو ان کے نفوس ان پر القا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کریں یا اس کے بارے کلام نہ کریں''(1)۔ اور اسے ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی پر اہل علم کے نزدیک عمل بھی ہے کہ جب آدمی کا نفس طلاق کے بارے اس کے ذہن میں وسوسہ ڈالے تو کوئی شے واقع نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس بارے کلام کرے(2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: جس کسی نے دل کے ساتھ طلاق کا اعتقاد رکھا اور اپنی زبان کے ساتھ اس بارے منہ نہ بولا تو اس سے کوئی شے واقع نہ ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی زیادہ مشہور ہے۔ اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے طلاق لازم ہو جائے گی جب اس نے اپنے دل سے اس کی نیت کر لی جیسا کہ وہ اپنے دل کے ساتھ کافر ہو جاتا ہے اگرچہ وہ اپنی زبان سے اس بارے کچھ نہ بولے۔ نظر و فکر اور ترجیح کے اعتبار سے پہلا قول اصح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ہر اس شے سے تجاوز فرمایا ہے جس کے بارے ان کے نفوس نے ان میں وسوسہ اندازی کی جب تک زبان اس کے بارے گفتگو نہ کرے یا ہاتھ اس کے مطابق عمل نہ کرے''(3)۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر یہ نذر ہے تو بلا اختلاف نذر کو پورا کرنا واجب ہے اور اسے ترک کرنا معصیت ہے اور اگر یہ قسم ہے تو بالاتفاق قسم کو پورا کرنا واجب نہیں، مگر اس میں معنی یہ ہے اگر آدمی فقیر ہو تو اس پر فرض زکوٰۃ متعین نہیں ہوتی، پس اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسے مال کی التجا کی جس میں زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہوگی اور وہ اسے ادا کرے گا جو اس پر فرض زکوٰۃ میں سے متعین ہوگی، پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا جو اس میں سے چاہا تو اس نے اسے چھوڑ دیا جس کا اس نے التزام کیا تھا، اس میں سے جو اصل دین میں اسے لازم تھا اگر وہ اس کا التزام نہ کرتا، لیکن مال کی طلب کے ساتھ مال لینا حقوق کو ادا کرنے کے لیے ہے یہ وہ ہے جسے اس نے چھپا رکھا ہے جب اس نے اللہ تعالیٰ سے بغیر خالص نیت کے مال کا مطالبہ کیا یا خالص نیت کے ساتھ کیا لیکن اس میں اس کے بارے شروع سے لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے گئی اس میں شقاوت تھی(4)۔ نعوذ باللہ من ذالک

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:''جب تم میں سے کوئی تمنا اور آرزو کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں غور و فکر کرے جس کی تمنا کر رہا ہے، کیونکہ وہ اسے نہیں جانتا جو اس کے لیے اس کی امیدوں میں سے اللہ تعالیٰ کے غیب میں لکھا ہوا ہے''(5)۔ یعنی ان کے انجام میں سے۔ پس کتنی امیدیں ہیں جن کے ساتھ وہ فتنے میں پڑ جاتا ہے یا سرکش ہو جاتا ہے پس یہی دنیا و آخرت میں ہلاک ہونے کا سبب بن جاتا ہے، کیونکہ امور دنیا کے نتائج اور انجام مبہم ہیں اور ان کے فاسد ہونے کا خطرہ ہے۔ اور رہی امور دین اور آخرت کی آرزو تو بلاشبہ ان کی تمنا کرنا اس کا نتیجہ قابل ستائش ہے ان پر برانگیختہ کیا گیا اور ان کی طرف بلایا گیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142
3۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 104
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 983
5۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 357

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ یہ اس پر دلیل ہے کہ جس نے کہا: اگر میں فلاں فلاں چیز کا مالک بن گیا تو وہ صدقہ ہے (إن ملكتُ كذا و كذا فهو صدقة) کیونکہ یہ اس کے ذمہ لازم ہو جاتی ہے۔ یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ اس کے ذمہ لازم نہ ہوگی۔ اور طلاق میں اسی کی مثل اختلاف ہے اور اسی طرح عتق میں بھی ہے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عتق میں اس پر لازم ہو جائے گا اور طلاق کی صورت میں لازم نہ ہوگا (1)، کیونکہ آزاد کرنا قربت ہے اور یہ نذر کے ساتھ ذمہ میں ثابت ہو جاتی ہے۔ بخلاف طلاق کے کیونکہ وہ محل میں تصرف کرنا ہے اور وہ ذمہ میں ثابت نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن آدم کے لیے ان چیزوں میں کوئی نذر نہیں ہے جن کا وہ مالک نہیں ہوتا اور ان میں اس کے لیے کوئی عتق نہیں جن کا وہ مالک نہیں اور نہ ہی ان میں اس کے لیے طلاق کا کوئی حق ہے جن کا وہ مالک نہیں ہوتا'' (2)۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: اس باب میں حضرت علی، حضرت معاذ، حضرت جابر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث مروی ہے اور وہ حدیث حسن ہے۔ اور وہی بہترین شے ہے جو اس باب میں مروی ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور دیگر اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں بہت سی احادیث بیان کی ہیں ان میں سے کوئی شے صحیح نہیں اور اسے ان پر محمول کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ظاہر آیت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کر دیا۔ بَخِلُوْا بِهٖ تو وہ بطور صدقہ مال دینے، خیر کے کاموں میں مال خرچ کرنے اور ان (نذروں) کو پورا کرنے میں جن کے وہ ضامن بنے تھے اور انہوں نے جن کا التزام کیا تھا، وہ کنجوسی کرنے لگے۔ بخل کا معنی سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ وَ تَوَلَّوْا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کر لی۔ وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ اور وہ اسلام سے منہ پھیرنے والے ہیں، یعنی اس سے اعراض کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا دو مفعول ہیں، ای أعقبهم الله تعالى نفاقا في قلوبهم (یعنی بطور نتیجہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق راسخ کر دیا) اسی لیے کہا: بَخِلُوْا بِهٖ (وہ اس کے ساتھ بخیل ہو گئے) اِلٰى یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ یہ محل خفض (جر) میں ہے: ای یلقون بخلهم اس دن تک جب وہ اپنے بخل کو جا ملیں گے یعنی اپنے بخل کی جزا کو جا ملیں گے، جیسے کہا جاتا ہے: أنت تلقى غدًا عملك (تو کل اپنے عمل کو جا ملے گا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اِلٰى یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ، ای یلقون الله (اس

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 988

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 141۔ ایضاً، حدیث نمبر 1101، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابی داؤد، باب فی الطلاق قبل النکاح، حدیث نمبر 1873، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 988

دن تک جب وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملیں گے) اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وہ نفاق کی حالت میں ہی مرا۔ اور یہ بعید ہے کہ اس میں جو حکم نازل کیا گیا ہے وہ ثعلبہ یا حاطب کے بارے ہو، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''تجھے کون بتائے کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر پر مطلع ہوا اور اس نے فرمایا تم جو چاہو کرو تحقیق میں نے تمہیں بخش دیا ہے'' (1)۔ اور ثعلبہ اور حاطب ان میں سے ہیں جو بدر میں حاضر ہوئے اور اس کا مشاہدہ کیا۔ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ان کے کذب سے مراد ان کا وعدہ کو توڑنا اور ان کا اسے پورا کرنے کو ترک کرنا ہے جسے انہوں نے اپنے ذمے لازم کیا تھا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: نِفَاقًا نفاق جب دل میں ہو تو وہ کفر ہے، لیکن جب وہ اعمال میں ہو تو وہ معصیت ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چار خصلتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو گی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے: جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب وہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب وہ وعدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ دے''۔ اربع من کن فیہ کان منافقا خالصا و من کانت فیہ خصلۃ منهن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا: اذا ائتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر (2) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اس کلمہ کے مادہ اشتقاق پر بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث کی تاویل میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ اس کے لیے ہے جو ایسی بات کرتا ہے جس کے بارے وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور وہ ایسا وعدہ کرتا ہے جسے پورا کرنے کا وہ اعتقاد نہیں رکھتا اور وہ امانت میں خیانت کرنے کے لیے اس کا منتظر رہتا ہے۔ اور انہوں نے اسے ضعیف الاسناد حدیث کے ساتھ جوڑ دیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اس حال میں کہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے باہر آرہے تھے اور وہ دونوں بوجھل تھے (یعنی رو رہے تھے) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مجھے کیا ہے میں تم دونوں کو روتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ تو دونوں نے جواب دیا: ایک حدیث ہے جسے ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافق کی خصلتوں کے بارے میں سنا ہے ''جب وہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے''۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے پوچھا نہیں؟ تو دونوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و توقیر کی۔ تو آپ نے کہا: لیکن میں اس کے بارے پوچھوں گا، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس حال میں نکلے ہیں کہ وہ دونوں رو رہے تھے، پھر آپ نے وہ ذکر کیا جو ان دونوں نے کہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق میں نے ان دونوں کو حدیث بیان کی اور میں نے اسے اس معنی میں نہیں بیان کیا جس میں ان دونوں نے اسے رکھا ہے کیونکہ منافق جب بات کرتا ہے درآنحالیکہ وہ اپنے دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جب وہ وعدہ

1۔ صحیح بخاری، باب لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء، جلد 2، صفحہ 726
2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 10

کرتا ہے اس حال میں کہ وہ اپنے دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف کرے گا اور جب اسے امین بنایا جاتا ہے درآنحالیکہ وہ دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ وہ خیانت کرے گا''۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: تحقیق اس پر واضح دلیل قائم ہوگئی کہ ان خصائل پر اعتماد کرنے والا کافر نہیں ہوگا، بلکہ وہ کافر ایسے اعتقاد کے ساتھ ہوگا جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے جہالت اور اس کی تکذیب کی طرف لوٹ جائے۔ (تعالیٰ اللہ و تقدس عن اعتقاد الجاھلین وعن زیغ الزائغین)۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین کے ساتھ مخصوص ہے (1)۔ اور انہوں نے اس روایت کے ساتھ تعلق قائم کیا ہے جسے مقاتل بن حیان نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے ان دونوں نے بیان کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کے ہمراہ حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ نے فرمایا ہے: ''تین خصلتیں ہیں جس میں موجود ہوں گی تو وہ منافق ہوگا اگرچہ اس نے روزہ بھی رکھا ہو اور نماز بھی پڑھتا ہو اور اس کا یہ گمان ہو کہ وہ مومن ہے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کا تہائی حصہ موجود ہے'' (2)۔ تو ہم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم ان سے یا ان میں سے بعض سے محفوظ اور سلامت نہیں اور لوگوں میں سے اکثر ان سے محفوظ و مامون نہیں۔ راوی نے بیان کیا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: ''تم کو اور ان کو کیا ہے بلاشبہ میں نے انہیں منافقین کے ساتھ خاص کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں خاص کیا ہے پس میرا قول اذا حدث کذب (جب وہ بات کرے تو وہ جھوٹ بولے) تو اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ...... الآیہ۔

''کیا تم اس طرح ہو''؟ ہم نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''تم پر کچھ لازم نہیں تم اس سے بری ہو''۔ اور میرا قول اذا وعد اخلف (کہ جب وہ وعدہ کرے تو اس کا خلاف کرے) تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ الآیات الثلاث ''کیا تم اس طرح ہو؟'' ہم نے عرض کی نہیں۔ قسم بخدا! اگر ہم نے کسی شی کے بارے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تو ہم اسے ضرور پورا کریں گے۔ آپ نے فرمایا: ''تم پر کچھ نہیں تم اس سے بری ہو۔ اور رہا میرا قول واذا اؤتمن خان (اور جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے) تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ الآیہ (الاحزاب: 72) پس ہر انسان کو اپنے دین پر امین بنایا گیا ہے پس مومن غسل جنابت کرتا ہے سراً بھی اور علانیۃً بھی (اور منافق صرف علانیۃً ایسا کرتا ہے) کیا تم اس طرح ہو؟'' ہم نے عرض کی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم پر کچھ لازم نہیں تم اس سے بری ہو'' (3)۔ بہت سے تابعین اور ائمہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے: یہ اس کے بارے میں ہے جس پر یہ خصلتیں غالب ہوں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اہل علم کے مذہب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بری خصلتیں اسے منافق بنانے والی ہیں جو ان کے

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 984　　2۔ ایضاً　　3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 985

ساتھ یوم قیامت تک متصف رہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر اس پر معاصی اور گناہ غالب آجائیں تو ان کے ساتھ وہ کافر نہیں ہوگا جب تک وہ اعتقاد میں موثر نہ ہوں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا پھر انہوں نے اس کا خلاف کیا اور انہوں نے ان سے گفتگو کی تو انہوں نے آپ سے جھوٹ بولا اور آپ نے انہیں یوسف علیہ السلام پر امین بنایا تو انہوں نے اس میں خیانت کی اور وہ منافق نہیں ہوئے۔ حضرت عطا بن ابی رباح نے کہا ہے: ان خصلتوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنایا اور وہ منافق نہیں ہوئے بلکہ وہ انبیاء ہوئے (۱) اور حسن بن ابی الحسن بصری نے کہا ہے: نفاق دو قسم کا ہے، ایک نفاق الکذب اور دوسرا نفاق العمل۔ جہاں تک نفاق الکذب کا تعلق ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور رہا نفاق العمل تو وہ یوم قیامت تک ختم نہیں ہوگا (2)۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تھا اور رہا آج (کا زمانہ) تو اس میں ایمان کے بعد فقط کفر ہے (3)۔

قولہ تعالیٰ: اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ یہ زجر و توبیخ ہے اور جب وہ جاننے والا ہے تو وہ عنقریب انہیں جزا اور بدلہ بھی دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۹

"جو لوگ (ریاکاری کا) الزام لگاتے ہیں خوشی خوشی خیرات کرنے والوں پر مومنوں سے اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت و مشقت کی مزدوری کے تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ یہ بھی منافقین کی صفات میں سے ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: يَلْمِزُوْنَ کا معنی ہے وہ عیب اور الزام لگاتے ہیں (4)۔ فرمایا: وہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال صدقہ کر دیا اور ان کا مال آٹھ ہزار تھا پس انہوں نے اس میں سے چار ہزار صدقہ کر دیئے، تو ایک قوم نے کہا: اس کا احسان کتنا زیادہ ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ اور انصار میں سے ایک آدمی کھجوروں کا نصف ڈھیر لے کر آیا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ اس سے کتنا غنی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ، الآیہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو مسعود سے روایت نقل کی ہے انہوں نے بیان کیا: ہمیں صدقہ کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے بیان کیا: ہم بوجھ اٹھاتے تھے۔ ایک روایت میں ہے: اپنی پشتوں پر۔ فرمایا: پس ابو عقیل نے نصف صاع صدقہ کیا اور ایک آدمی اس سے کچھ زیادہ چیز لے کر آیا تو منافقوں

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 987 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1054
4۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 88 (۱) صحیح یہ ہے کہ وہ انبیاء نہیں ہوئے کیونکہ ان کا عمل عصمت کے منافی ہے۔ حاشیہ 214

نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تو اس صدقہ سے غنی ہے (اسے اس کی حاجت نہیں ہے) اور اس دوسرے نے محض ریاکاری کے لیے کیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ مراد ابوعقیل ہیں اور ان کا نام حبحاب تھا(1)۔ اور الجهد سے مراد وہ تھوڑی سی شے ہے جس کے ساتھ ایک تنگ وست زندگی گزارتا ہے اور الجُهد اور الجَهد دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یلمزون کا معنی ہے وہ عیب لگاتے ہیں۔ اور یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ اور المطوعین اصل میں المتطوعین ہے اس میں تا کو طا میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو کوئی کام اپنی مرضی اور خوشی سے کرتے ہیں اس کے بغیر کہ وہ ان پر واجب ہو۔ والذین یہ محل جر میں ہے اور اس کا عطف المؤمنین پر ہے۔ اور یہ جائز نہیں کہ وہ اسم پر اس کے مکمل ہونے سے پہلے معطوف ہو۔ اور فَيَسْخَرُوْنَ اس کا عطف یلمزون پر ہے۔ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ یہ مبتدا کی خبر ہے اور یہ ان کے لیے بددعا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ خبر ہے یعنی سخر منهم حيث صاروا الى النار (اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مذاق کی سزا اس طرح دی کہ وہ جہنمی ہو گئے) اور سخر اللہ کا معنی ان کے مذاق پر انہیں جزا اور بدلہ دینا ہے۔ اور یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

”آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے ستر بار جب بھی نہ بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں، یہ محض اس لیے کہ انہوں نے انکار کیا اللہ کا اور اس کے رسول (مکرم) کا۔ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا نافرمان قوم کو“۔

قولہ تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اس کا بیان اس ارشاد باری تعالیٰ: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ: 84) کے تحت آرہا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

”خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد اور ناگوار تھا انہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں اور (دوسروں کو بھی) کہتے مت نکلو اس سخت گرمی میں، فرمایئے: دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، کاش! وہ کچھ سمجھتے“۔

قولہ تعالیٰ: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ یعنی اپنے بیٹھے رہنے کے سبب پیچھے چھوڑے جانے والے خوش ہو گئے۔ قعد

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 327

قعودا و مقعدا اس کا معنی ہے وہ بیٹھا۔ واقعدہ غیرہ اور اسے کسی دوسرے نے بٹھا دیا۔ یہ جوہری سے مروی ہے اور المخلف کا معنی متروک (چھوڑا گیا) ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں پیچھے چھوڑ دیا اور انہیں کمزور کر دیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین نے پیچھے چھوڑ دیا جب انہوں نے ان کے جہاد پر نکلنے میں دیر اور سستی کرنے کو جان لیا۔ یہ دو قول ہیں: اور یہ غزوۂ تبوک کے وقت ہوا (1)۔ خلف رسول اللہ یہ مفعول من اجلہ ہے۔ اور اگر چاہیں تو مصدر بنا لیں۔ اور خلاف بمعنی مخالفت ہے۔ اور جنہوں نے خلف رسول اللہ پڑھا ہے انہوں نے جہاد سے پیچھے رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو یہ کہا (مت نکلو اس سخت گرمی میں) قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ آپ انہیں کہیے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم جہنم کی آگ۔ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ حَرًّا بیان ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کا امر چھوڑ دیا تو اس نے اس آگ کو طلب کر لیا۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

''تو انہیں چاہیے کہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ، یہ سزا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا یہ امر ہے اور یہ تہدید کے معنی کے لیے ہے اور یہ ہنسنے کے بارے امر نہیں ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ اس میں لام مکسور ہوتا پھر کسرہ کے ثقیل ہونے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ حسن رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا انہیں چاہیے کہ وہ دنیا میں تھوڑا ہنسیں۔ وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا اور زیادہ روئیں جہنم میں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر بمعنی خبر ہے۔ ای أنهم سيضحكون قليلا و يبكون كثيرا (بے شک وہ عنقریب تھوڑا ہنسیں گے اور زیادہ روئیں گے) جزاء یہ مفعول من اجلہ ہے، ای للجزاء (سزا کے لیے)

مسئلہ نمبر 2۔ لوگوں میں سے بعض شدید خوف کی وجہ سے اپنے نفس کو بچانے کی خاطر اور اپنے اعتقاد میں اپنی حالت کے فساد سے بچنے کی خاطر ہنستے نہیں ہیں اگرچہ وہ آدمی نیک اور صالح ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قسم بخدا! اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم تھوڑا ہنسو اور روؤ زیادہ اور تم کھلے راستوں کی طرف نکل جاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑانے لگو کہ میں پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا'' (3)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت حسن بصری ان میں سے تھے کہ کبھی آپ پر حزن و ملال غالب ہوتا تو آپ نہ ہنستے تھے۔ اور ابن سیرین ہنستے تھے اور حسن کے خلاف حجت بیان کرتے ہوئے کہتے تھے: اللہ تعالیٰ نے ہنسایا بھی ہے اور رلایا بھی۔ اور صحابہ کرام ہنستے تھے، مگر یہ کہ اس میں کثرت کرنا اور اسے لازم پکڑنا یہاں تک کہ وہ اپنے صاحب پر غالب آجائے مذموم ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ بے وقوف اور بیکار لوگوں کا فعل ہے اور حدیث میں ہے: ''بے شک زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے''۔

اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے خوف، اس کے عذاب اور اس کی سزا کی شدت سے رونے کا تعلق ہے تو وہ قابل تعریف

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 88 2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 228 3۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم رؤاور اگر رونہ سکوتو رونے کی شکل بنالو کیونکہ اہل جہنم روئیں گے یہاں تک کہ ان کے آنسو ان کے چہروں پر بہیں گے گویا کہ وہ نالیاں ہیں یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے پھر خون بہنے لگ جائے گا اور آنکھیں زخمی ہو جائیں گی پس اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو وہ چل پڑیں" (1)۔ اسے ابن المبارک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔

فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ﴿٨٣﴾

"(اے حبیب!) پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ ان کے کسی گروہ کے پاس پھر وہ اجازت طلب کریں آپ سے جہاد پر نکلنے کی تو آپ فرمایئے نہیں نکلو گے تم میرے ہمراہ کبھی اور ہرگز جنگ نہیں کرو گے میری معیت میں کسی دشمن سے تم نے تو (خود) پسند کیا تھا (گھر) بیٹھ رہنا پہلی مرتبہ تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ"۔

قولہ تعالیٰ: فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ یعنی پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ منافقین کے کسی گروہ کے پاس۔ بے شک فرمایا: إِلَىٰ طَائِفَةٍ کیونکہ وہ تمام جو مدینہ طیبہ میں مقیم رہے وہ منافقین نہیں تھے، بلکہ ان میں معذور بھی تھے اور وہ بھی جن کا کوئی عذر نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول فرمالی، جیسا کہ وہ تین جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ ان کا ذکر عنقریب آئے گا۔ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا یعنی ان کا انجام اور نتیجہ یہ ہے کہ آپ کبھی بھی انہیں ساتھ نہ ملائیں۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے سورۃ الفتح میں فرمایا: قُل لَّن تَتَّبِعُونَا (الفتح:15) (فرمایئے تم قطعاً ہمارے پیچھے نہیں آسکتے) اور الْخَالِفِينَ یہ خالف کی جمع ہے، گویا کہ وہ نکلنے والوں سے پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الْخَالِفِينَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو منافقین میں سے پیچھے رہ گئے۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ جو عورتوں اور مردوں میں سے ضعیفوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے (2)، پس مذکر کو غلبہ دیا (اور جمع مذکر ذکر کی) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پس تم بیٹھے رہو فساد برپا کرنے والوں کے ساتھ۔ یہ ان کے اس قول سے ہے فلان خالفة أهل بيته جب وہ ان میں فساد برپا کرنے والا ہو (اور یہ) خلوف فم الصائم سے ہے (روزے دار کے منہ کی بو) اور تیرے اس قول سے: خلف اللبن یعنی جب دودھ زیادہ دیر مشکیزے میں پڑے رہنے کے سبب خراب ہو جائے۔ پس اسی بنا پر فاقعدوا مع الفاسدین مراد لی گئی ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنگوں میں مدد چھوڑ دینے والوں کو ساتھ لینا جائز نہیں ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 89۔ سنن ابن ماجہ، باب صفة النار، حدیث نمبر 4314، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 362

وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۴

"اور نہ پڑھیے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑے ہوں اس کی قبر پر، بے شک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول مکرم کے ساتھ۔ اور وہ مرے اس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے"۔

اس میں گیارہ مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی بن سلول اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صحیحین وغیرہ میں ثابت ہے۔ اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی اور یہ آیت اس کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب آگے بڑھے تاکہ آپ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں تو آپ کے پاس حضرت جبریل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے آپ کا کپڑا کھینچا اور آپ پر یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا الآیہ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم واپس پھر آئے اور اس پر نماز جنازہ نہ پڑھائی۔ اور اس کے خلاف اور برعکس روایات بھی ثابت ہیں۔ پس بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، آپ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی پھر آپ واپس لوٹ آئے اور آپ بالکل تھوڑی ہی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورت براءت کی دو آیتیں نازل ہوئیں: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا۔ (1) اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب عبد اللہ بن ابی بن سلول فوت ہوا تو اس کا بیٹا عبد اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے عرض کی کہ آپ اسے اپنی قمیص عنایت فرمائیں وہ اس میں اپنے باپ کو کفن پہنائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اسے عطا فرما دی پھر اس نے عرض کی کہ آپ اس پر نماز جنازہ بھی پڑھائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تاکہ اس پر نماز جنازہ پڑھائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ اس پر نماز جنازہ پڑھیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز جنازہ پڑھنے سے آپ کو منع فرمایا ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار عطا فرمایا ہے پس فرمایا: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (التوبہ: 80) (آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لیے ستر بار) اور میں ستر سے زائد بار بخشش طلب کروں گا"۔ فرمایا: بلاشبہ وہ منافق ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (2) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نماز چھوڑ دی۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کے الفاظ اسلام کے ظاہر پر بنا کرتے ہوئے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ بعد ازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا جب آپ کو منع کر دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اگر کوئی کہنے والا کہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسے کہہ دیا: کیا آپ اس پر نماز پڑھیں گے جس پر نماز

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674 2۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 276

جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منع فرمادیا ہے، حالانکہ پہلے ان پر نماز جنازہ پڑھنے سے نہی واردنہ تھی تو جواباً یہ کہا جائے گا: اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ بات آپ کے دل میں واقع ہوئی ہو اور وہ اس الہام اور تحدث کے قبیلہ سے ہو جس کی شہادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اور کبھی قرآن کریم آپ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کی مراد و مقصود پر نازل ہوتا تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے تین امور میں موافقت کی ہے(1)۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ چار میں (یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے اور چاہت کے مطابق قرآن کریم کا حکم نازل کیا) اور یہ پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ پس یہ بھی اس میں سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا ہو: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ، الآیہ (آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں یا نہ کریں یہ نہیں کہ نہی اس پر مقدم ہو جس پر بخاری اور مسلم کی حدیث نے دلالت کی ہے۔ واللہ اعلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا ہو: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (التوبہ: 113) (درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے) کیونکہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ، الآیہ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں تو وہ ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اگرچہ استغفار کتنا زیادہ ہو۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: وہ ثابت نہیں جو یہ روایت کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں ضرور ستر سے زیادہ بار بخشش طلب کروں گا'' (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ثابت ہے: ''سازید علی سبعین (میں ستر سے زائد بار طلب کروں گا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''اگر میں یہ جانتا کہ اگر میں ستر سے زائد بار بخشش طلب کروں تو انہیں بخش دیا جائے گا تو میں یقیناً اس سے زیادہ بار بخشش طلب کرتا''۔ فرمایا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی (3)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ کی تاویل میں اختلاف کیا ہے کیا یہ ناامید کرنا ہے یا اختیار دینا ہے؟ تو ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مقصود ناامید کرنا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (4) (جب بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا) اور ستر بار کا ذکر محض اتفاق ہے یا یہ ان کی عادت کے مطابق عبارت میں کثرت اور انتہا کا ذکر ہے پس جب ان میں سے کوئی کہنے والا کہتا: لا أكلمه سبعين سنة (میں اس سے ستر برس تک کلام نہیں کروں گا) تو یہ ان کے نزدیک اس قول کے قائم مقام ہے: لا أكلمه أبدا (میں اس سے ہمیشہ کلام نہیں کروں گا) اور انتہا اور غایت کے بیان میں اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (الحاقہ: 32) (پھر ستر گز لمبی زنجیر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 276
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 673
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 674
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 990

میں اس کو جکڑ دو) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من صام یوما فی سبیل اللہ باعد اللہ وجھہ عن النار سبعین خریفا (1) (جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو آتش جہنم سے ستر برس تک دور کر دے گا)

اور ایک جماعت نے کہا: یہ تخییر ہے (2)۔ ان میں سے حسن، قتادہ اور عروہ رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے لیے بخشش طلب کیجئے اور اگر آپ چاہیں تو بخشش طلب نہ کریں یہی وجہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کیا آپ اللہ تعالیٰ کے دشمن پر نماز جنازہ پڑھیں گے جس نے فلاں فلاں دن ایسے ایسے کہا؟ تو آپ نے فرمایا: ”بلاشبہ مجھے اختیار دیا گیا ہے سو میں نے اختیار کر لیا ہے“ (3)۔ انہوں نے کہا ہے: پھر یہ اختیار منسوخ ہو گیا جب یہ آیت نازل ہوئی: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (المنافقون: 6) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا (اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ ان کے کفر کی وجہ سے ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیہ (التوبہ: 113) یہ آیت حضرت ابو طالب کی موت کے وقت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جیسا کہ اس کا بیان آئے گا اور اس سے اس کے بارے میں استغفار کرنے سے نہی سمجھی جا سکتی ہے جو حالت کفر میں فوت ہوا۔ اور اس آیت پر متقدم ہے جس سے تخییر سمجھی گئی ہے آپ کے اس قول کے ساتھ: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے“ (4) اور یہ مشکل ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک آپ کا اپنے چچا کے لیے استغفار کرنا بلاشبہ آپ کا مقصود قبولیت کی امید پر استغفار تھا تاکہ انہیں مغفرت حاصل ہو جائے۔ اور اس استغفار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ انہیں اپنی ماں کے لیے استغفار کرنے کی اجازت عطا فرمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کو اجازت نہ دی (5) (۱)۔ اور رہا منافقین کے لیے استغفار کرنا تو یہ وہ ہے جس بارے میں آپ کو اختیار دیا گیا ہے اور یہ ایسا زبانی استغفار ہے جو نفع نہیں دے سکتا۔ اور اس کی غایت اور مقصود یہ ہے کہ ان زندوں میں سے بعض کے دلوں کو پاک کرنا جن کا اس کے ساتھ قرابت کا تعلق ہے جس کے لیے بخشش طلب کی گئی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عبد اللہ کو قمیص عطا کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لیے عطا فرمائی کیونکہ عبد اللہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بدر کے دن اپنی قمیص دی تھی۔ اور وہ اس لیے کہ بدر کے دن عباس کو قیدی بنا کر لایا گیا تو ان سے کپڑے چھین لیے گئے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس حال میں دیکھا تو آپ پر گراں گزرا، چنانچہ آپ نے ان کے لیے قمیص طلب کی تو عبد اللہ کی قمیص کے سوا کوئی قمیص نہ پائی گئی جسے وہ پہن سکتے ہوں، کیونکہ طویل القامۃ ہونے میں دونوں قریب قریب تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص دینے سے یہ ارادہ فرمایا کہ دنیا میں اس کا احسان اتار دیا جائے تاکہ وہ آخرت میں آپ کو اس حال میں نہ ملے کہ اس کا آپ پر

1۔ سنن نسائی، کتاب الصیام، جلد 1، صفحہ 314
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 991
3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674
4۔ ایضاً
5۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 314

(۱) اس بارے میں ضیاء النبی جلد دوم میں ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے مفصل بحث کی ہے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ مترجم

احسان ہو اور آپ کو اس کا بدلہ دینا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی تکریم، اس کی حاجت اور طلب کو پورا کرنے کے لیے اور اس کے دل کی پاکیزگی کے لیے اسے قمیص عطا فرمائی۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اسے امام بخاری نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: جب بدر کا دن تھا قیدیوں کو لایا گیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی لائے گئے اس حال میں کہ ان پر کپڑا نہ تھا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے قمیص کا مطالبہ کیا تو انہوں نے عبد اللہ بن ابی کی قمیص پائی جو وہ پہن سکتے تھے، چنانچہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ قمیص پہنا دی، پس اسی لیے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص اتاری جو آپ نے اسے پہنائی (1)۔ اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن قميصي لا يغني عنه من الله شيئا وإني لأرجو أن يسلم بفعلي هذا ألف رجل من قومي (2) (بلاشبہ میری قمیص اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والی کسی شے کو اس سے دور نہیں کر سکے گی اور بلاشبہ مجھے یہ توقع ہے کہ میرے اس عمل سے میری قوم کے ہزار افراد اسلام قبول کر لیں گے) اسی طرح بعض روایات میں ہے من قومي سے مراد عرب کے منافقین ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: رجال من قومه (3) (یعنی اس کی قوم کے ہزار افراد) اور مغازی ابن اسحاق اور بعض کتب تفسیر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے خزرج قبیلے کے ہزار آدمیوں نے توبہ کی اور مسلمان ہو گئے (فاسلم و تاب لهذه الفعلة من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ألف رجل من الخزرج)

مسئلہ نمبر 7۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ کفار پر نماز جنازہ پڑھنے سے رکنے کے بارے نص ہے اور اس میں مومنین پر نماز جنازہ پڑھنے پر دلیل نہیں ہے۔ اس بارے اختلاف ہے کہ کیا اس کے مفہوم مخالف سے مومنین پر نماز جنازہ واجب ہونے کے بارے حکم اخذ کیا جائے گا؟ تو اس بارے میں دو قول ہیں: وہ حکم اخذ کیا جائے گا، کیونکہ کفار پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکنے کی علت ان کے کفر کو قرار دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (بے شک انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا انکار کیا) تو جب کفر زائل ہو گیا تو نماز واجب ہو گئی۔ اور یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہوگا: كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَؕ (المطففین) (یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا) یعنی اس دن کفار کو رب کریم کے دیدار سے روک دیا جائے گا۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ غیر کفار اسے دیکھ سکیں گے اور وہ مومنین ہیں۔ پس یہ بھی اسی کی مثل ہے۔ واللہ اعلم۔
یا نماز کا حکم آیت کے علاوہ دلیل خارجی سے لیا جائے گا اور وہ اس باب میں وارد ہونے والی احادیث ہیں اور اجماع ہے۔
اختلاف کا منشاء دلیل خطاب کے ساتھ قول کرنا اور اسے چھوڑنا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بے شک تمہارا بھائی فوت ہو چکا ہے پس تم اٹھو اور اس پر نماز جنازہ پڑھو" (4)۔ آپ نے بیان کیا: پس ہم اٹھے اور دو صفیں بنائیں۔ اس میں مراد نجاشی (شاہ حبش) ہے۔ اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 442
2۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 91
3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 309

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو نجاشی کی موت کی خبر اس دن دی جس دن وہ فوت ہوا تھا، پس آپ انہیں ساتھ لے کر جنازہ گاہ کی طرف نکلے اور آپ نے چار تکبیریں کہہ کر نماز جنازہ پڑھائی (1)۔ اور مسلمانوں نے اس پر اجماع کر لیا کہ مسلمانوں کی میتوں پر نماز جنازہ ترک کرنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ کبیرہ گناہ کرنے والوں سے ہوں یا نیکوکاروں میں سے اور یہ قولاً و عملاً حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ والحمدللہ۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے سوائے شہید کے اور سوائے اہل بدعت اور باغیوں کے (کہ ان کے بارے میں اختلاف ہے)

مسئلہ نمبر 8۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ تکبیریں چار ہیں۔ ابن سیرین نے کہا ہے: (نماز جنازہ میں) تکبیریں تین تھیں پھر انہوں نے ایک کا اضافہ کر دیا۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: پانچ تکبیریں کہی جائیں گی اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے چھ تکبیریں مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت انس بن مالک اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ تکبیرات تین ہیں اور ان پر چوتھی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دارقطنی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام پر نماز جنازہ پڑھی اور انہوں نے آپ پر چار تکبیریں کہیں اور انہوں نے کہا: اے بنی آدم! یہی تمہارے لیے (طریقہ) اور سنت ہے“ (3)۔

مسئلہ نمبر 9۔ نماز جنازہ میں قراءت نہیں ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہی ہے۔ اور اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے بھی کہا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا لہ الدعاء (4) (جب تم میت پر نماز جنازہ پڑھو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا مانگو) اسے ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق، محمد بن مسلمہ ہمارے علماء میں سے اشہب اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہے“ (5)۔ اور انہوں نے اسے اپنے عموم پر محمول کیا ہے۔ اور اس روایت کے سبب جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے جنازہ پر نماز پڑھی اور سورۂ فاتحہ کی قراءت کی اور فرمایا جان لو بلاشبہ یہ سنت ہے (6)۔ اور امام نسائی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ نے فرمایا: جنازوں پر نماز پڑھنے میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ آہستہ آواز سے پڑھی جائے، پھر تین تکبیریں کہی جائیں اور آخر میں سلام پھیرا جائے (7)۔

اور محمد بن نصر مروزی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ تو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 309
2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 281
3۔ سنن دارقطنی، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 70
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 100
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 118
6۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 178
7۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 281

تکبیر کہے، پھر سورۂ فاتحہ پڑھے، پھر حضور نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھے، پھر میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف پہلی تکبیر میں کی جائے گی پھر سلام پھیر دیا جائے گا۔ ہمارے شیخ ابوالعباس نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور یہ دونوں علماء اصول کے نزدیک مسند کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول لا صلوٰۃ اور میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا دونوں جمع ہیں اور اس میں سورۂ فاتحہ کی قراءت یہ دعا کے آغاز کے لیے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ مرد کے سر کی جانب تھوڑا ہٹ کر اور عورت کے سرین کی جانب ہو کر کھڑا ہو، کیونکہ ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی تو حضرت علاء بن زیاد نے انہیں کہا: اے ابوحمزہ! اسی طرح رسول اللہ ﷺ جنازوں پر نماز پڑھتے تھے جیسے تم نے پڑھی ہے، آپ چار تکبیریں کہتے اور آدمی کے سر کے نزدیک اور عورت کے سرین کی جانب کھڑے ہوتے؟(1) انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اور اسے مسلم نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے کعب کی ماں کی نماز جنازہ پڑھائی وہ فوت ہوئی اس حال میں کہ وہ حالت نفاس میں تھی تو رسول اللہ ﷺ اس پر نماز پڑھانے کے لیے اس کے وسط میں کھڑے ہوئے (2)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ جب میت کو دفن کر دیا جاتا تو رسول اللہ ﷺ اس کی قبر پر ٹھہرتے اور اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا فرماتے (3)، جیسا کہ ہم نے اسے (التذکرہ میں) بیان کیا ہے۔ والحمدللہ

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

''اور نہ تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان سے دنیا میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں''۔

اسے تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا۔ اور اس بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور جب نازل کی جاتی ہے کوئی سورت (جس میں حکم ہوتا ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو اللہ کے رسول کے ہمراہ تو اجازت طلب کرنے لگتے ہیں آپ سے جو طاقت والے ہیں ان میں سے اور کہتے ہیں رہنے دیجئے ہمیں تاکہ ہوں ہم پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 99
2۔ التذکرۃ فی احوال الموتی، الوقوف عند القبر قلیلاً بعد الدفن، جلد 1، صفحہ 157، دار ابن زیدون بیروت
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 311

مومنوں نے دعوت کو قبول کرنے میں جلدی کی اور منافقوں نے عذر اور بہانے بنانے میں جلدی کی۔ پس مومنوں کے لیے یہ حکم ایمان پر قائم رہنے اور ثابت قدم رہنے کے بارے ہے اور منافقوں کے لیے یہ امر ابتدا ایمان لانے کے بارے میں ہے۔ اور ان محل نصب میں ہے۔ ای بأن أمنوا (یعنی اصل میں بأن ہے) اور الطول کا معنی ہے غنی، دولت مند اور اس کا ذکر پہلے چکا ہے۔

اور انہیں ذکر کے ساتھ خاص اس لیے کیا ہے، کیونکہ جو غنی اور طاقت ور نہ ہو اسے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو معذور ہے۔ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ہمیں رہنے دیجئے تا کہ ہم نکلنے سے عاجز لوگوں کے ساتھ ہوں۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

"انہوں نے یہ پسند کیا کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر تو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور انہی کے لیے ساری بھلائیاں ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ تیار کر رکھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہنے والے ہیں ان میں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے"۔

قولہ تعالیٰ: رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ اس میں الْخَوَالِفِ، خالفة کی جمع ہے یعنی وہ عورتوں، بچوں اور مردوں میں سے معذوروں کے ساتھ ہو جائیں۔ اور آدمی کے لیے خالف اور خالفة بھی کہا جاتا ہے جب وہ نجیب اور شریف نہ ہو، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان خالفة أهله جب وہ ان سے گھٹیا ہو۔ نحاس نے کہا ہے: اس کی اصل خلف اللبن يخلف سے ہے جب دودھ طویل وقت پڑے رہنے کے سبب کھٹا اور خراب ہو جائے اور خلف فم الصائم روزے دار کے منہ کی بو بدل جائے اور اسی سے فلان خلف سوء (فلاں برا پیچھے رہنے والا ہے) مگر یہ فاعلة کی جمع فواعل ہے اور فاعل صفت کی فواعل کے وزن پر جمع نہیں بنائی جاتی مگر شعر میں، مگر دو حرفوں میں۔ اور وہ دونوں فارس اور ہالک ہیں۔ اور مجاہدین کے وصف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ کہا گیا ہے: مراد خوبصورت عورتیں ہیں۔ یہ حسن سے منقول ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ۝ (الرحمٰن) (ان میں اچھی سیرت والیاں اچھی صورت والیاں ہوں گی)

اور کہا جاتا ہے: هي خيرة النساء (یہ عورتوں میں سے اچھی اور خوبصورت ہے) یہ اصل میں خيرة ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی ہے، جیسے هَيِّنة اور هَيْنة ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خیر کی جمع ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ ان کے لیے دونوں جہان کے منافع ہیں۔ اور فلاح کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور جنات سے مراد بساتین (باغات) ہیں۔ یہ بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۹۰

”اور آئے بہانہ بنانے والے بدو تا کہ اجازت مل جائے انہیں اور بیٹھ رہے وہ جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ اور اس کے رسول سے، عنقریب پہنچے گا جنہوں نے کفر کیا ان میں سے عذاب دردناک“۔

قولہ تعالیٰ: وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ، اعرج اور ضحاک نے تخفیف کے ساتھ الْمُعْذِرُون پڑھا ہے۔ اور ابو کریب نے اسے ابوبکر سے اور انہوں نے عاصم سے روایت کیا ہے اور اسے اصحاب القراءات نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وجاء الْمُعْذِرُون تخفیف کے ساتھ پڑھتے تھے (1)، یہ اعذر سے ہے۔ اور کہتے: قسم بخدا! یہ اسی طرح نازل کیا گیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: مگر یہ کہ اس (قراءت) کا مدار کلبی پر ہے۔ اور یہ اعذر سے ہے، اور اسی سے ہے قد أعذر من أنذر یعنی جو آپ کے پاس آیا اس نے عذر میں اتنا مبالغہ اور غلو کیا کہ اس نے آپ کو ڈرا دیا۔ اور رہا المعذرون تشدید کے ساتھ تو اس میں دو قول ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ سچ بیان کرنے والا ہو۔ پس یہ المعتذر کے معنی میں ہے، کیونکہ اس کا عذر ہے۔ پس المعذرون اس بنا پر اس کی اصل المعتذرون ہے، لیکن اس میں تا کو ذال سے بدل دیا گیا ہے اور پھر اس میں ادغام کر دیا گیا ہے اور اس کی حرکت عین کو دے دی گئی ہے، جیسے یخصمون خا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور المعذرون اجتماع ساکنین کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ بھی جائز ہے۔ اور میم کی اتباع میں اس کا ضمہ بھی جائز ہے۔ اسے جوہری اور نحاس نے ذکر کیا ہے، مگر یہ کہ نحاس نے اسے اخفش، فراء، ابو حاتم اور ابو عبید سے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اصل المعتذرون ہو، پھر تا کو ذال میں ادغام کر دیا گیا۔ اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کا عذر ہو۔ لبید نے کہا ہے:

إلى الحَوْلِ ثم إسم السلام عليكما　　ومن يَبْكِ حولاً كاملاً فقد اعتذر (2)

اس میں اعتذر حقیقی عذر والے کے معنی میں ہی ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ المعذر کبھی اپنے عذر میں سچا نہیں ہوتا اور یہ وہ ہوتا ہے جو بہانہ بناتا ہے اور اس کا عذر نہیں ہوتا۔ جوہری نے کہا ہے کہ یہ معذر، مفعل کے وزن پر ہے، کیونکہ یہ بیماری کا بہانہ بنانے والا اور کوتاہی کرنے والا ہوتا ہے یہ بغیر عذر کے عذر پیش کرتا ہے۔ اور دوسروں نے کہا: کہا جاتا ہے عذر فلان في أمر كذا تعذيرا یعنی اس نے کوتاہی کی اور اس میں مبالغہ نہیں کیا۔ اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے جھوٹے عذر پیش کیے۔ جوہری نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: لعن الله المعذرين (اللہ تعالیٰ نے بہانے بنانے والوں پر لعنت کی ہے) گویا ان کے نزدیک امر یہ ہے کہ معذر تشدید کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے عذر کو ظاہر کرنے والا، بہانہ بناتے ہوئے اس کے عذر میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

نحاس نے کہا ہے: ابو العباس محمد بن یزید نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اس میں اصل المعتذرون ہو، اور نہ ادغام جائز

1۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 236　　2۔ ایضاً

ہے کہ اس سے التباس واقع ہو جاتا ہے۔ اسماعیل بن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ خلیل اور سیبویہ کے قول کے مطابق ادغام سے اجتناب کیا گیا ہے کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی مذمت کی گئی ہے ان کا کوئی عذر نہیں ہے، فرمایا: کیونکہ وہ آئے تاکہ انہیں اجازت دی جائے۔ اور اگر وہ ضعیف اور مریض ہوتے اور وہ ہوتے جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتے تو انہیں اجازت طلب کرنے کی حاجت اور ضرورت نہ تھی۔ نحاس نے کہا ہے: معذرۃ، اعذار اور تعذیر کی اصل ایک شے سے ہے اور وہ اس میں سے ہے جو مشکل اور معتذر ہوتی ہے۔ اور عربوں کا قول ہے: مَنْ عَذِیرِی من فلان اس کا معنی ہے تحقیق اس نے امر عظیم سرانجام دیا وہ یہ استحقاق رکھتا ہے کہ میں اسے اس پر اچھا بدلہ دوں اور لوگوں کو اس کے بارے علم نہ ہو (پس کون مجھے معذور جانے گا) اگر میں نے اسے اچھا بدلہ دیا۔ پس تخفیف کی قراءت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو بہانے کے ساتھ پیچھے رہ گئے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ عامر بن طفیل کا گروہ تھا (1) انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم آپ کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں تو طئی قبیلے کے بدو ہماری بیویوں، ہماری اولاد اور ہمارے مویشیوں پر حملہ کردیں گے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذر کو قبول کرلیا۔ اور تشدید کی قراءت کی بنا پر دوسرے قول میں کہا ہے: وہ غفار قبیلے کے لوگ تھے انہوں نے اپنے عذر پیش کیے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذروں کو قبول نہ کیا، کیونکہ آپ کو علم تھا کہ یہ سچے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور ایک قوم بغیر عذر کے بیٹھ گئی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جرأت کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور فرمایا: وَ قَعَدَ الَّذِیْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ان کے جھوٹ سے مراد ان کا یہ قول ہے: بے شک ہم مومن ہیں اور لیؤذن کو لام کی کے سبب نصب دی گئی ہے۔

لَیْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۙ﴿۹۱﴾ وَّ لَا عَلَى الَّذِیْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَیْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّ اَعْیُنُهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ؕ

”نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو نہیں پاتے وہ مال جسے خرچ کریں (اگر یہ پیچھے رہ جائیں) کوئی حرج جب کہ وہ مخلص ہوں اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے، نہیں ہے نیکوکاروں پر الزام کی کوئی وجہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور نہ ان پر (کوئی الزام ہے) جو جب حاضر ہوئے آپ کے پاس تاکہ آپ سوار کریں انہیں تو فرمایا آپ نے: میں نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں۔ وہ لوٹتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں بہا رہی ہوتی ہیں آنسو اس غم میں کہ افسوس! انہیں ان کے پاس جو وہ خرچ کریں“۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 93

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ الآیہ، یہ ارشاد عاجز آدمی سے تکلیف اور پابندی کے ساقط ہونے میں اصل ہے۔ پس ہر وہ جو کسی شی سے عاجز ہو تو وہ اس سے ساقط ہو جاتی ہے، کبھی ایسے بدل کے ساتھ جو فعل ہوتا ہے اور کبھی ایسے بدل کے ساتھ جو کہ تاوان اور جرمانہ ہوتا ہے اور قوت وطاقت کے اعتبار سے عاجز ہونے یا مال کے اعتبار سے عاجز ہونے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اور اس آیت کی نظیر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ: 286) (ذمہ داری نہیں ڈالتا الله تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی) اور الله تعالیٰ کا یہ ارشاد: لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِیْضِ حَرَجٌ (النور: 61) (نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے)

ابو داؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تحقیق تم نے مدینہ طیبہ میں ایسی اقوام کو چھوڑا ہے کہ تم نے کوئی سفر طے نہیں کیا اور نہ تم نے نفقہ میں سے کچھ خرچ کیا ہے اور نہ تم نے کوئی وادی عبور کی ہے مگر وہ اس میں تمہارے ساتھ ہیں"۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہمارے ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ طیبہ میں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں عذر نے روک لیا ہے" (1)۔ پس اس آیت نے اور اس کے ساتھ اس کی نظائر میں سے جو ہم نے ذکر کی ہیں یہ واضح کر دیا ہے کہ معذوروں پر کوئی حرج نہیں اور یہ وہ قوم ہے جن کا عذر معروف ہے مثلاً اپاہج ہونا، بوڑھا ہونا، نابینا ہونا، لنگڑا ہونا اور وہ اقوام جو خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ پائیں۔ تو فرمایا: ان تمام پر کوئی حرج نہیں ہے۔

اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ جب وہ حق کو پہچان لیں اور اس کے اولیاء سے محبت کریں اور اس کے دشمنوں سے بغض رکھیں۔ علماء نے کہا ہے: پس حق سبحانہ وتعالیٰ نے عذر والوں کو معذور قرار دیا ہے اور دلوں نے اسے برداشت نہ کیا، چنانچہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ احد کے لیے نکلے اور مطالبہ کیا کہ علم انہیں عطا کیا جائے لیکن اسے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پکڑا ہوا تھا۔ پس کفار میں سے ایک آدمی آیا اور اس نے ان کے اسی ہاتھ پر تلوار ماری جس میں وہ علم پکڑے ہوئے تھے تو اس نے اسے کاٹ دیا، آپ نے دوسرے ہاتھ کے ساتھ اسے پکڑ لیا پھر اس نے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی تو آپ نے اسے اپنے سینے سے تھام لیا اور یہ آیت پڑھی: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران: 144) (اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (الله کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول) یہ اس قوم کے عزائم تھے۔ اور الله تعالیٰ فرماتا ہے: لَیْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ (النور: 61) اور یہ اول کے بارے میں ہے۔ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ (النور: 61) اور حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ انصار کے نقباء میں سے تھے آپ لنگڑے تھے اور آپ لشکر کے اگلے حصہ میں موجود تھے۔ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: "بے شک الله تعالیٰ نے تمہیں معذور قرار دیا ہے"۔ تو انہوں نے عرض کی: قسم بخدا! میں یقیناً اپنے اسی لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں نشان زد کرتے ہوئے چلوں گا۔ اس سورت میں اس طرح کی مثالیں گزر چکی ہیں

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 340

جن میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کسی آدمی کو اس حال میں لایا جاتا تھا جیسے دو آدمیوں کے درمیان سہارا دے کر چلایا جاتا تھا یہاں تک کہ اسے صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِذَا نَصَحُوْا، النصح کا معنی ہے اخلاص العمل من الغش عمل کا کسی کدورت کی آمیزش سے خالص ہونا اور اسی سے ہے التوبة النصوح (خالص توبہ) ہے۔ نفطویہ نے کہا ہے: جب کوئی شے خالص ہو تو کہا جاتا ہے: نصح الشیٔ اور نصح له القول کا معنی ہے اس نے بات کو اس کے لیے خالص کر دیا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحة (دین نصیحت (خالص) ہے) آپ نے یہ تین بار فرمایا۔ ہم نے عرض کی: کس کے لیے؟ آپ نے فرمایا: لله ولکتابه ولرسوله ولائمة المسلمین وعامهم (1) (اللہ تعالیٰ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، ائمہ مسلمین کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے) علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے خالص ہونے کا معنی یہ ہے اس کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا، اسے صفات الوہیۃ کے ساتھ متصف کرنا، اسے نقائص سے پاک اور منزہ تسلیم کرنا، اس کی پسندیدہ چیزوں میں رغبت رکھنا اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے دور رہنا۔ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے کہ ان کی نبوت کی تصدیق کرنا، امر و نہی میں نبی کی اطاعت کو لازم پکڑنا، ان سے محبت کرنا جن سے وہ محبت کرے، ان سے عداوت رکھنا جن سے وہ عداوت رکھے، اس کی عزت و توقیر کرنا، ان سے محبت کرنا اور ان کی آل سے محبت کرنا، ان کی تعظیم کرنا اور ان کی سنت کی تعظیم کرنا، نبی کے وصال کے بعد سنت سے بحث کر کے سنت کو زندہ کرنا، اس میں خوب غور و فکر کرنا، اس کی حمایت اور دفاع کرنا، اس کی اطاعت کرنا، اس کی طرف دعوت دینا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ سے آراستہ اور مزین ہونا۔ اسی طرح کتاب اللہ کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے: اسے پڑھنا اور اس میں غور و فکر کر کے اسے سمجھنا، اس کی حمایت اور دفاع کرنا، اس کی تعلیم دینا، اس کی تکریم کرنا اور اس کے مطابق عادات و اخلاق سے آراستہ ہونا۔ اور مسلمانوں کے ائمہ کے لیے خالص ہونے کا معنی یہ ہے ان کے خلاف خروج نہ کرنا، حق کی طرف ان کی رہنمائی کرنا، مسلمانوں کے امور میں سے جس امر سے وہ غافل ہوں اس پر انہیں متنبہ کرنا، ان کی اطاعت کو لازم پکڑنا اور ان کے حق کے اثبات میں کوشش کرنا۔ اور عام مسلمانوں کے لیے خالص ہونے کا معنی ہے، ان کی عداوت اور دشمنی ترک کرنا، ان کی رہنمائی کرنا اور ان میں سے نیکوکاروں سے محبت کرنا، ان تمام کے لیے دعا کرنا اور ان تمام کے لیے خیر اور بھلائی کا ارادہ کرنا۔ اور حدیث صحیح میں ہے: "مومنوں کی باہم ایک دوسرے سے محبت کرنے، آپس میں رحم کرنے اور ایک دوسرے پر مہربان ہونے کی مثال ایک بدن اور جسم کی مثل ہے جب اس میں سے کوئی عضو شکایت کرے تو سارا بدن اس کے لیے جاگنے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے" (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ، مِنْ سَبِيْلٍ یہ ما کا اسم ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی من طریق الی العقوبة (یعنی نیکوکاروں پر سزا کا کوئی راستہ نہیں ہے) یہ آیت ہر نیکوکار سے سزا کے اٹھ جانے (ختم ہو

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 54
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 321

جانے) کے بارے میں اصل ہے۔ اسی لیے ہمارے علماء نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنا ہاتھ کاٹنے والے سے قصاص (بدلہ) لیتا ہے پھر وہ اسے سرایت میں جان سے ہلاک کرنے تک پہنچا دیتا ہے تو بلاشبہ اس کے لیے کوئی دیت نہیں، کیونکہ وہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والے سے قصاص لینے میں محسن ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لیے دیت لازم ہوگی۔ اور اسی طرح جب کوئی نر کسی آدمی پر حملہ کر دے اور وہ اسے اپنی جان کی دفاع میں قتل کر دے تو اس پر کوئی ضمان نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے مالک کے لیے قیمت اس پر لازم ہوگی۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: اسی طرح تمام مسائل شرعیہ میں گفتگو ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عرباض بن ساریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ عائذ بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی مقرن کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے، وہ سات بھائی تھے تمام کے تمام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے، اور ان کے علاوہ کوئی بھی سات بھائی صحابہ میں شامل نہ تھے اور وہ نعمان، معقل، عقیل، سوید اور سنان تھے اور ساتویں کا نام ذکر نہیں کیا گیا (قاموس میں مذکورہ پانچ کے علاوہ عبداللہ اور عبدالرحمن کے دو نام بھی ہیں) یہ مقرن کے بیٹے تھے مزینہ سے ان کا تعلق تھا۔ ساتوں بھائیوں نے ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہوئے اور اس اعزاز میں ان کے سوا کوئی بھی ان کے ساتھ شریک نہیں ہوا، اسے ابن عبدالبر اور ایک جماعت نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تمام کے تمام غزوۂ خندق میں حاضر تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان سات افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو مختلف پیٹوں سے تھے اور وہ روتے ہوئے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں سوار کریں، لیکن آپ نے ایسی کوئی شے نہ پائی جس پر آپ انہیں سوار کرتے۔ ''پس وہ واپس لوٹے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھی اس غم میں کہ افسوس ان کے پاس وہ نہیں جو وہ خرچ کریں''۔ پس انہیں رونے والوں کا نام دیا گیا (یعنی بکائین) اور وہ سالم بن عمیر، بنی عمرو بن عوف میں سے اور علبہ بن زید، بنی حارثہ میں سے تھے۔ اور ابو لیلیٰ عبدالرحمن بن کعب بنی مازن بن نجار میں سے، عمرو بن حمام بنی سلمہ میں سے اور عبداللہ بن مغفل مزنی تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ عبداللہ بن عمرو مزنی تھے اور ہرمی بن عبداللہ بنی واقف میں سے اور عرباض بن ساریہ فزاری تھے، اسی طرح ابو عمر نے ''کتاب الدرر'' میں ان کے نام ذکر کیے ہیں۔ اور ان میں اختلاف ہے۔

علامہ قشیری نے کہا ہے: معقل بن یسار اور صخر بن خنسا اور عبداللہ بن کعب انصاری، سالم بن عمیر، ثعلبہ بن غنمہ اور عبداللہ بن مغفل اور دوسرے تھے۔ انہوں نے کہا: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق آپ نے ہمیں اپنے ساتھ نکلنے کی دعوت دی ہے۔ پس آپ ہمیں ''تیز رفتار گھوڑوں اور چمڑے کے نعلوں پر سوار کیجئے ہم آپ کی معیت میں جنگ لڑیں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں کوئی چیز نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں'' پس وہ واپس چلے اس حال میں کہ وہ رو رہے تھے۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 995 2۔ تفسیر طبری، جلد 10، صفحہ 239

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہمانے کہا ہے: انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ آپ انہیں سواریوں پر سوار کریں (1)، اس وقت ایک آدمی کو دو اونٹوں کی ضرورت تھی، ایک اونٹ جس پر وہ سوار ہوگا اور ایک اونٹ پر وہ اپنا پانی اور زاد راہ لادے گا کیونکہ سفر دور کا تھا۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابوموسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تا کہ آپ سے سواری کا مطالبہ کریں۔ اور آپ نے ذرا غصے کی حالت میں موافقت کی اور فرمایا: ''قسم بخدا! میں تمہیں سوار نہیں کروں گا اور نہ میں کوئی ایسی شے پاتا ہوں جس پر میں تمہیں سوار کروں'' (2)۔ پس وہ روتے ہوئے واپس چلے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور انہیں اونٹ عطا فرمائے۔ تو حضرت ابوموسیٰ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے قسم نہیں کھائی تھی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان شاء اللہ میں جو قسم بھی کھاتا ہوں اور پھر اس کے غیر کو بہتر اور اچھا دیکھتا ہوں تو میں وہ کرتا ہوں جو بہتر اور اچھا ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں'' (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث صحیح ہے، اسے بخاری اور مسلم نے انہی الفاظ اور معنی کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور مسلم میں یہ بھی ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا اور ہمارے لیے پانچ سفید کوہانوں والے اونٹوں کا حکم دیا..... الحدیث۔ اور اس کے آخر میں ہے: ''پس تم چلو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سوار کر دیا ہے'' (4)۔ اور حسن نے بھی اور بکر بن عبداللہ نے کہا ہے: یہ آیت حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ سواری کا مطالبہ لے کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ جرجانی نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے ای ولا علی الذین إذا ما أتوك لتحملهم وقلت لا أجد (اور ان لوگوں پر کوئی حرج نہیں جب وہ آپ کے پاس آئے تا کہ آپ انہیں سوار کریں اور آپ نے یہ کہا: میں نہیں پاتا) پس یہ مبتدا ہے اور یہ اپنے ماقبل پر بغیر واؤ کے معطوف ہے اور جواب تولوا ہے۔

وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ یہ جملہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ حزنا یہ مصدر ہے۔ اَلَّا يَجِدُوْا یہ ان کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: فراء نے کہا ہے ان لا یجدون بھی جائز ہے۔ اور وہ لا بمعنی لیس بناتے ہیں اور وہ بصریوں کے نزدیک أنهم لا یجدون کے معنی میں ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جو وہ چیز نہ پائے جسے وہ اپنے غزوہ میں خرچ کر سکے تو وہ اس پر واجب نہیں ہے۔ اور ہمارے علماء نے کہا ہے: جب آدمی کی عادت مانگنا اور سوال کرنا ہو تو پھر اس پر لازم ہوتا ہے جیسا کہ حج۔ اور وہ عادت کے مطابق نکلا کیونکہ اس کی حالت جب تبدیل نہیں ہوئی تو اس کی طرف فرض اسی طرح متوجہ ہوگا جیسا کہ فرض نفقہ پانے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ اسی قول باری تعالیٰ: وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ میں وہ موجود ہے جس کے ساتھ احوال کے قرائن پر استدلال ہوتا ہے، پھر ان سے وہ بھی جو علم ضروری کا فائدہ دیتے ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو تردید کا احتمال رکھتے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 95
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 47
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 980
4۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان والنذور، جلد 2، صفحہ 47

ہیں۔ پس پہلی قسم جیسا کہ جو آدمی گھر کے پاس سے گزرے تحقیق اس میں رونے کی آواز بلند ہو، رخسار نوچیں جا رہے ہوں، بال مونڈ دیئے گئے ہوں اور آوازیں انتہائی بلند ہوں، گریبان چاک کر دیئے گئے ہوں اور وہ گھر کے مالک کو یا ثبوراہ (ہائے ہلاکت) پکار رہے ہوں، تو اس سے یقیناً جان لیا جائے گا کہ وہ مر گیا ہے۔ اور رہی دوسری قسم تو یہ حکام کے دروازوں پر یتیموں کے آنسو بہانے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾ (یوسف) (اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے) اور وہ جھوٹے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ (یوسف: 18) (اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر) اور اس کے ساتھ چونکہ ایسے قرائن ہیں جن کے سبب غالب طور پر استدلال کیا جا سکتا ہے اور ظاہر اور غالب احوال کی بنا پر اس پر شہادات کی بنا رکھی جا سکتی ہے (1)۔ اور شاعر نے کہا ہے:

إذا اشتبكتْ دموعٌ في خدودٍ تبيّنَ مَنْ بكَى ممن تباكَى

یہ معنی عنقریب سورۂ یوسف میں تفصیلاً آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِیَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾

''الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو اجازت مانگتے ہیں آپ سے حالانکہ وہ مالدار ہیں، وہ راضی ہو گئے اس پر کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر پس وہ (کچھ) نہیں جانتے''۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا السَّبِیْلُ بے شک سزا اور گناہ ان پر ہے۔ عَلَى الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِیَآءُ مراد منافقین ہیں، ان کے افعال بد سے ڈرانے کے لیے برائے تاکید ان کا دوبارہ ذکر کیا۔

یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٤﴾

''وہ بہانے پیش کریں گے تمہارے پاس جب تم لوٹ کر جاؤ گے ان کی طرف، فرمایئے: بہانے مت بناؤ ہم نہیں اعتبار کریں گے تم پر، آگاہ کر دیا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری خبروں پر۔ اور دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارا عمل اور اس کا رسول پھر لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے''۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 996

قولہ تعالیٰ: يَعْتَذِرُونَ اِلَيْكُمْ یعنی منافقین بہانے پیش کریں گے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ یعنی ہم ہرگز تمہاری بات تسلیم نہیں کریں گے۔ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے رازوں اور خفیہ باتوں کے بارے خبر دے دی ہے۔ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ اور اللہ تعالیٰ تمہارا عمل دیکھے گا اس بارے میں جو تم نیا کرو گے۔ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی وہ تمہیں تمہارے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ یہ سب پہلے گزر چکا ہے۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۹۵

”وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی طرف تاکہ تم معاف کر دو انہیں، سو منہ پھیر لو ان سے، یقیناً وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے“۔

قولہ تعالیٰ: سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم تبوک سے ان کی طرف لوٹو گے۔ اس میں محلوف علیہ محذوف ہے، یعنی وہ قسمیں کھائیں گے کہ وہ نکلنے پر قادر نہ تھے۔ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ تاکہ تم انہیں ملامت کرنے سے درگزر کرو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی تم ان سے کلام نہ کرو۔ اور حدیث میں ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے آئے تو آپ نے فرمایا: ”نہ تم ان کے ساتھ بیٹھو اور نہ ان سے کلام کرو“(1)۔ اِنَّهُمْ رِجْسٌ یعنی ان کا عمل ناپاک اور پلید ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے: انهم ذو رجس یعنی ان کا عمل قبیح اور برا ہے۔ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کی منزل اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: ماوی سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس میں رات یا دن کے وقت کوئی شے پناہ لیتی ہے۔ وقد أوى فلان الی منزله یأوی أویا (تحقیق فلاں نے اپنے گھر میں پناہ لی) یہ فعول کے وزن پر ہے اور اواء بھی ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ (ہود: 43) (میں پناہ لے لوں گا پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے) اور آویته أنا ایواء و أویته جب تو اسے اپنے ساتھ اتارے۔ یہ فعلت اور افعلت دونوں ایک معنی میں ہیں۔ یہ ابو زید نے کہا ہے۔ اور ماوی الإبل (واؤ کے کسرہ کے ساتھ) ایک لغت ہے جو ماوی الإبل میں خاص ہے اور یہ شاذ ہے۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۹۶

”وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لیے تاکہ تم خوش ہو جاؤ ان سے، سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے“۔

عبداللہ بن ابی نے قسم کھائی کہ وہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہے گا اور اس نے خواہش یہ کی کہ آپ اس سے راضی اور خوش ہو جائیں۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 96

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

''اعرابی زیادہ سخت ہیں کفر اور نفاق میں اور حق دار ہیں کہ نہ جانیں وہ احکام جو نازل کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کے منافقین کے احوال ذکر کیے تو ان بدوؤں اور اعرابیوں کے احوال بھی ذکر کیے جو مدینہ طیبہ سے باہر اور دور تھے۔ پس فرمایا: ان کا کفر انتہائی شدید اور سخت ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: کیونکہ وہ سنن کی معرفت سے بہت دور تھے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ وہ دل کے اعتبار سے سخت، قول کے اعتبار سے انتہائی خشک، مزاج کے لحاظ سے انتہائی اکھڑ اور قرآن کے سماع سے بہت دور تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فرمایا: وَّ اَجْدَرُ یعنی اور حق دار ہیں (موزوں اور مناسب ہے) اَلَّا يَعْلَمُوْا اس میں أن با کے حذف کے سبب محل نصب میں ہے۔ تو کہتا ہے: جدیر بأن تفعل وأن تفعل (تیرے لیے مناسب ہے کہ تو اس طرح کرے) پس جب با کو حذف کر دیا گیا تو یہ درست نہیں ہوا مگر أن کے ساتھ، اور اگر با کو لے آئیں تو پھر یہ أن کے ساتھ بھی اور اس کے بغیر بھی درست ہے۔ تو کہتا ہے: أنت جدیر أن تقوم وجدیر بالصیام اور اگر تو کہے: أنت جدیر القیام تو یہ غلط ہے۔ اور بلاشبہ أن کے ساتھ درست ہے کیونکہ أن استقبال پر دلالت کرتا ہے تو گویا یہ محذوف کے عوض ہے۔ حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مراد شریعت کے فرائض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد ربوبیت اور رسولوں کی بعثت میں اللہ تعالیٰ کی دلیلیں ہیں (یعنی) اپنی قلت نظر و فکر کی وجہ سے (وہ انہیں نہ جانیں)

مسئلہ نمبر 2۔ جب صورت حال اس طرح ہے اور یہ دوسروں کے مقابلے میں ان کے ناقص ہونے اور مرتبہ کاملہ سے ان کے گرے ہوئے ہونے پر دلیل ہے تو پھر اس پر تین احکام مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) ان کے لیے مال فے اور غنیمت میں کوئی حق نہیں، جیسا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی حدیث ہے۔ اس میں ہے: ''پھر تم انہیں دعوت دو اپنے گھروں سے مہاجرین کے گھروں کی طرف منتقل ہونے کی اور انہیں بتاؤ کہ انہوں نے اگر اس طرح کیا تو اس کے لیے وہ حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے لیے ہیں اور ان پر وہ فرائض ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں پس اگر وہ وہاں سے منتقل ہونے اور پھرنے سے انکار کر دیں تو پھر انہیں بتا دو کہ وہ مسلمان اعرابیوں کی طرح ہوں گے ان پر اللہ تعالیٰ کا وہ حکم جاری ہوگا جو مومنوں پر جاری ہوتا ہے اور ان کے لیے مال فے اور غنیمت میں سے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کریں'' (2)۔

(۲) شہریوں کے بارے جنگل میں رہنے والوں کی شہادت کو ساقط کرنا اس لیے ہے کیونکہ اس میں تہمت متحقق اور ثابت ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے انہوں نے فرمایا: کیونکہ ہر تہمت کی رعایت اور لحاظ نہیں رکھا جاتا اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 8　　2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 82

تمام کے تمام مسلمان آپ کے نزدیک صفت عدالت پر ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ (شاہد) عادل اور پسندیدہ ہو اور یہ صحیح ہے جیسا کہ ہم نے اسے سورۂ بقرہ میں بیان کیا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے یہاں اعرابیوں کو تین اوصاف سے متصف کیا ہے: ان میں سے ایک کفر اور نفاق کے ساتھ۔ دوسرا اس کے ساتھ کہ وہ ایسا مال لیتا ہے جسے وہ تاوان میں خرچ کرتا ہے اور تمہارے بارے میں مصائب و آفات کا انتظار کرتا ہے۔ اور تیسرا اس کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور ایسا مال جمع کرتا ہے جسے وہ ایسے امور میں خرچ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربت کا سبب ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور خوشنودی کا ذریعہ ہیں۔ پس وہ جو اس صفت کے ساتھ متصف ہے تو اس کے بارے میں تو بعید ہے کہ اس کی شہادت قبول نہ کی جائے کہ اسے دوسرے اور پہلے فریق کے ساتھ ملا دیا جائے۔ یہ باطل ہے۔ اور اس بارے میں گفتگو سورۃ النساء میں گزر چکی ہے۔

(۳) کہ ان کا اہل شہر کی امامت کرانا ممنوع ہے، کیونکہ یہ سنت سے جاہل اور جمعہ کو ترک کرنے والے ہیں۔ ابو مجلز نے اعرابی کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ امامت نہیں کرائے گا اگرچہ وہ ان سے بڑھ کر قاری ہو۔ اور حضرت سفیان ثوری، امام شافعی، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اعرابی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے جب وہ نماز کی حدود قائم کرے۔

قولہ تعالیٰ: اَشَدُّ اس کی اصل اشدد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ كُفْرًا یہ بیان (تمیز) ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَّنِفَاقًا یہ اس پر معطوف ہے۔ وَّاَجْدَرُ اس کا عطف اَشَدُّ پر ہے اور اس کا معنی ہے اخلق (زیادہ لائق اور مناسب ہونا) کہا جاتا ہے: فلان جدیر بکذا ای خلیق به (فلاں اس کے لائق اور مناسب ہے) اور أنت جدیر أن تفعل كذا (تیرے لیے مناسب اور لائق ہے کہ تو اس طرح کرے) اس کی جمع جدراء اور جدیرون ہے۔ اور اس کی اصل جدار الحائط سے ہے اور اس سے مراد دیوار کو بنیاد سے اٹھانا ہے۔ پس اس کا قول: هو اجدر بكذا کا معنی ہے وہ اس کے زیادہ قریب ہے اور وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اَلَّا يَعْلَمُوْا یہ اصل میں بأن لا يعلموا ہے۔ اور عرب: لوگوں کی نسل ہیں اور ان کی طرف عربی کی نسبت عربہ کے درمیان ہے اور وہ اہل امصار (شہروں میں رہنے والے) ہیں اور ان میں اعراب صرف جنگل میں رہنے والے ہیں۔ اور شعر فصیح میں اعاریب آیا ہے۔ اور اعراب کی طرف نسبت سے اعرابی ہوا کیونکہ اس کی واحد کوئی نہیں اور اعراب عرب کی جمع نہیں ہے جیسا کہ انباط انبط کی جمع ہے، بلکہ عرب اسم جنس ہے۔ اور عرب عاربہ وہ ہیں جو ان میں سے خالص ہیں۔ اسے اپنے ہی لفظ سے لے کر اس کے ساتھ تاکید لگائی گئی ہے، جیسے تیرا قول: لیل لائل اور بسا اوقات انہوں نے کہا: العرب العرباء اور تعرب کا معنی ہے عرب کے ساتھ مشابہ ہونا۔ اور تعرب بعد هجرته یعنی اپنی ہجرت کے بعد وہ اعرابی ہو گیا۔ اور العرب المستعربه وہ ہیں جو خالص نہیں ہیں۔ اور اسی طرح متعربه ہیں۔ اور العربیه یہ بھی ایک لغت ہے۔ اور یعرب بن قحطان نے سب سے پہلے عربی میں گفتگو کی اور وہ سارے یمن کا باپ ہے۔ اور العُرب اور العَرب دونوں ایک ہیں، جیسے العُجم اور العَجم ہیں۔ اور العُریب، العرب کی تصغیر ہے۔ شاعر کا قول ہے:

ومَكّن الضّباب طعام العُرَيبِ ۔ ولا تَشتهِيه نفوسُ العَجَم

بلا شبہ تعظیماً ان کی تصغیر بنائی، جیسا کہ کہا: أنا جُذَيْلُها المحكك وعُذَيقها المرجب میں امور کا تجربہ کار اور ان کا پاسبان ہوں (اس لکڑی کی مثل جو اجرب اونٹ کی خارش کے لیے گاڑھی جاتی ہے اور اس کھجور کے درخت کی طرح جس کے اردگرد حفاظت کے لیے پتھروں کی منڈیر بنادی جائے)

قشیری نے بیان کیا ہے کہ عربی کی جمع عرب ہے اور اعرابی کی جمع اعراب اور اعاریب ہے۔ اور اعرابی کو جب کہا جائے یا عربی تو وہ خوش ہوتا ہے اور عربی کو جب کہا جائے: یا اعرابی تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اور مہاجرین وانصار عرب ہیں اعراب نہیں۔ اور عرب کا نام عرب رکھا گیا کیونکہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں جنہوں نے عربہ میں نشو ونما پائی اور یہ تہامہ میں سے ہے پس وہ اس کی طرف منسوب ہوئے اور قریش عربہ میں مقیم ہوئے اور وہ مکہ مکرمہ ہے اور تمام عرب اس کے جزیرہ میں پھیل گئے۔

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

''اور بعض بدو ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جو وہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں وہ تاوان ہے اور منتظر ہیں تمہارے لیے (زمانہ کی) گردشوں کے (حقیقت میں) انہی پر ہے بری گردش اور اللہ تعالیٰ سمیع (و) علیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ اس میں من مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا یہ دو مفعول ہیں: تقدیر کلام ینفقہ ہے۔ پھر طول اسم کی وجہ سے ہا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ مغرما اس کا معنی تاوان اور خسارہ ہے۔ اس کا اصل معنی کسی شی کا لازم ہونا ہے۔ اور اسی معنی میں یہ ارشاد ہے: اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ (الفرقان) اس میں غراما بمعنی لازماً ہے، یعنی جو وہ جہاد اور صدقہ میں خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور اس پر کسی ثواب کی امید نہیں رکھتے۔ وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ اس میں التربص کا معنی انتظار کرنا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور دوائر، دائرۃ کی جمع ہے، اس سے مراد وہ حالت ہے جو نعمت سے آزمائش اور مصیبت کی طرف بدلی ہوئی ہو، یعنی وہ جہالت کے سبب خرچ کر کے باطن کی برائی اور دل کے خبث کو جمع کرتے ہیں۔ عَلَيْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ اسے ابن کثیر اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ الفتح میں سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے فتحہ دیا ہے(1)۔ اور قول باری تعالیٰ: مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ (مریم:28) میں سین کے فتحہ پر اجماع کیا ہے۔ اور دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ السوء ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یعنی ان پر ہزیمت (شکست) اور شر کی گردش ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: ان پر عذاب وبلاء کی گردش ہے۔ دونوں نے کہا ہے: امرا سوء ضمہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ نہیں کہا جاتا: ھو امرء عذاب ولا شر۔ اور محمد ابن

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 74

یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: السوء فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی رداءۃ ردی ہونا اور گھٹیا ہونا ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے: مررت برجل صدق اس کا معنی ہے میں ایک صالح آدمی کے پاس سے گزرا۔ اور یہ صدق اللسان (زبان کا سچا ہونا) میں سے نہیں ہے اگرچہ وہ زبان کا سچا ہو کیونکہ تو یہ بھی کہتا ہے: مررت بثوب صدق (میں نے اچھا کپڑا دیکھا) اور مررت برجل سوء اس سے مراد اس کی ابتلاء اور عذاب نہیں، بلکہ اس کا معنی ہے میں ایک فسادی آدمی کے پاس سے گزرا۔ اور فراء نے کہا ہے: السوء فتحہ کے ساتھ مصدر ہے سوتہ سوأ و مساءۃ و سوائیۃ۔ دوسروں نے کہا ہے: اس سے فعل ساء یسوء ہے۔ اور السوء ضمہ کے ساتھ اسم ہے مصدر نہیں اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: علیهم دائرۃ البلاء والمکروہ (ان پر ابتلاء اور مکروہ کی گردش ہے)

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

''اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر اور سمجھتے ہیں جو وہ خرچ کرتے ہیں قرب الٰہی اور رسول (پاک) کی دعائیں لینے کا ذریعہ ہے، ہاں ہاں وہ ان کے لیے باعث قرب ہے، ضرور داخل فرمائے گا انہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں، بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو سچ تسلیم کیا ہے اور ان سے مراد مزینہ قبیلے کے بنو مقرن ہیں۔ اس کا ذکر مہدوی نے کہا ہے۔ قربات یہ قربۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور جمع قرب، قُرُبات، قَرَبات اور قُرْبات ہے۔ اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور القربات ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوا جاتا ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: قربت للہ قربانا (میں اللہ تعالیٰ کے انتہائی قریب ہوا) اور القربۃ قاف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مشکیزہ ہے جس میں پانی بھرا جاتا ہے۔ یہ تھوڑی تعداد میں ہوں تو جمع قربات، قِرِبات اور قربات آتی ہے، اور کثیر تعداد کے لیے قرب آتی ہے۔ اور اسی طرح ہر اس کی جمع آتی ہے جو فعلۃ کے وزن پر ہو، مثلاً سدرۃ اور فقرۃ، تیرے لیے مین کلمہ کو فتح دینا، کسرہ دینا اور سکون دینا سب جائز ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور نافع نے ورش کی روایت میں قربۃ را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اصل ہے۔ اور باقیوں نے اسے تخفیفاً سکون کے ساتھ پڑھا ہے، مثلاً کتب اور رسل اور قربات میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن سعدان نے بیان کیا ہے کہ یزید بن القعقاع نے الا انها قربة لهم پڑھا ہے۔ اور وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ کا معنی رسول کا استغفار کرنا اور دعا کرنا ہے۔ اور صلوٰۃ کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوۃ کا معنی رحمت فرمانا اور خیر و برکت عطا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ (الاحزاب: 43) (اللہ وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم

پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں)) اور ملائکہ کی طرف سے صلوٰۃ کا مطلب دعا کرنا ہے(1)۔ اور اسی طرح یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بھی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَصَلِّ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ:103) (نیز دعا مانگیے ان کے لیے بے شک آپ کی دعا (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لیے) یعنی آپ کی دعا ان کے لیے ثابت قدمی اور طمانیت کا باعث ہے۔ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ یعنی ان کے اخراجات انہیں اللہ تعالیٰ کے رحمت کے قریب کرتے ہیں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۰۰

''اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اس سے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ابد تک یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے اعرابیوں کی اقسام ذکر کیں تو پھر اس نے مہاجرین و انصار کا ذکر کیا اور بیان فرمایا کہ ان میں سے پہلے پہلے ہجرت کرنے والے بھی ہیں اور ان میں سے ان کی اتباع اور پیروی کرنے والے بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی۔ تحقیق ان کے طبقات اور ان کی اصناف کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ہم اس میں سے کچھ ذکر کریں گے اور اس میں غرض اور مدعیٰ بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے وَالْاَنْصَارُ کو السّٰبِقُوْنَ پر عطف کرتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے(2)۔ اخفش نے کہا ہے: الْاَنْصَارِ میں جر اور کسرہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقون مہاجرین و انصار دونوں میں سے تھے۔ اور الْاَنْصَارِ اسلامی نام ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: تمہارے لیے لوگوں کے اس قول کے بارے تمہاری کیا رائے ہے۔ الْاَنْصَارِ کیا یہ نام اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا ہے یا زمانہ جاہلیت میں تمہیں اس کے ساتھ پکارا جاتا تھا؟ تو انہوں نے فرمایا: بلکہ یہ وہ اسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم میں یاد فرمایا ہے۔ اسے ابو عمر نے ''الاستذکار'' میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ مہاجرین و انصار میں سے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو فضیلت دینے پر قرآن کریم کی نص موجود ہے۔ اور وہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور ایک جماعت کا قول ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کے قول کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو بیعت رضوان میں حاضر ہوئے اور اس سے مراد

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1002 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 74

بیعت حدیبیہ ہے۔ یہ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے(1)۔ اور محمد بن کعب اور عطا بن یسار نے کہا ہے: وہ اہل بدر ہیں۔ اور تمام نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جس نے تحویل قبلہ سے پہلے ہجرت کی تو وہ مہاجرین اولین میں سے ہے اس میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اور رہے ان میں سے افضل تو وہ یہ ترتیب ہے:

مسئلہ نمبر3۔ ابو منصور بغدادی تمیمی نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اس پر اجماع کیا ہوا ہے کہ ان میں افضل خلفائے اربعہ ہیں، پھر باقی چھ دس کی تکمیل تک، پھر اصحاب بدر، پھر اصحاب احد پھر بیعت رضوان یا حدیبیہ والے۔

مسئلہ نمبر4۔ اور رہا وہ جوان میں سے سب سے اول اسلام لایا تو مجالد نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، لوگوں میں اسلام لانے کے اعتبار سے اول کون ہے؟ تو انہوں نے کہا: ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ کیا تو نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قول نہیں سنا:

إذا تذكرتَ شَجْوًا من أخي ثقة فاذكر أخاك أبابكر بما فعلا

جب تو قابل اعتماد اور ثقہ بھائی کے کارناموں اور جرأت کا تذکرہ کرے تو اپنے بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان کارناموں کا ذکر کر جو انہوں نے کیے۔

خيرَ البرية أتقاها وأعدلها بعد النبيّ وأوفاها بما حَمَلا

وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقویٰ اور عدل کے اعتبار سے ساری مخلوق سے بہتر اور افضل ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز میں پورا کرنے والے ہیں۔

الثانِيَ التّاليَ المحمود مشهدُه وأوّلَ النّاس منهم صدّق الرسلا (2)

وہ دوسرے ہیں، پیچھے آنے والے ہیں ان کی شہادت قابل ستائش ہے اور لوگوں میں سے سب سے پہلے رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

اور ابو الفرج علامہ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے یوسف بن یعقوب بن ماجشون رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے اپنے باپ اور اپنے مشائخ محمد بن منکدر، ربیعہ بن ابی عبدالرحمن، صالح بن کیسان، سعد بن ابراہیم، عثمان بن محمد اخنسی کو اس حال میں پایا ہے کہ وہ اس بارے میں ذرا شک نہ کرتے تھے کہ قوم میں سے سب سے اول اسلام قبول کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

اور یہی قول حضرت ابن عباس، حضرت حسان اور حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سب سے اول اسلام لایا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں (3)۔ حضرت زید ابن ارقم، حضرت ابوذر اور حضرت مقداد وغیرہم رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے، حاکم ابو عبداللہ نے کہا ہے: میں اصحاب تواریخ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو سب سے پہلے

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 98 2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1003 3۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 98

اسلام لائے وہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں (1)۔ معمر نے حضرت زہری سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اور یہی قول حضرت سلیمان بن یسار، عروہ بن زبیر اور عمران بن ابی انس رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کیا (2)۔ یہ کئی اسناد سے حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور یہی قول حضرت قتادہ، محمد بن اسحاق بن یسار اور ایک جماعت کا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور ثعلبی مفسر نے اس پر علماء کے اتفاق کا دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے اسلام لائیں اور ان کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ کے بعد کون اسلام لایا؟ اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ حنظلی ان روایات کے درمیان تطبیق کرتے ہیں، پس وہ فرماتے ہیں: مردوں میں سے سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسلام لائے، عورتوں میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آزاد کیے ہوئے غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ (3) (سب سے پہلے اسلام لائے)۔ واللہ اعلم

اور محمد بن سعد نے ذکر کیا ہے کہ مجھے مصعب بن ثابت نے خبر دی ہے انہوں نے کہا مجھے ابوالاسود محمد بن عبدالرحمن بن نوفل نے بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور وہ چوتھے یا پانچویں اسلام قبول کرنے والے فرد ہیں۔ لیث بن سعد نے بیان کیا ہے اور ابوالاسود نے مجھے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اس وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی اور روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سات سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی عمر دس برس تھی۔

مسئلہ نمبر 5۔ محدثین کے طریقہ میں سے معروف یہ ہے کہ ہر وہ مسلمان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا وہ آپ کے اصحاب میں سے ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ جس مسلمان نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی یا آپ کا دیدار کیا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہے (4)۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کسی کو صحابی شمار نہ کرتے تھے مگر اسے جو ایک یا دو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقیم رہا اور آپ کی معیت میں ایک یا دو غزوؤں میں شریک ہوا۔ اگر حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ قول صحیح ہے تو پھر یہ لازم کرتا ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو یا جو کوئی اس ظاہری شرط کے نہ پائے جانے میں ان کے ساتھ شریک ہے انہیں صحابہ کرام میں شمار نہ کیا جائے حالانکہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں صحابہ کرام میں سے شمار کرنے میں ہمیں کوئی اختلاف معلوم نہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مہاجرین میں سے اوّل السابقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور علامہ ابن عربی نے بیان کیا ہے: یہ سبقت تین چیزوں کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ الصّفۃ اور وہ ایمان ہے (5) اور زمان و مکان۔ ان وجوہ میں اصل صفات میں سبقت لینا ہے۔ اور اس پر دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو صحیح میں موجود ہے۔ ”ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 2، صفحہ 99　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 515　5۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1002

بعد میں آنے والے اوّلون ہیں مگر یہ کہ انہیں کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہمیں کتاب ان کے بعد دی گئی پس یہ ان کا وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے لیے ہدایت اور رہنمائی فرمائی پس یہودیوں کے لیے آنے والا کل ہے اور عیسائیوں کے لیے آنے والے کل کے بعد آنے والا دن (یعنی پرسوں) ہے''(1)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ سابقہ امم میں سے جنہوں نے زمان کے اعتبار سے ہم سے سبقت لی ہے تو ہم ایمان، اللہ تعالیٰ کے امر کی پیروی، اس کی بارگاہ میں عجز و انکساری، اس کے امر کو تسلیم کرنے، اس کی تکلیف کے ساتھ رضامندی کا اظہار کرنے اور اس کے فرائض و ذمہ داریوں کو برداشت کرنے میں سبقت لے گئے ہیں، ہم اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے اور نہ اس کے ساتھ کسی اور کو اختیار کرتے ہیں، نہ رائے سے اس کی شریعت کو بدلتے ہیں جیسا کہ اہل کتاب نے کہا اور یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے جو وہ عطا فرمائے۔ اس کے آسانی پہنچانے کے ساتھ ہے جس پر وہ راضی ہو۔ ہم ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ عطا فرماتا۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت شریعت کے مناقب میں سے ہر منقبت کی طرف السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کو فضیلت دینے کو متضمن ہے چاہے وہ علم ہو یا دین، شجاعت یا اس کے سوا کوئی اور وصف، اس کا تعلق مال عطا کرنے سے ہو یا اعزاز و اکرام میں رتبہ سے ہو۔ اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف ہے۔ دوسروں پر عطا کے سبب سابقین کو فضیلت دینے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ اس سے لوگوں کے درمیان کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے کہ ان میں سے بعض بعض کو عطا کرنے میں سبقت لے گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کو کہتے تھے: کیا آپ سبقت لے جانے والے کو اس کی طرح قرار دیتے ہیں جس کے لیے سبقت نہیں ہے؟ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلاشبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کیا اور اس کا اجر بھی اسی پر ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے دور میں فضیلت دیتے تھے۔ پھر آپ نے اپنے وصال کے وقت کہا: اگر میں کل تک زندہ رہا تو میں ضرور ادنیٰ لوگوں کو اعلیٰ کے ساتھ ملا دوں گا، پھر اسی رات آپ کا وصال ہو گیا اور خلافت ہمارے آج دن تک اس اختلاف پر قائم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وَالْاَنْصَارُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ الَّذِيْنَ کو انصار کی صفت قرار دے کر اس سے واؤ کو ساقط کر دیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے انہیں رجوع کرا لیا۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے زید کی تصدیق کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف رجوع کر لیا۔ اور کہا: ہم نہیں دیکھ رہے مگر یہ کہ ہم اتنے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے کہ ہمارے ساتھ کوئی اور اسے نہیں پائے گا۔ تو حضرت ابی نے کہا: بلاشبہ میں کتاب اللہ میں سورۂ جمعہ کے شروع میں اس کا مصداق پاتا ہوں: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (الجمعہ:3) (اور دوسرے لوگوں کا بھی ان

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، جلد 1، صفحہ 120

میں سے (تزکیہ کرتا ہے تعلیم دیتا ہے) جو ابھی ان سے آکر نہیں ملے) اور سورۂ حشر میں ہے: وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (الحشر: 10) (اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے)

اور سورۃ الانفال میں یہ قول ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (الانفال: 75) (اور جو لوگ ایمان لائے بعد میں اور ہجرت بھی کی اور جہاد بھی کیا تمہارے ساتھ مل کر تو وہ بھی تمہی میں سے ہیں) پس قراءت واؤ کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول باحسان کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ امور خیر جن میں وہ ان کے افعال و اقوال کی اتباع کرتے ہیں، نہ کہ ان میں جو ہفوات وزلات ان سے صادر ہوئیں، کیونکہ وہ معصوم نہیں رضی اللہ عنہم۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے تابعین اور ان کے مراتب میں اختلاف کیا ہے۔ پس الخطیب الحافظ نے کہا ہے: تابعی وہ ہے جسے صحابی کی صحبت اور معیت حاصل ہو، ان میں سے ہر ایک کو تابع اور تابعی کہا جاتا ہے اور حاکم ابو عبداللہ وغیرہ کا کلام یہ شعور دلاتا ہے کہ اس میں اتنا کافی ہے کہ اس نے صحابی سے سماع کیا ہو یا اس سے ملاقات کی ہو اگرچہ صحبت عرفہ نہ پائی جائے۔ تحقیق یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اسم تابعین کا اطلاق ان پر ہوتا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے۔ جیسا کہ حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص اور وہ جو فتح مکہ کے وقت اسلام لانے والوں میں سے ان کے قریب قریب ہیں، کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو فرمایا: ''میرے لیے میرے صحابہ کو بلاؤ، پس قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی ہر روز احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان کے ایک مد کو اور نہ اس کے نصف کو پہنچ سکتا ہے'' (1)۔

اور تعجب کی بات ہے کہ حاکم ابو عبداللہ نے مقرن مزنی کے دو بیٹوں نعمان اور سوید کو تابعین میں شمار کیا ہے جب انہوں نے تابعین میں سے بھائیوں کا ذکر کیا، حالانکہ وہ دونوں معروف صحابی ہیں اور ان کا ذکر صحابہ کرام میں کیا گیا ہے اور وہ دونوں غزوۂ خندق میں حاضر تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اکبر التابعین اہل مدینہ میں سے فقہائے سبعہ ہیں اور وہ حضرت سعید بن مسیب، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، خارجہ بن زید، ابو سلمہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود اور سلیمان بن یسار رحمہم اللہ ہیں۔ اور بعض بزرگوں نے انہیں ایک شعر میں نظم کر دیا ہے اور کہا ہے:

فخذهم عبيدُالله عروةُ قاسمٌ سعيدٌ أبوبكر سليمانُ خارجه

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تابعین میں سے سب سے افضل حضرت سعید بن مسیب ہیں۔ تو آپ کو کہا گیا: ان کے متصل بعد علقمہ اور اسود ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت سعید بن مسیب اور علقمہ اور اسود۔ (یعنی یہ تینوں فضیلت کے ایک درجے میں ہیں) اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تابعین میں سے افضل قیس، ابو عثمان، علقمہ اور مسروق

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 310

ہیں۔ یہ تمام فاضل ہیں اور تابعین کے بلند رتبہ میں سے ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا: حضرت عطا مکہ مکرمہ کے مفتی تھے اور حضرت حسن، بصرہ کے مفتی تھے۔ پس یہ دو ہیں جو دوسروں کی نسبت زیادہ مال دار اور عام میل جول سے بچنے والے تھے۔ اور ابو بکر بن ابی داؤد سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: عورتوں میں سے تابعین کی سردار حفصہ بنت سیرین اور عمرہ بنت عبد الرحمن ہیں اور ان کے ساتھ تیسری ام الدرداء ہیں اور وہ ان دو کی طرح نہیں ہے۔ حاکم ابو عبد اللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ایک طبقہ تابعین میں شمار کیا جاتا ہے اور ان میں سے کسی کا صحابہ کرام سے سماع صحیح نہیں۔ ان میں سے حضرت ابراہیم بن سوید نخعی ہیں اور یہ ابراہیم بن یزید نخعی فقیہ نہیں ہے۔ اور بکر بن ابی السمیط اور بکر بن عبد اللہ الاشج ہیں۔ اور ان کے سوا کئی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: اور ایک طبقہ ہے جن کا شمار لوگوں کے نزدیک اتباع التابعین میں ہے، حالانکہ انہوں نے صحابہ کرام سے ملاقات کی ہے ان میں سے ابو الزناد عبد اللہ بن ذکوان ہیں، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی ہے۔ اور ہشام بن عروہ ہیں، انہیں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس لایا گیا اور حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہم کے پاس لایا گیا۔ تحقیق انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی پایا ہے۔ اور ام خالد بنت خالد بن سعید بھی ہیں۔ اور تابعین میں ایک طبقہ ہے جنہیں مخضرمین کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عہد جاہلیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو پایا اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور انہیں شرف صحبت حاصل نہ ہوا۔ ان کی واحد مخضرم (راء کے فتحہ کے ساتھ) ہے کأنه خضرم، یعنی گویا یہ اپنے ہم زمانہ ان لوگوں سے کٹ گیا جنہوں نے صحابیت وغیرہ کا رتبہ پالیا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعداد بیس افراد تک پہنچی ہے، ان میں سے ابو عمرو شیبانی، سوید بن غفلہ کندی، عمرو بن میمون الاودی، ابو عثمان النہدی عبد خبر بن یزید الخیرانی (یہ خا کے فتحہ کے ساتھ ہے) اور یہ ہمدان خاندان سے ہے، عبد الرحمن بن مل، ابو الحلال العتکی ربیعہ بن زرارہ ہیں۔ اور ان میں سے وہ جن کا مسلم نے ذکر نہیں کیا، ان میں سے ابو مسلم الخولانی عبد اللہ بن ثوب اور احنف بن قیس ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام اور تابعین کی معرفت کے بارے مختصر تذکرہ ہے جن کی فضیلت کا ذکر قرآن کریم نے کیا، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: 110) (ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے (لوگوں) کی ہدایت و بھلائی کے لیے) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الآیہ (البقرہ: 143) (اور اس طرح ہم نے بنادیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے پسند کیا کہ اگر ہم اپنے بھائیوں کو دیکھ لیں'' (1) الحدیث پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنا بھائی قرار دیا۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے اور اس کے احکام کی ہم نے پیروی کی تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے گروہ میں اٹھائے گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے وسیلہ سے وہ ہمیں اپنے راستے اور اپنے دین سے نہیں ہٹائے گا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 127

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے، پکے ہو گئے ہیں نفاق میں، تم نہیں جانتے ان کو، ہم جانتے ہیں انہیں، ہم عذاب دیں گے انہیں دوبارہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف''۔

قولہ تعالیٰ: وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ یعنی قوم منافقون۔ اور یہ مزینہ، جہینہ، اسلم، غفار اور اشجع کے قبائل تھے (1)۔ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ رہی قوم مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (یعنی اہل مدینہ میں سے ایک قوم ہے جو نفاق پر پکے ہو گئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوا منافقین کی نعت میں سے ہے، پس کلام میں تقدیم و تاخیر ہوگی، اس کا معنی ہوگا: ومن حولکم من الأعراب منافقون مردوا علی النفاق، ومن اهل المدینة مثل ذالك (تمہارے آس پاس بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں جو نفاق پر پکے ہو گئے ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے بھی اسی طرح ہیں) اور مردوا کا معنی ہے وہ قائم اور مضبوط ہو گئے ہیں اور انہوں نے توبہ نہیں کی۔ یہ ابن زید سے منقول ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: وہ اس سے ڈٹ گئے ہیں اور اس کے سوا کا انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں معنی باہم ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ اور کلمہ کا اصل معنی نرمی، ملائمت و ملامست اور خالی ہونا ہے اور خالص ہونا ہے۔ تو گویا وہ نفاق کے لیے خالص ہو گئے ہیں اور اسی سے رملة مرداء ہے یعنی ایسی خالص ریت (صحراء) جس میں کوئی بوٹی نہ ہو۔ اور غصن امرد ایسی ٹہنی جس پر کوئی پتا نہ ہو اور فرس امرد وہ گھوڑا جس پر لٹکنے والے بال نہ ہوں۔ اور غلام امرد ایسا بچہ جس کی جلد صاف ہو، بے ریش ہو۔ اور یہ نہیں کہا جائے گا: جاریة مرداء اور تمرید البناء سے مراد بناء کا ملائم اور نازک ہونا ہے۔ اور اسی سے یہ ارشاد بھی ہے: صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ (النمل: 44) ((یہ پانی نہیں) یہ چمک دار محل ہے) اور تمرید الغصن سے مراد ٹہنی کو پتوں سے خالی کرنا ہے، کہا جاتا ہے: مرد یمرد مرودا و مرادة۔

قولہ تعالیٰ: لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ یہ اس ارشاد کی مثل ہے: لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ (الانفال: 60) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اے محمد ﷺ آپ ان کے امور کے انجام کو نہیں جانتے بلاشبہ ہم نے ان کا علم اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اور یہ معنی اس سے روک رہا ہے کہ کسی کے بارے جنت یا دوزخ کا حکم لگایا جائے۔

قولہ تعالیٰ: سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک بار (عذاب) دنیا میں بیماریوں کے ساتھ اور دوسرا عذاب آخرت (ہم انہیں دیں گے) پس مومن کی بیماری (گناہوں کا) کفارہ ہوتی ہے اور کافر کی بیماری سزا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلا عذاب رسوائی کا ہے (کہ ان کے بارے نبی مکرم ﷺ کو اطلاع

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 396

دے کر (انہیں رسوا کیا) جیسا کہ اس کا بیان منافقین میں آئے گا۔ اور دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے۔ حضرت حسن اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ایک دنیا کا عذاب ہے اور دوسرا قبر کا عذاب ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: پہلا اموال و اولاد کے بارے میں مصائب و آلام میں مبتلا کرنا ہے اور دوسرا قبر کا عذاب ہے(1)۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایک بھوک اور دوسرا قتل کا عذاب ہے۔ فراء نے کہا ہے: ایک قتل اور دوسرا عذاب قبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک قید اور دوسرا قتل ہے۔ یہ قول بھی ہے: ایک ان کے مالوں سے زکوٰۃ لینا اور ان پر حدود جاری کرنا ہے اور دوسرا عذاب قبر ہے(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دو عذابوں میں سے ایک وہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ ۗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (التوبہ:55) (سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد، یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں)

اور آیت سے مقصود عذاب کی اتباع ہے یا ان پر عذاب کو دو گنا کرنا ہے۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کر لیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ، بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"۔

یعنی اہل مدینہ میں سے اور تمہارے آس پاس رہنے والوں میں سے کچھ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کر لیا ہے اور دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا امر مؤخر کر دیا گیا ہے وہ ان کے بارے میں وہی فیصلہ فرمائے گا جو چاہے گا۔ پس پہلی قسم یہ احتمال رکھتی ہے کہ وہ منافق تھے اور نفاق پر پختہ نہ ہوئے تھے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مومن ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: یہ آیت ان دس افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے: اور ان کے بارے میں خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً نازل ہوئی۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: وہ آٹھ افراد تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ چھ تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ پانچ تھے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابولبابہ انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں خاص کر بنی قریظہ کے ساتھ ان کے معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی(3)۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے ان سے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر قلعے سے نیچے اترنے کے بارے گفتگو کی تو آپ نے ان کے لیے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ مراد یہ تھی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ذبح کر دیں گے اگر وہ نیچے اترے۔ پھر جب غلطی کا احساس ہوا تو توبہ کی، ندامت ہوئی اور اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 101　2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 16　3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 20

کے ساتھ باندھ دیا اور یہ قسم کھائی کہ وہ کوئی چیز نہ کھائے گا نہ پئے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کردے یا وہ مرجائے۔ پس وہ اسی حالت پر رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا اور یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھولنے کا حکم فرمادیا۔ اسے علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے۔ اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وَاٰخَرُوْنَ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی شان میں نازل ہوئی اور اس وقت کہا جب ان سے گناہ صادر ہوا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں آپ کے پڑوس میں رہوں گا اور اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس سے ثلث تیرے لیے کافی ہوگا (1) تحقیق رب کریم نے ارشاد فرمایا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا ((اے حبیب!) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں) اسے ابن قاسم اور ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے پیچھے رہنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو اسی طرح باندھ دیا تھا جیسے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی انہیں کھولیں گے اور آپ ان سے راضی ہوں گے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں میں انہیں نہیں کھولوں گا اور نہ میں انہیں معذور قرار دوں گا یہاں تک کہ انہیں کھولنے کا حکم دیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے اعراض کیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں جانے سے پیچھے رہے ہیں“ (2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں کھولا اور ان کا عذر قبول فرمالیا۔ جب وہ کھول دیئے گئے تو انہوں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے وہ اموال ہیں جنہوں نے ہمیں آپ سے پیچھے رکھا، پس آپ ہماری طرف سے انہیں صدقہ کردیجئے اور ہمیں پاک کیجئے اور ہمارے لیے مغفرت طلب کیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے حکم نہیں دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مالوں میں سے کوئی شے لوں“ (3)۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً الآیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ دس افراد تھے ان میں سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مالوں سے تیسرا حصہ لیا اور یہ ان کے ان گناہوں کا کفارہ تھا جن کا انہوں نے ارتکاب کیا۔ پس ان کا برا عمل پیچھے رہنا ہے اس پر اس بارے گفتگو کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کا اجماع ہے۔ اور عمل صالح کے بارے میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس علامہ طبری وغیرہ نے کہا ہے: (اپنے گناہ کا) اعتراف کرنا، توبہ کرنا اور اس (گناہ) پر نادم ہونا (4)۔ اور کہا گیا ہے کہ ان کا وہ عمل صالح جو انہوں نے کیا وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے اور انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا اور انہوں نے کہا: ہم نہ اپنی بیویوں کے قریب جائیں گے اور نہ اپنی اولاد کے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عذر کے بارے حکم نازل فرمادے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: بلکہ عمل صالح ان کا ان غزوات میں شریک ہونا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے گزر چکے تھے۔ اور یہ آیت اگرچہ اعراب کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یوم قیامت

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 20 2۔ اسباب النزول، صفحہ 135 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 17

تک ہر اس آدمی کے حق میں عام ہے جس کے اعمال صالحہ بھی ہوں اور اعمال سیئہ بھی۔ پس یہ امید دلاتی ہے۔ علامہ طبری نے حجاج بن ابی زینب سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا میں نے ابوعثمان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میرے نزدیک اس امت کے لیے قرآن کریم میں اس آیت سے بڑھ کر زیادہ امید افزا کوئی آیت نہیں: وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا (التوبہ: 102) (1)

اور بخاری میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''آج کی رات میرے پاس دو آنے والے آئے اور وہ مجھے لے گئے پس ہم ایک ایسے شہر کے پاس رکے جس کے مکانات سونے اور چاندی کی اینٹوں کے ساتھ بنے ہوئے تھے ہمیں کچھ لوگ ملے جن کی خلقت میں نصف اتنا زیادہ حسین تھا کہ تو نے اس کی مثل نہ دیکھا ہوگا اور نصف اتنا زیادہ قبیح تھا کہ تو نے اس کی مثل نہ دیکھا ہوگا۔ ان دونوں نے انہیں کہا: تم جاؤ اور اس نہر میں کود جاؤ پس وہ اس میں داخل ہو گئے پھر ہماری طرف واپس لوٹ کر آئے تو ان سے وہ بدصورتی اور سیاہی دور ہو چکی تھی اور وہ انتہائی حسین وجمیل صورت میں بدل چکے تھے، تو ان دونوں نے مجھے بتایا: یہ جنت عدن ہے اور یہی آپ کی منزل اور مقام ہے۔ پھر ان دونوں نے کہا: رہی وہ قوم جن کا نصف حصہ حسین اور خوبصورت تھا اور ان کا نصف قبیح اور بدصورت تھا (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ انہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملا جلا دیا اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرمالی ہے'' (2)۔

علامہ بیہقی نے ربیع بن انس کی حدیث سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث اسراء ذکر کی ہے اور اس میں آپ نے فرمایا ہے: ''پھر مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا......'' پھر انہوں نے یہاں تک حدیث ذکر کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتویں آسمان کی طرف اپنے بلند ہونے اور چڑھنے کا ذکر فرمایا تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھائی اور خلیفہ کے نام سے سلام فرمایا ہے پس کتنا اچھا بھائی اور کتنا اچھا خلیفہ ہے اور آنے والا کتنا اچھا ہے، پس اچانک دیکھا سامنے جنت کے دروازے کے پاس کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے جس کے سر کے بال سیاہ وسفید ہیں اور اس کے پاس ایک قوم ہے ان کے چہرے سفید ہیں اور ایک قوم ہے ان کے چہرے سیاہ ہیں اور ان کے رنگوں میں کوئی شے ہے، پس وہ نہر کے پاس آئے اور اس میں غسل کیا پھر وہ اس سے نکلے درآنحالیکہ ان کے رنگوں سے وہ شے صاف ہو چکی تھی، پھر وہ دوسری نہر پر آئے اور اس میں انہوں نے غسل کیا، پس اس سے نکلے تو ان کے رنگوں سے کوئی شے نکل چکی تھی بعد ازاں وہ تیسری نہر میں داخل ہوئے جب اس سے نکلے تو اس کے رنگ اپنے ساتھیوں کے رنگوں کی مثل ہو چکے تھے پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا: اے جبرئیل! یہ سفید چہروں والے کون لوگ ہیں اور یہ لوگ جن کے رنگوں میں کوئی شے تھی پھر وہ نہر میں داخل ہوئے تو ان کے رنگ صاف ہو گئے؟ تو انہوں نے بتایا: یہ آپ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یہ پہلے آدمی ہیں سطح زمین پر جن کے بال سیاہ اور سفید ہے۔ اور سفید اور چمکتے چہروں والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا اور رہے وہ لوگ جن کے رنگوں میں کوئی شے تھی انہوں نے عمل صالح اور برے عمل کو ملا جلا دیا اور پھر اللہ

1۔ تفسیر طبری جلد 11، صفحہ 21
2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 674

تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ اور رہی پہلی نہر تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور رہی دوسری نہر تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اور رہی تیسری نہر تو ان کے رب نے انہیں شراب طہور کے ساتھ سیراب فرمایا"۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّاٰخَرَ سَیِّئًا میں واؤ کے بارے یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی با ہے اور یہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ بمعنی مع ہے، جیسے کہ تیرا قول ہے: استوی الماء والخشبة (پانی لکڑی کے ساتھ برابر ہو گیا) کوفیوں نے اس کا انکار کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: کیونکہ خشبہ کو الماء پر مقدم کرنا جائز نہیں ہے اور آیت میں آخر کو پہلے پر مقدم کرنا جائز ہے لہٰذا یہ خلطت الماء باللبن کے قائم مقام ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"(اے حبیب!) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعے سے نیز دعا مانگیے ان کے لیے، بے شک آپ کی دعا (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً یہ صدقہ جس کے بارے حکم دیا گیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ یہ فرض صدقہ ہے۔ یہ جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور یہی عکرمہ کا قول ہے جس کو قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے ساتھ مخصوص ہے جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ان کے مالوں کا تیسرا حصہ لیا۔ اور فرض زکوٰۃ میں سے یہ کسی میں نہیں ہے۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی آدمی اپنا تمام مال صدقہ کر دے تو ثلث نکالنا اس کے لیے جائز ہے۔ اور استدلال حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔ پہلے قول کی بنا پر یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے آپ پر ہی محصور ہونے کا تقاضا کرتا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی یہ صدقہ نہیں لے سکتا اور اس بنا پر آپ کے ساقط کرنے کے ساتھ صدقہ کا ساقط ہونا اور آپ کے وصال کے ساتھ اس کا زائل ہونا لازم آتا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں منکرین زکوٰۃ نے اسی کے ساتھ تعلق قائم کیا اور انہوں نے کہا: بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے عوض ہمیں پاکیزگی اور برکت عطا فرماتے تھے اور آپ ہمارے لیے دعا فرماتے تھے، حالانکہ آپ کے سوا کسی اور سے ہم نے اسے معدوم پایا ہے اور اس بارے میں ان کے شاعر نے یہ کہا ہے:

أطعنا رسول الله ما كان بيننا　　فيا عجبا ما بال مُلْك أبي بكر(1)

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی ہے آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں پس تعجب ہے ابوبکر کی بادشاہی کو کیا ہوا۔

وإن الذي سألوكم فمنعتم　　لكالتمر أو أحلى لديهم من التمر(2)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1006　　2۔ ایضاً

اور بے شک وہ جو انہوں نے تم سے مانگا اور تم نے انکار کیا وہ کھجور کی مثل یا ان کے نزدیک کھجور سے زیادہ میٹھا ہے۔

سنمنعهم مادام فینا بقیة کرامٌ علی الضراء فی العسر والیسر(1)

ہم ان کا انکار کرتے رہیں گے جب تک ہم میں تنگی اور خوشحالی کی حالت میں مصیبت زدہ لوگوں پر سخاوت اور مہربانی کرنے والے باقی ہیں۔

یہ قسم ان لوگوں کی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف مضبوط اور پختہ طریقہ سے کھڑے تھے اور ان کے حق میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں ضرور ان کے ساتھ جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کیا(2)۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہا ان کا یہ قول کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے لہٰذا آپ کے سوا کوئی اس کے ساتھ ملحق نہیں، تو یہ قرآن سے جاہل، ماخذ شریعت سے غافل اور دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں کا کلام ہے، کیونکہ قرآن کریم میں خطاب کوئی ایک طرز پر وارد نہیں بلکہ مختلف وجوہ پر وارد ہے، پس ان میں سے ایک خطاب تمام امت کی طرف متوجہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (المائدہ:6) (اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لیے)۔ اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ (البقرہ:183) (اے ایمان والو! فرض کیے گئے تم پر روزے) اور اسی طرح کی اور آیات۔

اور ان میں سے ایک خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں نہ لفظوں میں نہ معنی میں، مثلاً ارشاد گرامی ہے: وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (الاسراء:79) (اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز زائد ہے) اور قول باری تعالیٰ: خَالِصَةً لَّكَ (النور:50) یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے) اور ان میں سے ایک خطاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے لفظی طور پر لیکن معنی اور فعلاً تمام امت اس میں شریک ہے، جیسا کہ فرمان ہے: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ الآیہ (الاسراء:78) (نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہونے تک الخ) اور قول باری تعالیٰ: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (النحل:98) (سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ کی الخ) اور یہ ارشاد گرامی: وَ اِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ (النساء:102) (اور (اے حبیب!) جب آپ ان میں موجود ہوں اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز) پس ہر وہ جس پر سورج غروب ہوا وہ نماز کا مخاطب ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جس نے قرآن کریم پڑھا وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنے کا مخاطب ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو ڈرا وہ اس صفت کے ساتھ نماز قائم کرے گا۔ پس اسی قبیلے سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّیْهِمْ بِهَا اور اس معنی میں یہ ارشاد گرامی بھی ہیں: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ (الاحزاب:1) (اے نبی مکرم!) (حسب سابق ڈرتے رہیے اللہ تعالیٰ سے) اور یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق:1) (اے نبی (مکرم) (مسلمانوں سے فرماؤ) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو) (3)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1006 2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 188 3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1008

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ بعض عرب اور وہ قبیلہ دوس کے آدمی تھے نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ بے شک مال سے مراد کپڑے، ساز و سامان اور سامان تجارت ہے، عین (یعنی سونا، چاندی) کو مال کا نام نہیں دیا جاسکتا اور یہ معنی اس سنت میں آیا ہے جو مالک عن ثور بن زید الدیلی عن ابی الغیث سالم مولی ابن مطیع عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم فتح خیبر کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے اور ہم نے سونے اور چاندی میں سے کوئی مال غنیمت نہ پایا مگر اموال، کپڑے اور ساز و سامان (پایا) (1) الحدیث۔ اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے کہ مال صامت سے مراد سونا اور چاندی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صرف اونٹ ہیں اور اسی سے ان کا قول ہے: المال الابل (مال تو اونٹ ہیں) اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد تمام جانور ہیں۔ ابن الانباری نے احمد بن یحییٰ (ثعلب) النحوی سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: سونے اور چاندی میں سے اتنا جو اس مقدار تک پہنچنے سے کم ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ مال نہیں ہے۔ اور یہ شعر بیان کیا ہے:

واللہ ما بلغتْ لی قطُّ ماشیۃٌ حدَّ الزکاۃ ولا إبلٌ ولا مالُ

قسم بخدا! میرے لیے کبھی کوئی جانور زکوٰۃ کی حد کو نہیں پہنچا نہ اونٹ اور نہ ہی مال۔

ابوعمر نے کہا ہے: کلام عرب سے معروف و مشہور یہ ہے کہ ہر وہ جس سے خوشحالی حاصل کی جائے اور امارت حاصل کی جائے وہ مال ہے، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال بلاشبہ مال میں سے اس کا وہ ہے جو اس نے کھایا اور فناہ کر دیا یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا یا صدقہ کر دیا اور ختم کر دیا'': یقول ابن آدم مالی مالی وانما لہ من مالہ ما أکل فافنی أولبس فأبلی أو تصدق فأمضی (2)۔ اور حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: پس آپ نے مجھے ایک زرہ عطا فرمائی تو اس کے عوض میں نے بنی سلمہ میں کھجوروں کا چھوٹا سا قطعہ خریدا۔ وہ پہلا مال تھا جو میں نے اسلام میں حاصل کیا، کمایا۔ پس جس کسی نے اپنا سارا مال صدقہ کرنے کے بارے قسم کھائی تو اس کا اطلاق اس کے مال کی ہر نوع اور ہر قسم پر ہوگا چاہے وہ اس میں سے ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہ ہو، مگر یہ کہ وہ اس میں سے معین شے کی نیت کرے تو پھر قسم کا اطلاق اسی پر ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اطلاق اموال زکوٰۃ پر ہوگا۔ اور علم محیط ہے اور زبان شاہد ہے کہ ہر وہ شی جس کا وہ مالک بنا اسے مال کا نام دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً یہ مطلق ہے ماخوذ اور ماخوذ منہ میں موجود کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں اور نہ اس میں ماخوذ اور ماخوذ منہ (وہ مال جو لیا جائے اور جس سے لیا جائے) کی مقدار کی وضاحت اور بیان ہے۔ بلاشبہ اس کا بیان سنت اور اجماع میں ہے، جیسا کہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔ پس زکوٰۃ تمام مالوں سے لی جائے گی۔ تحقیق حضور نبی کریم ﷺ نے جانوروں، اناج اور سونے چاندی میں زکوٰۃ کو واجب کیا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں اور جو کچھ ان کے سوا ہے مثلاً گھوڑے اور تمام سامان و اسباب ان میں اختلاف ہے۔ عنقریب گھوڑوں اور شہد کا ذکر سورۃ النحل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 407 2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 74

ائمہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کھجوروں کے پانچ وسقوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور چاندی کے پانچ اوقیہ سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور پانچ اونٹوں سے کم میں بھی صدقہ نہیں ہے“ (1)۔ دانوں اور زمین سے اگنے والی ہر شے کی زکوٰۃ کے بارے گفتگو مکمل طور پر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔ اور معادن کے بارے میں سورۃ البقرہ میں اور زیورات کے بارے اس سورت میں کلام گزر چکی ہے۔ اور علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے۔ پس جب ایک آزاد مسلمان چاندی سے بنے ہوئے دو سو درہموں کا مالک ہو، تو یہی وہ پانچ اوقیہ ہیں جن کا بیان حدیث طیبہ میں ہوا ہے۔ اور ان پر پورا سال گزر گیا تو ان کی زکوٰۃ اس پر واجب ہے اور وہ ان کا چالیسواں حصہ یعنی پانچ درہم ہے۔ اور سال کی شرط لگائی گئی ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”مال میں زکوٰۃ نہیں ہوتی یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے“ (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور چاندی میں سے جو دو سو درہم سے زائد ہو تو اس کے حساب سے ہر شے میں چالیسواں حصہ ہے مقدار کم ہو یا زیادہ۔ یہ قول امام مالک، امام لیث، امام شافعی، امام ابو حنیفہ کے اکثر اصحاب، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل، ابو ثور اور اسحاق اور ابو عبید رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور یہی حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: دو سو درہم سے جو زائد ہوں گے ان میں کوئی شے لازم نہ ہوگی یہاں تک کہ زیادتی چالیس درہم تک پہنچ جائے۔ اور جب وہ مقدار چالیس ہو جائے تو ان میں ایک درہم واجب ہوگا اور وہی چالیسواں حصہ ہے (3)۔ یہ قول حضرت سعید بن مسیب، حسن، عطا، طاؤس، شعبی، زہری، مکحول اور عمرو بن دینار اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہی سونے کی زکوٰۃ تو جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جب وہ بیس دینار ہو جائے تو اس کی قیمت دو سو درہم ہوگی اور جو زیادہ ہوگا اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بنا پر ہے، اسے امام ترمذی نے ضمرہ سے اور حارث سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (4)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں نے محمد بن اسماعیل سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: میرے نزدیک دونوں ابو اسحاق سے صحیح ہیں۔ اور احتمال ہے کہ یہ حدیث دونوں سے اکٹھی مروی ہو (5)۔ اور الباجی نے ”المنتقیٰ“ میں کہا ہے: یہ حدیث وہاں اس کی اسناد نہیں ہے، مگر علماء کا اس کے مطابق لینے پر اتفاق کرنا اس کے حکم کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ واللہ اعلم

اور امام حسن اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی کے بعض اصحاب بھی مائل ہوئے ہیں کہ سونے میں زکوٰۃ نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چالیس دینار تک پہنچ جائے۔ اور اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث، حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی حدیث رد کرتی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیس دینار سے نصف دینار لیتے تھے اور چالیس

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 196
2۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 80
3۔ کتاب الاثار، کتاب الزکوٰۃ، صفحہ 92
4۔ سنن ابی داؤد، باب فی زکوٰۃ السائمۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 79

دینار میں سے ایک دینار لیتے تھے (1)۔ اسی پر اہل علم کی جماعت ہے سوائے ان کے جن کا ذکر کردیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ پانچ سے کم اونٹوں میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اور جب ان کی تعداد پانچ ہو جائے تو ان میں ایک بکری لازم ہو جاتی ہے اور "شاۃ" کا اطلاق غنم (ریوڑ) میں سے ایک پر ہوتا ہے اور غنم بکری اور بھیڑ دونوں کے لیے ہے۔ اور اس پر بھی علماء کا اختلاف ہے کہ پانچ اونٹوں میں صرف ایک بکری لازم ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے اور جانوروں کی زکوٰۃ کو اس کتاب (تحریر) میں بیان کیا گیا ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لیے لکھی جب کہ آپ نے انہیں بحرین کی طرف بھیجا۔ اسے امام بخاری، ابو داؤد، دارقطنی، نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے اور تمام اس پر متفق ہیں (2)۔ اور دو مقامات پر اس میں اختلاف ہے۔ ان میں ایک اونٹوں کی زکوٰۃ میں اور وہ یہ کہ جب ان کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچ جائے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صدقہ وصول کرنے والے کو اختیار ہے اگر چاہے تو تین بنات لبون (یعنی ایسی اونٹنی جس کی عمر دو سال مکمل ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو) لے اور اگر چاہے تو دو حقے (ایک حقہ جس کی عمر تین سال مکمل ہو اور وہ چوتھے سال میں داخل ہو چکا ہو) لے لے۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے کہ ابن شہاب نے کہا ہے: اس میں تین بنات لبون ہیں یہاں تک کہ تعداد ایک سو تیس تک پہنچ جائے تو پھر اس میں ایک حقہ اور دو بنت لبون لازم ہوں گی۔ ابن قاسم نے کہا ہے: میری رائے ابن شہاب کے قول کے مطابق ہے۔ اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ عبد العزیز بن ابی سلمہ اور عبد العزیز بن ابی حازم اور ابن دینار امام مالک کے قول کے مطابق کہتے ہیں۔ اور رہا دوسرا مقام تو وہ غنم (ریوڑ) کے صدقہ کے بارے ہے۔ وہ یہ کہ جب ان کی تعداد تین سو ایک بکری سے زیادہ ہو جائے تو حسن بن صالح بن حیی نے کہا ہے: ان میں چار بکریاں لازم ہوں گی۔ اور جب تعداد چار سو ایک ہو جائے تو ان میں پانچ بکریاں لازم ہوں گی۔ اسی طرح جب بھی تعداد زیادہ ہو گی، تو ہر سو میں ایک بکری بڑھ جائے گی۔ اور اسی طرح حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ اور جمہور نے کہا ہے: دو سو ایک بکریوں میں تین بکریاں ہیں، پھر ان میں چار سو تک کوئی شے نہیں ہے اور پھر چار سو میں چار بکریاں ہو جائیں گی، پھر جب بھی ان میں ایک سو زائد ہوں گی تو ان میں ایک بکری بڑھ جائے گی۔ اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں ابن المنذر کو وہم ہوا ہے اور اس میں علماء سے خطا ہوئی ہے، مسئلہ میں اختلاط اور اکثر غلط ہو گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے گائے کی زکوٰۃ کی تفصیل صحیحین میں ذکر نہیں کی اور اسے ابو داؤد، ترمذی، نسائی، دارقطنی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نے موطا میں روایت کیا ہے اور یہ روایت مرسل، مقطوع اور موقوف ہے (3)۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسے ایک قوم نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، مگر وہ جنہوں نے اسے مرسل ذکر کیا ہے وہ ان سے زیادہ ثابت اور ثقہ ہیں جنہوں نے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ اور اسے مسند ذکر کرنے والوں میں سے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1780، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1339، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1789، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1345، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بقیہ نے مسعودی سے، انہوں نے حکم سے اور انہوں نے طاؤس سے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ اور اس روایت میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس کے ساتھ بقیہ ثقہ راویوں سے منفرد ہوتے ہیں اور اسے حسن بن عمارہ نے حکم سے اسی طرح روایت کیا ہے جیسے اسے بقیہ نے مسعودی سے اور انہوں نے حکم سے روایت کیا ہے اور حسن کے ضعف پر اجماع ہے۔ اور یہ خبر طاؤس کی روایت کے علاوہ سے سند متصل کے ساتھ صحیح ثابت ہے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمیں معمر اور ثوری نے اعمش سے انہوں نے ابووائل سے انہوں نے مسروق سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف بھیجا اور حکم ارشاد فرمایا کہ وہ ہر تیس گاؤں میں سے ایک تبیع یا تبیعہ (ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی) لے اور چالیس گاؤں میں سے ایک مسنہ (دو سال کا بچھڑا، بچھڑی) لے اور ہر عاقل بالغ سے ایک دینار یا اس کے برابر معافر کا کپڑا (1) (معافر یمن کا ایک قبیلہ ہے اس کی طرف منسوب چادر کو معافر کہا جاتا ہے) اسے دارقطنی اور ابوعیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (2)۔

ابوعمر نے کہا ہے: علماء کے درمیان اس بارے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گائیوں کی زکوٰۃ کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے جو زکوٰۃ مروی ہے وہ وہ ہے جو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ تیس گائیں میں ایک تبیع اور چالیس میں ایک مسنہ ہے، مگر وہ جو حضرت سعید بن مسیب، ابوقلابہ، زہری اور قتادہ سے مروی ہے، کیونکہ وہ ہر پانچ گائیوں میں تیس تک ایک بکری واجب کرتے ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلقہ یہ تمام تفصیل اپنے اصول و فروع کے ساتھ کتب فقہ میں موجود ہے اور شرکت کا ذکر سورۂ ''ص'' میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: صَدَقَةً یہ الصدق سے ماخوذ ہے، کیونکہ ان کے ایمان کے صحیح ہونے اور اس کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کے سچا ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ یہ ان منافقین میں سے نہیں ہیں جو اطاعت و پیروی کرنے والے مومنین کو صدقات کے بارے میں الزام دیتے ہیں۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا یہ دونوں مخاطب کے لیے حال ہیں، تقدیر کلام یہ ہے: خذها مطهرا لهم و مزكيا لهم بها (تم صدقہ وصول کرو ان کو پاک کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ ان کو بابرکت بناتے ہوئے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ان دونوں کو صدقہ کی صفت بنا دیا جائے ای صدقة مطهرة لهم مزكية (ان کو پاک کر دینے والا صدقہ اور بابرکت بنانے والا) اور تُزَكِّيهِمْ کا فاعل مخاطب ہوگا اور وہ ضمیر جو بها میں ہے وہ موصوف نکرہ کی طرف لوٹے گی۔ اور نحاس اور مکی نے بیان کیا ہے کہ تُطَهِّرُهُمْ صدقہ کی صفت ہے اور وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، خذ کی ضمیر سے حال ہے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الصدقہ سے حال ہو۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ یہ نکرہ سے حال ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: عمدہ یہ ہے کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو، یعنی بے شک آپ انہیں پاک کر دیں اور اس کے سبب انہیں بابرکت بنا دیں۔ یہ قطع (ماقبل سے تعلق کا منقطع ہونا) اور استئناف کی بنا پر ہے۔ اور جواب امر کی بنا پر جزم بھی جائز ہے اور اس کا معنی یہ ہے: اگر آپ ان کے

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 80
2۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مالوں سے صدقہ لیں گے تو وہ انہیں پاک کر دے گا اور بابرکت بنا دے گا اور اسی سے امرء القیس کا قول بھی ہے:

تقانبك من ذکری حبیب و منزل

(تم دونوں ٹھہرو تا کہ ہم اپنے محبوب اور اس کی گھر کی یاد میں رو لیں)

اور حسن نے طا کے سکون کے ساتھ تطھرھم پڑھا ہے اور یہ ہمزہ کے ساتھ طھرو أطھرته سے منقول ہے، مثلاً ظھرو أظھرته۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ہر وہ امام جو صدقہ وصول کرتا ہے اس کے فعل میں اصل یہ ہے کہ وہ صدقہ دینے والے کے لیے برکت کی دعا کرے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب کوئی قوم صدقہ لے کر آتی تو آپ فرماتے: اللھم صل علیھم اے اللہ! ان پر رحمتیں نازل فرما۔ پس حضرت ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! آل ابی اوفیٰ پر رحمتیں نازل فرما'' (1)۔ ایک قوم اسی طرف گئی ہے۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (التوبہ: 84) (اور نہ پڑھیے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی) انہوں نے کہا ہے: پس یہ جائز نہیں ہے کہ کسی پر صلوٰۃ بھیجی جائے مگر یہ کہ یہ صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص ہے، کیونکہ آپ کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا الآیہ (النور: 63) (نہ بنا لو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو)

اور اس وجہ سے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی پر صلوٰۃ نہیں بھیجی جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے ساتھ محصور نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور آیت میں اس کے بعد اس کا بیان آئے گا۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا کرنا اور اس کے ساتھ تسلی دینا اور دلجوئی کرنا واجب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل بنتا ہے: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ یعنی جب آپ ان کے لیے دعا کریں گے جس وقت وہ اپنے صدقات لے کر آئیں گے تو اس سے ان کے دلوں کو سکون حاصل ہوگا اور وہ اس سے خوش ہو جائیں گے۔

اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس آئے تو میں نے اپنی بیوی کو کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی کے بارے سوال نہ کرنا۔ تو اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس سے نکل جائیں گے اور ہم آپ سے کسی شی کے بارے سوال نہیں کریں گے۔ پھر اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ میرے خاوند کے لیے دعا فرمائیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تجھ پر اور تیرے خاوند پر رحمت فرمائے''۔ یہاں پر صلوٰۃ کا لفظ رحمت اور ترحم (رحم کرنے) کے معنی میں ہے۔ صلی اللہ علیك و علی زوجك۔ نحاس نے کہا ہے: تمام اہل لغت نے اس بارے میں بیان کیا ہے کہ ہم اسے جانتے ہیں کہ کلام عرب میں لفظ صلوٰۃ دعا کے معنی میں ہے۔ اور اسی سے الصلوٰۃ علی الجنائز بھی ہے (یعنی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 346

معیوں کے لیے دعا مانگنا)۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے اِنَّ صَلٰوتَكَ صیغہ واحد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے جمع کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور اسی طرح اختلاف اصلاتك تأمرك میں ہے۔ اور سکن کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہ ان کے لیے وقار ہے اور السکن سے مراد وہ شے ہے جس کے ساتھ نفوس کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے اور لیتا ہے صدقات کو اور بے شک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ کہا گیا ہے: پیچھے بیٹھے رہنے والوں میں سے جنہوں نے توبہ نہیں کی انہوں نے کہا: یہ لوگ گزشتہ کل تو ہمارے ساتھ تھے، نہ وہ کلام کرتے ہیں اور نہ وہ (ہمارے ساتھ) بیٹھتے ہیں، تو اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟ اور یہ کون سی خصوصیت ہے جس کے ساتھ ہمارے سوا وہ خاص کر دیئے گئے ہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا پس يَعْلَمُوْٓا میں ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جنہوں نے توبہ نہیں کی پیچھے رہنے والوں میں سے۔ ابن زید نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہو جنہوں نے توبہ کی اور اپنے آپ کو باندھ دیا۔ اور قول باری تعالیٰ: هُوَ، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ان امور کے ساتھ منفرد اور یکتا ہونے کی تاکید کے لیے ہے۔ اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر اس نے کہا ہوتا: إن الله يقبل التوبة تو اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس کے رسول کا قبول کرنا اس کی طرف سے ہی قبول کرنا ہو۔ پس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ ان امور میں سے ہے جس تک نہ کوئی نبی پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ یہ اس بارے میں صریح نص ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی صدقات لینے والا ہے اور ان پر ثواب وجزا عطا فرمانے والا ہے اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ جل وعز کا حق ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم واسطہ ہیں اور اگر آپ کا وصال ہو گیا تو آپ کے بعد آپ کا نائب اور خلیفہ ہی واسطہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اور یہ اس کی وضاحت کر رہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر محصور نہیں ہے۔ اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ قبول فرماتا ہے اور اسے اپنے دائیں دست قدرت کے ساتھ لیتا ہے پھر وہ اسے تم میں سے کسی کے لیے بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کی تربیت اور پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے اور اس کی تصدیق کتاب میں موجود ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 79

ربا (سود) کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے" (1)۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: "کوئی بھی حلال اور طیب کمائی سے ایک کھجور صدقہ نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں دست قدرت سے لیتا ہے"۔ اور ایک روایت میں ہے: "پھر وہ رحمن کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بڑھ جاتی ہے" (2)۔ الحدیث۔

اور یہ بھی روایت ہے: "بے شک صدقہ رحمن کی ہتھیلی میں واقع ہوتا ہے اس سے پہلے کہ سائل کے ہاتھ میں جائے پس وہ اسے بڑھاتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے یا اونٹنی کے بچے کی تربیت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے اسے کئی گنا کر دیتا ہے" (3)۔ ہمارے علماء نے احادیث کی تاویل میں کہا ہے: بلاشبہ یہ صدقہ کے قبول ہونے اور اس پر جزا واقع ہونے سے کنایہ ہے، جیسا کہ اس نے مریض پر انتہائی رحم اور مہربانی فرماتے ہوئے مریض سے اپنی ذات کریمہ و مقدسہ کنایۃً مراد لی ہے اور فرمایا: "اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت اور بیمار پرسی نہیں کی" (4)۔ الحدیث

یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور یمین اور کف کے الفاظ کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ کسی شی کو قبول کرنے والا ہر کوئی بلاشبہ اسے اپنی ہتھیلی اور دائیں ہاتھ کے ساتھ ہی اسے پکڑتا ہے یا اسے اس میں رکھا جاتا ہے۔ تو اسی بنا پر اسے ہی ذکر کیا جسے وہ جانتے اور پہچانتے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہر عضو سے پاک اور منزہ ہے۔ اور یمین کا لفظ عضو خاص (دایاں ہاتھ) کے بغیر بھی کلام عرب میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إذا ما رايةٌ رفعت لمجدٍ تلقّاها عَرابة باليمينِ

یعنی اسے ہی مجد و شرف کا اہل بنایا گیا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد دایاں ہاتھ نہیں ہے، کیونکہ یہ معنوی طور پر بزرگی و شرف ہے پس وہ بزرگی اور شرف جو اس کے ساتھ حاصل ہوتا ہے میں نے اسے معنیً دیکھ لیا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی لفظ یمین ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے کہ "وہ رحمٰن کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے" (5) کا معنی ہے کہ یہ اس میزان عدل کے پلڑے سے عبارت ہے جس میں اعمال کا وزن کیا جائے گا، پس یہ حذف مضاف کے باب سے ہوگا، گویا کہ فرمایا: **فتربو كفة ميزان الرحمٰن** (پس وہ رحمٰن کے میزان کے پلڑے میں بڑھ جائے گی) اور امام مالک، ثوری اور ابن مبارک رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ان احادیث اور جو ان کے مشابہ ہیں ان کی تاویل میں کہا ہے: تم اسے بلا کیف پر ہی محمول کرو۔ یہ ترمذی وغیرہ نے کہا ہے اور اسی طرح اہلسنت والجماعت کے اہل علم کا قول ہے۔

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۗ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵

"اور فرمائیے عمل کرتے رہو پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو اور (دیکھے گا) اس کا رسول اور مومن۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 84۔ ایضاً، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 326
3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1011
4۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 318
5۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 84

اور لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کا پس وہ خبردار کرے گا تمہیں اس سے جو تم کیا کرتے تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَقُلِ اعْمَلُوْا یہ خطاب تمام کو ہے (کہ تم عمل کرتے رہو) فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں تمہارے اعمال پر اطلاع دینے کے سبب (وہ تمہارے اعمال کو دیکھیں گے) اور حدیث میں ہے اگر کوئی آدمی ایسی چٹان میں عمل کرے جس کا کوئی دروازہ نہ ہو اور نہ اسے کوئی سوراخ ہو تو پھر بھی اس کا عمل لوگوں کی طرف نکل جائے گا جیسے بھی وہ ہوا"۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

"اور دوسرے لوگ ہیں (جن کا معاملہ) ملتوی کر دیا گیا ہے اللہ کا حکم (آنے) تک چاہے وہ عذاب دے انہیں اور چاہے تو یہ قبول فرمائے ان کی۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے"۔

یہ آیت ان تین کے بارے میں نازل ہوئی جن کی توبہ قبول کر لی گئی: وہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ یہ بنی واقف سے تھے اور مرارہ بن ربیع تھے (1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ابن ربعی العمری تھا۔ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے حالانکہ یہ خوشحال تھے، جیسا کہ ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اور تقدیر کلام ہے ومنھم آخرون مرجون یہ أرجاتہ سے ہے یعنی میں نے اسے مؤخر کر دیا۔ اور اسی سے مرجئۃ کہا گیا ہے، کیونکہ ان کا معاملہ ملتوی اور مؤخر کر دیا گیا۔ حمزہ اور کسائی نے مرجون بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أرجیتہ سے ہے یعنی میں نے اسے مؤخر کر دیا (أخرتہ) اور مبرد نے کہا ہے: أرجیتہ بمعنی أخرتہ نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ الرجاء سے ہوگا۔ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ، إما عربی میں دو امروں میں سے ایک کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ چیزوں کے انجام کو جاننے والا ہے، البتہ بندوں کو خطاب اس بنا پر کیا جاتا ہے جسے وہ جانتے ہیں، یعنی چاہیے کہ ان کا معاملہ تمہارے نزدیک امید افزا ہو جائے کیونکہ بندوں کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی ہے مسجد نقصان پہنچانے کے لیے، کفر کرنے کے لیے اور پھوٹ ڈالنے کے لیے مومنوں کے درمیان اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لیے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 105

سے اب تک۔ اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ صاف جھوٹے ہیں"۔

اس میں دس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا یہ کلام معطوف ہے، یعنی ومنهم الذين اتخذوا مسجدا (اور ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے مسجد بنائی) اس میں جملہ کا عطف جملہ پر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو مثلاً انهم يعذبون (بے شک وہ عذاب دیئے جائیں گے) یا اسی کی مثل کوئی اور۔ اور جنہوں نے بغیر واؤ کے الذين پڑھا ہے اور یہ اہل مدینہ کی قراءت ہے تو یہ ان کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ اور خبر لا تقم ہے تقدیر کلام ہے: الذين اتخذوا مسجدا لا تقم فيه أبدا، ای لا تقم فی مسجدهم (جنہوں نے مسجد بنائی آپ ان کی مسجد میں (نماز کے لیے) کبھی کھڑے نہ ہوں) یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: مبتدا کی خبر یہ ہوگی۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ (التوبہ:110) (ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خبر يعذبون ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ روایت کیا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ قیصر کے پاس گیا اور عیسائی ہو گیا اور قیصر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ عنقریب ان کے پاس آئے گا، پس انہوں نے مل کر مسجد ضرار بنائی اور وہ اس میں اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے کہا ہے اور اس کا واقعہ سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

اور اہل تفسیر نے کہا ہے: بے شک عمرو بن عوف نے مسجد قبا بنائی اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور اس میں نماز ادا فرمائی، پس ان کے بھائیوں بنو غنم بن عوف نے ان کے ساتھ حسد کیا اور یہ کہا: ہم مسجد بنائیں گے اور ہم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجیں گے اور آپ ہمارے پاس تشریف لائیں گے تاکہ آپ ہمیں اسی طرح نماز پڑھائیں جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے بھائیوں کی مسجد میں نماز پڑھائی اور اس میں ابو عامر نماز پڑھے گا جب وہ شام سے آئے گا، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپ تبوک کی طرف جانے کی تیاری فرما رہے تھے۔ اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق ہم نے صاحب حاجت، بیمار، سخت آندھی والی رات وغیرہ کے لیے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس میں ہمیں نماز پڑھائیں اور برکت کے لیے دعا فرمائیں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ اب میں سفر پر جانے لگا ہوں اور انتہائی مشغول حالت میں ہوں پس اگر ہم واپس آئے تو ہم تمہارے پاس آئیں گے اور تمہیں اس میں نماز پڑھائیں گے" (1)۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو وہ آپ کے پاس آئے درآنحالیکہ وہ اس کے کام

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012

سے فارغ ہو چکے تھے اور انہوں نے اس میں جمعہ، ہفتہ اور اتوار کی نمازیں پڑھ لی تھیں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص منگائی تا کہ آپ اسے پہنیں اور آپ ان کے پاس جائیں تو اتنے میں آپ پر مسجد ضرار کے خبر کے بارے قرآن کریم نازل ہوا۔ پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن دخشم، معن بن عدی، عامر بن سکن اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو بلایا، اور انہیں فرمایا: ''جاؤ اس مسجد کی طرف اس کے بنانے والے ظالم ہیں اور تم اسے گرا دو اور اسے جلا کر راکھ کر دو'' (1)۔ پس وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نکلے اور مالک بن دخشم نے اپنے گھر سے آگ کا انگارہ لیا اور اٹھے پھر مسجد کو جلا دیا اور اسے گرا دیا اور جنہوں نے اسے بنایا تھا وہ بارہ آدمی تھے: خذام بن خالد یہ بنی عبید بن زید سے تھا اور یہ بنی عمرو بن عوف میں سے ایک تھا اور اس کے گھر سے مسجد ضرار (کی جگہ) نکالی گئی، معتب بن قشیر، ابو حبیبہ بن الازعر، عباد ابن حنیف یہ سہل بن حنیف کا بھائی تھا جو بنی عمرو بن عوف میں سے تھا، جاریہ بن عامر اور اس کے دو بیٹے مجمع اور زید ابنا جاریہ، نبتل بن حارث، بحزج، بجاد بن عثمان، ودیعہ بن ثابت اور ثعلبہ بن حاطب کا ذکر بھی ان میں کیا گیا ہے (2)۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے: یہ محل نظر ہے، کیونکہ یہ بدر میں حاضر تھا۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک آدمی سے پوچھا تو نے اس مسجد میں کیا مدد کی تھی؟ تو اس نے کہا: میں نے اس میں ایک ستون کے ساتھ مدد کی۔ تو آپ نے فرمایا: اس کے بارے تجھے بشارت ہو! جہنم کی آگ کا ایک ستون تیری گردن میں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: ضِرَارًا یہ مصدر مفعول من اجلہ ہے۔ وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا یہ سارا معطوف ہے۔ اور اہل تاویل نے کہا ہے: ضرارا بالمسجد (مسجد کے ساتھ نقصان پہنچانے کے لیے) نہ کہ للمسجد ضرار (مسجد کو نقصان پہنچانے کے لیے) بلاشبہ یہ نقصان مسجد بنانے والوں کو ہوا (3)۔ اور دار قطنی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی نقصان نہیں اور کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں جس نے کسی کو نقصان اور ضرر پہنچایا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اسے ضرر اور نقصان پہنچائے گا اور جس نے کسی کو تنگ کیا اللہ تعالیٰ اسے اس پر شاق پہنچائے گا'' (4)۔ بعض علماء نے کہا ہے: ضرر وہ ہے جس کے سبب تجھے منفعت حاصل ہو اور اس میں تیرے پڑوسی کے لیے نقصان ہو۔ اور ضرار وہ ہے جس میں تیرے لیے منفعت نہ ہو اور تیرے پڑوسی کے لیے اس میں نقصان ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں ایک معنی میں ہیں، تاکید کی بنا پر دونوں کے ساتھ اکٹھی کلام کی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ ایک مسجد کے پہلو میں دوسری مسجد بنائی جائے اور اسے گرا دینا واجب ہے اور اس کو بنانے سے روکنا لازم ہے تا کہ پہلی مسجد والے پھر نہ جائیں کہ وہ اس حال میں باقی رہ جائے کہ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو، مگر یہ کہ محلہ بڑا ہو اور اس کے باسیوں کے لیے ایک مسجد کافی نہ ہو تو اس وقت دوسری مسجد بنائی جا سکتی ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے کہا ہے: یہ مناسب نہیں کہ ایک شہر میں دو یا تین جامع مساجد بنائی جائیں، دوسری کو روکنا

1۔ اسباب النزول، صفحہ 136
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 29
3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012
4۔ سنن دار قطنی، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 228

واجب ہے اور جس نے اس میں جمعہ کی نماز پڑھی تو وہ جائز نہ ہوگی۔ تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو جلانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور اسے گرا دیا تھا۔ علامہ طبری نے شقیق سے بیان کیا ہے کہ وہ آئے تاکہ مسجد بنی غاضرہ میں نماز پڑھیں تو انہوں نے نماز کو پایا کہ وہ فوت ہو چکی ہے (یعنی اس کا وقت گزر چکا ہے) تو آپ کو کہا گیا کہ بنی فلاں کی مسجد میں اس کے بعد نماز نہ پڑھیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس میں نماز پڑھنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ ضرر پہنچانے کی نیت سے بنائی گئی ہے(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: ہر وہ مسجد جو ضرر پہنچانے یا ریاکاری اور شہرت کی خاطر بنائی جائے تو وہ مسجد ضرار کے حکم میں ہے اس میں نماز جائز نہ ہوگی۔ اور نقاش نے کہا ہے: اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آدمی کنیسہ (عیسائیوں کی عبادت گاہ) اور اس طرح کے دیگر مقامات میں نماز نہ پڑھے کیونکہ اسے شر کے ارادہ پر بنایا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس سے یہ لازم نہیں آتا، کیونکہ گرجا گھر کی تعمیر سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہوتا، اگرچہ اس کی اصل بنیاد شر پر ہے، عیسائیوں نے کنیسہ اور یہودیوں نے بیعہ (یہودیوں کا عبادت خانہ) بنایا یہ وہ جگہ ہے جس میں وہ اپنے زعم کے مطابق عبادت کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے لیے مسجد ہے، پس یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ تحقیق علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی نے کنیسہ یا بیعہ میں پاک جگہ پر نماز پڑھی ان کی نماز جائز گی اور ادا ہو جائے گی۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیعہ میں نماز پڑھ لیتے تھے جب اس میں بت اور تصاویر وغیرہ نہ ہوتیں (2)۔ اور ابو داؤد نے حضرت عثمان بن ابی العاص سے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ طائف میں وہاں مسجد بنائیں جہاں ان کے بت تھے (3)۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے کہا ہے: بے شک جو کوئی ظالم کا امام ہو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی، مگر یہ کہ اس کا عذر ظاہر ہو جائے یا وہ توبہ کر لے، کیونکہ وہ بنی عمرو بن عوف جنہوں نے مسجد قبا بنائی انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ان کے زمانہ خلافت میں پوچھا کہ آپ مجمع بن جاریہ کو اجازت عطا فرمائیں کہ وہ انہیں ان کی مسجد میں نماز پڑھائیں۔ تو آپ نے فرمایا: نہیں اور نہ یہ کوئی معین اور خاص انعام ہے! کیا یہ مسجد ضرار کا امام نہیں رہا۔ تو مجمع نے آپ کو عرض کی: اے امیر المومنین! آپ میرے بارے میں جلدی نہ کیجئے، قسم بخدا! میں نے اس میں نماز پڑھی اور میں اسے نہیں جانتا تھا جو انہوں نے اس بارے میں (اپنے ذہنوں میں) چھپا رکھا تھا، اگر میں جانتا ہوتا تو میں انہیں اس میں نماز نہ پڑھاتا، میں ایک قرآن پڑھنے والا بچہ تھا اور وہ شیوخ تھے، تحقیق انہوں نے اپنی جاہلیت پر ہی زندگی گزاری اور وہ قرآن میں سے کوئی شے نہ پڑھتے تھے، سو میں نے انہیں نماز پڑھائی اور میں یہ گمان نہیں کرتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ میں اس کے بارے جانتا ہوں جو ان کے دلوں میں تھا۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں معذور قرار دیا اور اسے تسلیم کیا اور انہیں مسجد قبا میں نماز کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 33

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 62

3۔ سنن ابی داؤد، باب فی بناء المساجد، حدیث نمبر 380۔ ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن ابن ماجہ، باب این یجوز بناء المساجد، حدیث نمبر 734، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے حکم ارشاد فرمایا۔(1)

مسئلہ نمبر 5۔ ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب وہ مسجد جو عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے اور شریعت نے اس کے بنانے پر برانگیختہ کیا ہے اور کہا ہے: ”جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی اگرچہ وہ اس گڑھے کی مانند ہو جو کونج نے انڈے دینے کے لیے بنایا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا“۔ اسے گرادیا جائے گا اور اکھیڑ دیا جائے گا جب کہ اس میں دوسروں کے لیے ضرر اور نقصان ہو، تو پھر اس کے سوا کے لیے تیرا کیا خیال ہے، بلکہ وہ زیادہ اس لائق ہے کہ اسے زائل کیا جائے اور گرادیا جائے یہاں تک کہ پرانی کسی چیز کے لیے ضرر اور نقصان نہ ہو۔ اور یہ اس کی طرح ہے جس نے تنور کے علاوہ روٹیاں پکانے کی جگہ یا چکی بنائی یا کنواں کھودا یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے بنائی جس کے سبب ضرر اور نقصان کسی دوسری شے کو پہنچ سکتا ہے، تو اس بارے ضابطہ یہ ہے کہ جس کسی نے اپنے بھائی کو ضرر اور نقصان میں ڈال دیا تو اسے منع کیا جائے گا۔ اور اگر اس نے اپنے بھائی کو نقصان میں ڈالا ایسے فعل کے ساتھ جو فعل اس نے اپنے مال میں کیا تھا اور اس نے اپنے پڑوسی یا غیر پڑوسی کو نقصان پہنچایا تو پھر اس کے کام کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر اسے چھوڑنا فاعل کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو اس ضرر سے جو اسے کرنے سے ہے تو پھر دونوں نقصانوں اور ضرروں میں سے بڑے اور اعظم کو ختم کر دیا جائے گا اور ان دونوں میں سے اعظم اصول میں حرمت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی آدمی نے اپنے گھر میں روشن دان کھولا وہ اس سے اپنے بھائی کے گھر جھانکتا ہو اور اس میں اس کے اہل و عیال ہوں اور عورتوں کی حالت اپنے گھروں میں یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بعض کپڑے اپنے کام کاج کے وقت اتار دیتی ہیں اور انہیں کھول دیتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ شرمگاہوں (عورتوں) پر جھانکنا حرام ہے اور اس بارے میں نہی وارد ہے۔ پس شرمگاہوں (یعنی عورتوں) پر جھانکنے کی حرمت کی وجہ سے علماء نے یہ رائے دی ہے کہ وہ کھلے دروازہ کو بند کر دیں اور اس روشن دان کو جو اس نے کھولا بلاشبہ اس کے کھولنے میں اس کے لیے منفعت اور راحت ہے اور اسے بند کرنے میں اس کا ضرر اور نقصان ہے لیکن انہوں (علماء) نے دو ضرروں میں سے بڑے کو ختم کرنے کا قصد کیا ہے، کیونکہ ان دو میں سے ایک کو ختم کرنے سے کوئی چارہ کار نہیں اور اس باب میں حکم اسی طرح ہے، بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے جنہوں نے یہ قول کیا ہے۔ اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر کسی آدمی نے اپنی مملوکہ زمین میں کنواں کھودا اور دوسرے نے اپنی ملکیتی زمین میں کنواں کھودا کہ وہ اس میں پہلے کنوئیں کا پانی چرا لے تو یہ جائز ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی ملکیت میں کنواں کھودا ہے لہٰذا اسے منع نہیں کیا جائے گا۔ اور اس کی مثال ان کے نزدیک یہ ہے: اگر کسی نے اپنے پڑوسی کے کنوئیں کے پہلو میں (بیت الخلاء کا) گڑھا کھودا جو اس کے پانی کو خراب اور فاسد کر دے تو اس کے لیے اسے منع کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس نے اپنی ملکیت میں تصرف کیا ہے، حالانکہ قرآن و سنت دونوں اس قول کو رد کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق

اور اس باب میں ضرر کی دوسری وجہ ہے جس سے علماء نے منع کیا ہے (وہ یہ ہے) مثلاً تنور کا دھواں، حمام کا دھواں، گندم وغیرہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 327

دانے گاہنے کا گرد وغبار، وہ کیڑے جو کھلی زمین میں پھیلی ہوئی لید اور گوبر میں پیدا ہوتے ہیں اور جو بھی ضرر اس قسم کا ہو تو جونہی اس کا ضرر ظاہر ہو اور اس کے پھیلنے اور بڑھنے کا خدشہ ہو تو اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور رہا وہ جو تھوڑے سے وقت کے لیے ہو مثلاً کپڑے جھاڑنا اور دروازوں پر پڑا ہوا گرد وغبار جھاڑنا، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس سے لوگوں کو کوئی چارہ کار نہیں۔ اور یہ ان میں سے بھی نہیں ہے جس کے ساتھ کوئی شے لازم ہوتی ہو، پس اس کی مثل سے روکنے میں ضرر کی نفی تھوڑی دیر اس پر صبر کرنے سے اعظم اور بڑی ہے۔ اور ایک پڑوسی کے لیے اپنے پڑوسی کے ساتھ آداب معاشرت میں سے یہ ہے کہ وہ اس کی اذیت رسانی پر اتنا صبر کرے جس پر وہ قدرت رکھتا ہے، جیسا کہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اذیت نہ دے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اس باب میں داخل ہونے والے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے جسے اسماعیل بن ابی اویس نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ ان سے ایک عورت کے بارے میں پوچھا گیا جسے جنوں میں سے کسی نے مس کیا ہو، پس جب اس کا خاوند اس کے پاس آتا ہے اور وہ جنبی ہو جائے یا وہ اس کے قریب ہو تو اس کے سبب وہ حملہ شدید ہو جاتا ہے (یعنی جن کی تکلیف اور اذیت بڑھ جاتی ہے) تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ وہ اس کے قریب جائے، بلکہ میں تو حاکم وقت کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس آدمی اور اس کی عورت کے درمیان حائل ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَّ كُفْرًا جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ نہ مسجد قبا کی کوئی حرمت ہے اور نہ ہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کی (کوئی تکریم ہے) تو کیا وہ اس اعتقاد کے ساتھ کافر نہیں ہوئے؟(1) یہ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَّ كُفْرًا یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو آپ لے کر آئے (کفر کرتے ہوئے انہوں نے مسجد بنائی) یہ علامہ قشیری وغیرہ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَّ تَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ان کی جماعت اس کے ساتھ تفرقہ ڈال رہی ہے تا کہ لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ جائیں۔ اور یہ اس بات پر تیری راہنمائی کرتی ہے کہ جماعت قائم کرنے سے سب سے بڑا مقصد اور واضح اور ظاہر غرض تالیف قلوب ہے اور اطاعت پر کلام کرنا ہے اور ایک دینی فعل کے ساتھ عزت وحرمت کو لانا ہے تا کہ باہم ملنے سے انس ومحبت واقع ہو جائے اور دل حسد اور کینے کی میل سے صاف ہو جائیں (2)۔

مسئلہ نمبر 9۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ سمجھا اور کہا: ایک مسجد میں دو اماموں کے ساتھ دو جماعتیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ نظریہ تمام علماء کے خلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منع کا حکم مروی ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ کو متفرق کرنا ہے اور جماعت کی حکمت کو باطل کرنا ہے اور یہ اس قول کا ذریعہ اور سبب ہے جو جماعت سے الگ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے لیے عذر ہو پس تو وہ اپنی جماعت کا اہتمام کرلے اور اپنا امام آگے کرلے نتیجۃً اختلاف پیدا ہو جائے گا اور نظام باطل ہو جائے گا اور یہ چیز ان پر مخفی ہے۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہی نظریہ ہے جس کی یہ شان ان کے ساتھ ہے اور یہ حکمت میں ان سے زیادہ ثابت قدم رکھنے والا ہے اور شریعت کی قطعیت کے بارے زیادہ آگاہ کرنے والا ہے (3)۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1012 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 1013 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اس میں مراد ابو عامر راہب ہے (1)۔ اسے راہب کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ عبادت گزار تھا اور علم کی تلاش میں لگا رہتا تھا پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کرتے ہوئے قنسرین میں حالت کفر میں مر گیا۔ اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا: میں جو قوم بھی تمہارے ساتھ قتال کرتے ہوئے پاؤں گا تو میں ان کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھ قتال کروں گا، پس وہ غزوۂ حنین تک لگاتار آپ کے خلاف جنگ لڑتا رہا۔ اور جب بنو ہوازن شکست سے دوچار ہوئے تو وہ روم کی طرف نکل گیا اور عیسائی ہو گیا اور اس نے منافقوں کی طرف پیغام بھیجا تم طاقت اور ہتھیاروں میں سے جتنی استطاعت رکھتے ہو اس کے مطابق تیاری کرو اور ایک مسجد بناؤ کیونکہ میں قیصر کی طرف جا رہا ہوں اور میں رومیوں کے ایک لشکر کے ساتھ آؤں گا اور میں یقیناً حضرت محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مدینہ طیبہ سے نکال دوں گا، چنانچہ انہوں نے مسجد ضرار بنائی (2)۔ اور یہی ابو عامر حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ کا والد ہے۔ اور الارصاد کا معنی ہے انتظار کرنا، آپ کہتے ہیں: أرصدت کذا جب تو کام کے بارے اسے تیار کرے اس کا انتظار کرتے ہوئے۔ ابو زید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رصدته و أرصدته فی الخیر (یعنی یہ دونوں فعل مجرد اور مزید فیہ۔ خیر اور بھلائی کے کاموں کے لیے بولے جاتے ہیں) اور شر کے بارے میں أرصدت له بولا جاتا ہے۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: صرف أرصدت کہا جاتا ہے اور اس کا معنی ارتقبت (میں نے انتظار کیا) ہے (3)۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے مسجد ضرار بنانے سے پہلے۔ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى یعنی ہم نے اسے بنانے سے سوائے نیکی اور خیر کے کوئی ارادہ نہیں کیا۔ اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور دوستی کرتا ہے جیسا کہ انہوں نے بیماروں اور حاجت مندوں کا ذکر کیا اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ افعال مقصود و ارادوں کے ساتھ مختلف ہو جاتے ہیں، اسی لیے فرمایا: وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے خبث باطن کو جانتا ہے اور جس پر وہ قسم کھا رہے ہیں اس میں ان کے جھوٹا ہونے کو بھی جانتا ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝۱۰۸

"آپ نہ کھڑے ہوں اس میں کبھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دن سے وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ کھڑے ہوں اس میں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو۔ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا، فِيْهِ کی ہ ضمیر کا مرجع مسجد ضرار ہے، یعنی آپ اس میں نماز کے لیے کبھی کھڑے نہ ہوں۔ اور کبھی نماز کو قیام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان یقوم اللیل یعنی فلاں رات کے وقت نماز

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1013
2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 32
3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1013

پڑھتا ہے۔ اور اسی طرح صحیح حدیث بھی ہے: من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ (1) (جس نے رمضان المبارک میں ایمان اور اخلاص نیت کے ساتھ نماز پڑھی تو اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے گئے) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:..... پس اسے ذکر کیا۔ تحقیق یہ بھی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس راستے سے بھی نہ گزرتے تھے جس میں مسجد تھی اور اس کی جگہ کو کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ بنانے کا حکم دے دیا کہ اس میں مردار، گندگیاں اور کوڑا پھینکا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَبَدًا یہ ظرف زمان ہے اور ظرف زمان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ظرف جو مقدر اور معین ہے مثلاً الیوم، اور دوسری ظرف مبہم ہے جیسے الحین اور الوقت اور ابد بھی اسی قسم سے ہے اور اسی طرح دھر بھی ہے (2) اور یہاں ایک اصولی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ابد اگرچہ ظرف مبہم ہے اس میں عموم نہیں ہے لیکن جب یہ لا نافیہ کے ساتھ متصل ہوا تو اس نے عموم کا فائدہ دیا، پس اگر فرماتا: لَا تَقُمْ تو یہ مطلق رکھنے میں کافی ہوتا۔ اور جب فرمایا: ابدا تو گویا یہ فرمایا: فی وقت من الاوقات ولا فی حین من الاحیان (یعنی اوقات میں سے کسی بھی وقت میں اس میں کھڑے نہ ہوں) رہا وہ نکرہ جو مثبت کلام میں ہو تو جب وہ کسی واقعہ کے بارے خبر ہو تو وہ عام نہیں ہوتا، تحقیق اہل لسان نے یہی سمجھا ہے اور فقہائے اسلام نے اسی کے بارے فیصلہ کیا ہے پس انہوں نے کہا ہے: اگر کسی آدمی نے اپنی بیوی کو کہا: انت طالق ابدا تو وہ ایک طلاق کے ساتھ مطلقہ ہوگی (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى یعنی اس کی دیواریں بنائی گئیں اور اس کی بنیادیں اٹھائی گئیں تقویٰ پر۔ اور الاس کا معنی عمارت کی اصل اور بنیاد ہے اور اسی طرح اساس بھی ہے۔ اور الأُسس یہ اسی سے محصور و مقصور ہے۔ اور الاس کی جمع اساس ہے، جیسا کہ عس کی جمع عساس ہے۔ اور الاساس کی جمع اُسُس ہے، مثلاً قذال کی جمع قذل ہے۔ اور الاسس کی جمع اساس ہے، مثلاً سبب کی جمع اسباب ہے۔ اور أسست البناء تاسیسا (میں نے مضبوط عمارت بنائی) اور ان کا قول ہے: کان ذالک علی أُسِّ الدھر، وأَسِّ الدھر، واِسّ الدھر اس میں یہ تینوں لغات ہیں، یعنی وہ قدم الدہر اور وجہ الدہر پر ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: لَمَسْجِدٌ میں لام قسم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام ابتدا ہے، جیسے آپ کہتے ہیں: لزید احسن الناس فعلا (یعنی زید کام کرنے کے اعتبار سے لوگوں میں انتہائی حسین ہے) اور یہ (لام) تاکید کا تقاضا کرتا ہے۔ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى یہ لَمَسْجِدٌ کی صفت ہے۔ اَحَقُّ یہ اس مبتدا کی خبر ہے جو لمسجد ہے اور یہاں تقویٰ کا معنی وہ خصلتیں ہیں جن کے ساتھ سزا سے بچا جاتا ہے اور یہ فعلیٰ کے وزن پر وَقَیت سے ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور علماء کا اس مسجد کے بارے میں اختلاف ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: وہ مسجد قبا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس، ضحاک اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور انہوں نے قول باری تعالیٰ: مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ سے استدلال کیا ہے اور مدینہ طیبہ میں پہلے دن مسجد قبا ہی بنائی گئی تھی، کیونکہ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد سے پہلے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد 1، صفحہ 269
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1014
3۔ ایضاً

بنائی گئی تھی۔ یہ حضرت ابن عمر اور ابن مسیب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے(1)۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں بیان کیا ہے جسے آپ سے ابن وہب، اشہب اور ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: انہوں نے فرمایا: دو آدمی اس مسجد کے بارے جھگڑ پڑے جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی۔ تو ایک آدمی نے کہا: وہ مسجد قبا ہے اور دوسرے نے کہا: وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ھو مسجدی ھذا وہ میری یہ مسجد ہے(2)۔ امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔

پہلا قول واقعہ کے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ: فیہ میں ظرف کی ضمیر رجال متطہرین کا تقاضا کرتی ہے پس وہ مسجد قبا ہے۔ اور اس پر دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا: یہ آیت اہل قبا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ فرمایا: وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے پس ان کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ علامہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ مسجد قبا والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی(3)۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبا کو فرمایا: ''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمہاری پاکیزگی کی تعریف کرتے ہوئے تم پر احسان فرمایا ہے، تم کیا کرتے ہو''؟ انہوں نے عرض کی: بے شک ہم بول و براز کے اثر کو پانی کے ساتھ دھوتے ہیں(4)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور دارقطنی نے حضرت طلحہ بن نافع سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے حضرت ابو ایوب، حضرت جابر بن عبد اللہ اور حضرت انس بن مالک انصاریوں رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے گروہ انصار! بے شک اللہ تعالیٰ نے پاکیزگی اور طہارت کے بارے میں تمہاری بہت اچھی تعریف فرمائی ہے تمہاری یہ پاکیزگی کیسی ہے''؟ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت کی حالت میں غسل کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: اس کے سوا کوئی نہیں، بے شک ہم میں سے کوئی جب بول و براز کے لیے نکلے تو وہ زیادہ پسند کرتا ہے کہ پانی کے ساتھ استنجا کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ وہی ہے پس تم اسے لازم پکڑے رکھو''(5)۔ اور یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ آیت میں جس مسجد کا ذکر ہے وہ مسجد قبا ہے، مگر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نص بیان کی ہے کہ وہ آپ کی مسجد ہے پس اس کے ساتھ کوئی نظر وفکر کا عمل نہیں ہے۔

اور ابو کریب نے بیان کیا ہے ہمیں ابو اسامہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا، ہمیں صالح بن حیان نے بیان کیا ہے انہوں نے کہا ہمیں عبد اللہ بن بریدہ نے قول باری تعالیٰ: فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ (النور: 36)

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1014 2۔ جامع ترمذی، باب من سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر 3024، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 136 4۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 36
5۔ سنن دارقطنی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 62۔ سنن ابن ماجہ، باب الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر 348، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بارے میں بیان کیا ہے آپ نے فرمایا: بے شک یہ چار مساجد ہیں جنہیں انبیاء علیہم السلام نے بنایا ہے۔ کعبہ معظمہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اور بیت اریحا بیت المقدس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اور مدینہ طیبہ کی مسجد (مسجد نبوی) اور مسجد قباوہ ہیں جن کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، ان دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ، من نحویوں کے نزدیک یہ منذ کے مقابلے میں ہے، پس منذ ظرف زمان میں اور مکان میں من کے قائم مقام ہے۔ پس کہا گیا ہے: بے شک یہاں من کا معنی منذ کے معنی کی مثل ہے اور تقدیر کلام ہے: منذ أوّل یوم أبتدی بنیانہ (پہلے دن سے اس کی بنیادوں کی ابتدا کی گئی) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے من تأسیس اول الایام (پہلے دن کی بنیاد سے) پس یہ اس فعل کے مصدر پر داخل ہے جو اس سے ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لمن الدیار بقنة الحِجْرِ أقوین من حِجَجٍ ومن دَهْرِ(1)

یعنی من مَرّحجج و من مَرّدهر

اور جس نے اس طرف دعوت دی ہے وہ یہ ہے کہ علمائے نحو کا یہ اصول ہے کہ من کے ساتھ ازمان کو جر نہیں دی جائے گی، بلکہ ازمان کو منذ کے ساتھ جر دی جائے گی، آپ کہتے ہیں: ما رأیتہ منذ شھر أو سنۃ أو یوم اور یہ نہیں کہہ سکتے: من شھر اور نہ من سنۃ اور نہ ہی من یوم کہہ سکتے ہیں، پس جب کلام میں من واقع ہو اور اس کے پیچھے متصل زمانہ ہو تو وہاں کوئی مضمر لفظ مقدر مانا جائے گا جسے من کے ساتھ جر دی جا سکتی ہو، جیسا کہ ہم نے شعر کی تقدیر میں ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اچھا یہ ہے کہ یہ آیت تقدیر عبارت سے مستغنی ہو اور یہ کہ من لفظ اوّل کو جر دے رہا ہو کیونکہ یہ البداءۃ (ابتداء) کے معنی میں ہے گویا کہ من مبتدأ الأیام کہا ہے۔(2)

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ یعنی یہ بان تقوم ہے۔ پس یہ محل نصب میں ہے اور احق یہ حق سے افعل التفضیل کا صیغہ ہے اور افعل دو مشترک چیزوں کے درمیان داخل ہوتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک میں وہ مشترک معنی دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ پس مسجد ضرار اگرچہ باطل ہے اس میں کوئی حق نہیں ہے، لیکن یہ دونوں حق میں مشترک ہیں یا تو اسے بنانے والے کے اعتقاد کی وجہ سے یا اس کے اعتقاد کی وجہ سے جو یہ گمان کرتا ہے کہ مسجد ہونے کی وجہ سے اس میں قیام جائز ہے، لیکن دونوں اعتقادوں میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطنا باطل ہے۔ اور دوسرا ظاہراً اور باطنا حق ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىِٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا ۝ (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی)

اور یہ بات معلوم ہے کہ خیر اور اچھائی کو جہنم سے دور کر دیا گیا ہے، لیکن یہ ہر فرقہ کے اس اعتقاد کے مطابق ہے کہ وہ خیر پر ہے اور اس کی طرف اس کا لوٹنا خیر ہے، کیونکہ ہر گروہ انہی کے ساتھ خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور یہ العسل أحلی من الخل (کہ شہد سرکے سے زیادہ شیریں ہے) کے قبیل سے نہیں ہے، کیونکہ شہد اگرچہ میٹھا ہے پس ہر وہ شی جو ملائم ہو وہ میٹھی

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 378 ۔ 2۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ہوتی ہے، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ بعض لوگ سرکے کو شہد پر مقدم کرتے ہیں درآنحالیکہ مفرد کے مقابلے میں مفرد ہو اور کسی غیر کی طرف مضاف مضاف کے مقابلے میں ہو۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ جنہوں نے کہا ہے کہ مسجد سے مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد لی جائے گی تو پھر اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ میں ہا ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور فِيْهِ رِجَالٌ میں بھی ضمیر اسی کے لیے ہے۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسجد قبا ہے تو پھر فیہ میں ہا ضمیر اس کی طرف لوٹے گی۔ یہ اس اختلاف کی بنا پر ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کی تعریف بیان کی ہے جنہوں نے نظافت اور طہارت کو پسند کیا اور نظافت و پاکیزگی کو ترجیح دی اور یہ انسانی مروت ہے اور شرعی وظیفہ ہے (1)۔ ترمذی میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم اپنے خاوندوں کو کہو کہ وہ پانی کے ساتھ صفائی اور پاکیزگی حاصل کریں، کیونکہ میں ان سے شرم و حیا محسوس کرتی ہوں۔ فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے (2)۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ استنجا کے لیے پانی لے جاتے تھے۔ پس آپ تخفیف اور خشک کرنے کے لیے پتھر استعمال کرتے تھے اور پاکیزگی اور طہارت کے لیے پانی (3)۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: قیروان کے علماء اپنے وضو کی جگہوں میں مٹی کے ڈھیلے رکھتے تھے ان کے ساتھ صفائی کرتے تھے پھر پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 9۔ مخرج سے نکلنے والی نجاست کو صاف کرنا لازم ہے اور تمام بدن اور کپڑے کی نجاست میں تطہیر (یعنی اسے پاک کرنا) لازم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں کے لیے پانی کے موجود ہونے اور نہ ہونے کی دونوں حالتوں میں رخصت ہے۔ اور اسی کے مطابق عام علماء نے کہا ہے۔ اور ابن حبیب نے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے: پتھروں کا استعمال نہیں کیا جائے گا مگر صرف پانی نہ ہونے کی حالت میں (4)۔ اور وہ اخبار جو پانی کے موجود ہونے کے باوجود پتھروں کے استعمال کے بارے میں ثابت ہیں وہ اسے رد کرتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ بدنوں اور کپڑوں سے نجاست زائل کرنے کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے، حالانکہ ان کا پسوؤں کے خون کی معافی اور اس سے تجاوز پر اجماع ہے جب تک کہ وہ انتہائی فحش اور زیادہ نہ ہو۔ نجاست کے ازالہ میں علماء کے تین اقوال ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ یہ واجب فرض ہے، اس کی نماز جائز نہیں ہوتی جس نے ناپاک کپڑے میں نماز پڑھی چاہے وہ اس کے بارے جاننے والا ہو یا بھولنے والا، یہ حضرت ابن عباس، حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ اور اسے ابن وہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور یہی قول ابو الفرج المالکی اور علامہ طبری کا ہے، مگر علامہ طبری نے کہا ہے: اگر نجاست درہم کی مقدار ہو تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما نے دبر کے حلقہ پر قیاس کرتے ہوئے درہم کی مقدار کی رعایت کرنے کا قول کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 5 2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر 19، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1015 4۔ ایضاً

اور ایک گروہ نے کہا ہے: کپڑوں اور بدنوں سے نجاست کو زائل کرنا سنت سے ثابت ہے، یعنی یہ وجوب سنت ہے فرض نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: جس نے نجس کپڑے کے ساتھ نماز پڑھی تو وہ وقت کے اندر نماز کا اعادہ کرے اور اگر وقت نکل گیا تو پھر اس پر کوئی شی نہیں ہے۔

یہ قول امام مالک اور ابو الفرج کے سوا آپ کے اصحاب کا ہے اور آپ سے ابن وہب کی ہدایت بھی ہے اور خون تھوڑا ہونے کی صورت میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا نہ وقت میں اور نہ ہی وقت کے بعد اور بول و براز میں سے تھوڑا بھی ہو تو نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں سے یہ سب لیث کا قول ہے۔ اور ان سے ابن القاسم نے کہا ہے: یاد ہونے کی حالت میں نجاست کو زائل کرنا واجب ہوتا ہے نہ کہ نسیان اور بھول کی حالت میں اور یہ ان کے مفردات میں سے ہے۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے ان شاء اللہ، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: انهما ليعذبان وما يعذبان في كبير أما أحدهما فكان يمشي بالنميمة وأما الآخر فكان لا يستتر من بوله الحديث (1) (بے شک ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور انہیں کسی بڑے گناہ میں عذاب نہیں دیا جا رہا ان میں سے ایک چغلی کھاتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہ بچتا تھا) اسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور تیرے لیے یہی کافی ہے۔ اور عنقریب اس کا ذکر سورۂ سبحان میں آئے گا۔ انہوں نے کہا ہے: اور آدمی کو عذاب نہیں دیا جاتا مگر واجب ترک کرنے پر اور یہ بالکل ظاہر ہے۔ اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے آپ نے فرمایا: ''اکثر عذاب قبر پیشاب کی وجہ سے ہے'' (2)۔ دوسروں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز میں اپنے نعلین مبارک اتارنے سے استدلال کیا ہے جب کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے آپ کو مطلع کیا کہ ان میں قذر اور اذیت رساں شے لگی ہوئی ہے...... الحدیث۔ اسے ابو داؤد وغیرہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے، اس کا ذکر عنقریب سورہ طٰہٰ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ انہوں نے کہا: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کا اعادہ نہیں کیا جو آپ پڑھ چکے تھے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ اسے زائل کرنا سنت ہے اور آپ کی نماز صحیح ہے اور کامل نماز کے حصول کے لیے آدمی نماز کا اعادہ کر سکتا ہے جب تک وقت موجود ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا ہے: اور رہا قلیل و کثیر کے درمیان فرق تو یہ بغلی درہم کی مقدار کے برابر ہے (یعنی بڑے دراہم وہ ہیں جن کی گولائی دینار کی گولائی کی مقدار کے برابر ہو) اور اسے دبر کے حلقہ پر قیاس کیا گیا ہے۔ یہ دو وجہوں سے فاسد ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ مقداریں قیاس سے ثابت نہیں ہوتیں لہٰذا یہ مقدار قبول نہیں کی جائے گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دبر کے بارے میں اس میں جو تخفیف کی گئی ہے وہ ضرورت اور حاجت کے سبب رخصت ہے اور حاجت اور رخصتوں پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ قیاس سے خارج ہیں پس انہیں اس کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا (3)۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 182 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، جلد 1، صفحہ 29۔ ایضاً، حدیث نمبر 341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1016

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞

''تو کیا وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی الله کے تقویٰ پر اور (اس کی) رضا جوئی پر بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی وادی کے کھوکھلے دہانے کے کنارے پر جو گرنے والا ہے پس وہ گر پڑا اسے لے کر دوزخ کی آگ میں۔ اور الله تعالیٰ راہ حق پر نہیں چلاتا ظالم قوم کو''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ اَسَّسَ یعنی کیا وہ جس نے بنیاد رکھی، یہ استفہام برائے تقریر ہے۔ اور من بمعنی الذی ہے اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور اس کی خبر خیر ہے۔ حضرت نافع، ابن عامر اور ایک جماعت نے أُسِّسَ بنیانُهُ پڑھا ہے یعنی یہ صیغہ فعل مجہول ہے اور دونوں مقامات پر بنیان کو رفع دیا گیا ہے۔ اور ابن کثیر، ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور ایک جماعت نے أَسَّسَ بنیانَه پڑھا ہے یعنی صیغہ فعل معروف ہے اور دونوں مقامات پر بنیان کو نصب دی گئی ہے(1) اور یہی ابو عبید کی پسند ہے، کیونکہ جنہوں نے اس طرح پڑھا ہے وہ کثیر ہیں اور فاعل کا اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور نصر بن عاصم بن علی نے أفمن اسس کو رفع کے ساتھ اور بنیانه کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے أساس بنیانه بھی مروی ہے۔ اور ان سے أُسُّ بنیانهِ جر کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور مراد عمارت کی بنیاد اور اصل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور ابو حاتم نے چھٹی قراءت بیان کی ہے اور وہ أفمن آساسُ بنیانه ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ أُس کی جمع ہے، جیسے کہا جاتا ہے: خف و أخفاف اور کثیر استعمال أساس خفاف کی مثل ہے، شاعر نے کہا ہے:

أصبح الملك ثابتَ الآساسِ   في البهاليل من بني العباس

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ عیسیٰ ابن عمر کی قراءت جس کے بارے سیبویہ نے بیان کیا ہے تنوین کے ساتھ ہے، اور آخر میں الف، الف الحاق ہے جیسا کہ تَتْرٰی کا الف جب کہ اسے تنوین دی جائے (2) اور شاعر نے کہا ہے:

يَسْتَنُّ في عَلْقًى وفي مُكُورِ

اور سیبویہ نے تنوین کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے؟ عَلٰى شَفَا۔ الشفا کا معنی کنارہ اور حد ہے، سورۂ آل عمران میں پوری بحث گزر چکی ہے۔ اور جُرُفٍ را کو رفع کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور ابو بکر اور حمزہ نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً الشُّغُل اور الشُّغْل، الرُّسُل اور الرُّسْل، یعنی ایسا کھوکھلا دہانہ جس کی کوئی بنیاد اور اصل نہ ہو۔ اور الجرف وہ کھوکھلے دہانے جو وادیوں میں سیلاب کے سبب بن جاتے ہیں اور یہ وہ کنارے ہیں جو پانی کے ساتھ کھد جاتے ہیں۔ اور اس کی اصل الجرف اور الاجتراف سے ہے۔ اور یہ کسی بھی شے کا اپنی اصل اور بنیاد سے پھٹ جانا ہے۔

هَارٍ اس کا معنی ہے گرنے والا۔ کہا جاتا ہے: تهور البناء جب کوئی عمارت گر جائے اور اس کی اصل هائر ہے اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 84 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 85

اسمائے مقلوب میں سے ہے اس میں قلب کیا جاتا ہے اور اس کی یا کو مؤخر کیا جاتا ہے، پس کہا جاتا ہے: ھار و ھائر یہ زجاج نے کہا ہے: اور اسی کی مثل لاث الشی بہ ہے جب وہ شے کو اس کے ساتھ گھمائے۔ فھو لاث ای لائث اور اسی طرح انہوں نے کہا ہے: شاکی السلاح و شائك (السلاح) (ہتھیاروں سے مسلح) عجاج نے کہا ہے:

لاثٍ بہ الأشاء والعُبْرِی (1)

اس میں الأشاء سے مراد کھجور کا درخت ہے اور العبری سے مراد وہ بیری کا درخت ہے جو نہروں کے کنارے پر ہوتا ہے۔ اور لاث بہ کا معنی مطیف بہ (گھمانے والا) ہے۔ اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ اس میں اصل ھاود ہے، پھر کہا جاتا ہے: ھائر جیسا کہ صائم، پھر قلب کیا جاتا ہے اور ھار کہا جاتا ہے۔ اور کسائی کا خیال ہے کہ یہ واوی الفاظ میں سے بھی ہے اور یائی الفاظ میں سے بھی اور کہا جاتا ہے: تھوّر اور تھیّر۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی وجہ سے اس میں امالہ کیا جاتا ہے اور فتحہ دیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ اس میں انہار کا فاعل الجرف ہے، گویا کہ یہ فرمایا: فانھار الجرف بالبنیان فی النار (پس عمارت کا کھوکھلا کنارہ جہنم میں گر پڑا) کیونکہ کنارہ (حرف) مذکر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ بہ کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہو اور وہ بنانے والا ہے اور تقدیر کلام ہے: فانھا من أسس بنیانہ علی غیر تقویٰ (پس وہ گر پڑا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد غیر تقویٰ پر رکھی) اور یہ آیت ان کے لیے ضرب المثل ہے یعنی جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اسلام پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد شرک اور نفاق پر رکھی۔ اور یہ بیان کیا کہ کافر کی بنیاد اس بنیاد کی طرح ہے جو جہنم کے کھوکھلے کنارے پر ہو وہ اپنے باسیوں سمیت اس میں گر پڑتا ہے۔ اور الشفاء کا معنی کنارہ ہے اور أشفی علی کذا کا معنی ہے وہ اس کے قریب ہوا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ہر شے جس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی نیت کے ساتھ اور اس کی ذات کریم کے ارادہ اور قصد کے ساتھ ہو تو وہی وہ ہے جو باقی رہتی ہے اور اس کا مالک اس کے ساتھ سعادت اندوز ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتی اور بلند ہوتی ہے، اور اس کے بارے وہ اپنے اس قول کے ساتھ خبر دیتا ہے: وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن) (اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے) یہ دونوں وجہوں میں سے ایک پر دلیل ہے۔ اور وہ اس کے بارے اپنے اس قول سے بھی خبر دیتا ہے: وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (الکہف: 46) (اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں) جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور علماء نے اس قول باری تعالیٰ کے بارے میں اختلاف کیا ہے: فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ کیا یہ حقیقت ہے یا مجاز؟ اس کے بارے دو قول ہیں (1) کہ یہ حقیقت ہے اور یہ کہ حضور نبی مکرم ﷺ جب اس کی طرف بھیجے گئے تو اسے گرا دیا گیا اور اس سے نکلنے والا دھواں دکھائی دیا۔ یہ حضرت سعید بن جبیر کی روایت ہے (2)۔ اور بعض نے کہا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 85
2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1017

ہے: آدمی کو اس میں داخل کیا جائے گا اس حال میں کہ اسے سر اور منہ پر پھنسیاں ہوں گی جیسا کہ کھجور کے درخت کے تنا کی حالت ہوتی ہے اور اسے اس سے نکالا جائے گا درآنحالیکہ وہ سیاہ جلی ہوں گی۔ اور اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ جگہ کھودی جائے گی جو گر پڑی پس اس سے دھواں نکلے گا۔ اور عاصم بن ابی النجود نے زر بن حبیش سے اور انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہنم زمین میں ہے، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک میں نے وہ دھواں دیکھا ہے جو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نکلتا رہا (1)۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے: وہ عمارت جہنم کی آگ میں ہوگی، تو گویا وہ اس میں گر پڑی اور اس میں جھک گئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (القارعۃ) (تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا) اور ظاہر پہلا قول ہے کیونکہ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

"ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں مگر یہ کہ پارہ پارہ ہو جائیں ان کے دل اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا اس میں عمارت سے مراد مسجد ضرار ہے۔ رِيْبَةً یعنی ان کے دلوں میں شک اور نفاق رہے گا (2)، یہ حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور نابغہ نے کہا ہے:

حلفتُ فلم أترك لنفسك رِيبةً وليس وراء الله للمرءِ مَذْهَبُ

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے تیری ذات کے لیے کوئی شک نہیں چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کے سوا آدمی کے لیے کوئی اور مذہب نہیں۔

اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس سے مراد حسرت اور ندامت ہے، کیونکہ وہ اسے بنانے پر نادم ہوئے۔ اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اسی طرح حبیب اور مبرد نے بھی کہ ریبۃ سے مراد شدید غیظ و غضب ہے۔ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: یعنی ان کے دل پھٹ جائیں اور وہ مر جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ (الحاقۃ) (پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگِ دل) کیونکہ رگ دل کٹ جانے کے سبب زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ حضرت قتادہ، ضحاک اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔ اور حضرت سفیان نے کہا ہے: مگر یہ کہ وہ توبہ کر لیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: مگر یہ کہ ان کے دل ان کی قبروں میں پارہ پارہ ہو جائیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب یہ قراءت کرتے تھے: ريبة في قلوبهم ولو قطعت قلوبهم (3) (ان کے دلوں میں کھٹکا رہے گا اگرچہ ان کے دل کٹ جائیں) حسن، یعقوب اور ابو حاتم نے غایت کی بنا پر الی أن تقطع پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس کی وجہ سے مسلسل شک میں رہیں گے یہاں تک کہ وہ مر جائیں اور انہیں یقین حاصل ہو جائے اور سب واضح ہو جائے۔ قراء نے قول باری تعالیٰ: تَقَطَّعَ میں اختلاف کیا ہے پس جمہور نے تقطع تا کے

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1018 2۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 41 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 405

ضمہ، قاف کے فتحہ اور طا کی شد کے ساتھ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔

ابن عامر، حمزہ، حفص اور یعقوب نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے تا کو فتحہ دیا ہے، اور یعقوب اور ابو عبدالرحمن سے تقطع فعل مجہول قاف کی تخفیف کے ساتھ بھی مروی ہے۔ اور شبل اور ابن کثیر سے تقطع قاف کی تخفیف کے ساتھ مروی ہے۔ قُلُوْبِهِمْ یہ منصوب ہے، یعنی تم ان کے ساتھ ایسا کرو۔ تحقیق ہم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کی قراءت ذکر کی ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمان داروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ وعدہ کیا ہے اللہ نے اس پر پختہ وعدہ تورات اور انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدہ کو اللہ تعالیٰ سے (اے ایمان والو!) پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو کیا ہے تم نے اللہ سے۔ اور یہی تو سب سے بڑی فیروز مندی ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ کہا گیا ہے یہ تمثیل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (البقرہ:16) ((یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے) اور یہ آیت بیعت ثانیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ بیعت عقبہ کبریٰ ہے اور یہ وہ ہے جس میں انصار کے مردوں کی تعداد ستر سے کچھ زائد تھی اور ان میں عمر کے اعتبار سے سب سے چھوٹے حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ تھے (1) اور وہ اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عقبہ (گھاٹی) کے نزدیک جمع ہوئے، تو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: آپ اپنے رب کے لیے اور اپنے لیے جو چاہیں شرط لگا لیں۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنے رب کے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور تم اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم میری ہر اس شے سے حفاظت کرو جس سے تم اپنی جانوں اور اپنے مالوں کی حفاظت کرتے ہو''۔ انہوں نے عرض کی: جب ہم ایسا کریں گے تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت''۔ انہوں نے عرض کی: سودا نفع بخش

1۔ المحرر الوجیز، زیر آیت ہذہ

ہے، ہم نہ اسے فسخ کریں گے اور نہ اس کے فسخ کا مطالبہ کریں گے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، الآیہ (1)۔ پھر اس کے بعد یہ حکم حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر جہاد کرنے والے کے لیے عام ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت آقا کے اپنے غلام کے ساتھ معاملہ کرنے کے جواز پر دلیل ہے، اگرچہ سب آقا کا ہوتا ہے لیکن جب وہ اسے مالک بنا دے تو وہ اس کے ساتھ اس بارے میں معاملات کرے جو اس نے اس کے سپرد کیا ہے (2)۔ اور آقا اور اس کے غلام کے درمیان وہ جائز ہے جو اس کے اور کسی دوسرے کے درمیان جائز نہیں ہوتا، کیونکہ اس (غلام) کا مال اسی (آقا) کا ہے اور اس کے لیے اسے چھین لینا بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مخلوق کے درمیان شراء (خرید و فروخت) کی اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے ہاتھوں سے نکلے وہ اس کے عوض اور بدلے میں ایسی چیز لیتے ہیں جو ان کے لیے ان کی نسبت زیادہ نفع بخش ہو یا نفع میں اس کی مثل اور برابر ہو جو ان کے ہاتھ سے نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اپنی اطاعت و فرمانبرداری میں جانوں اور اپنے مالوں کو ضائع کرنے اور اپنی رضا اور خوشی میں انہیں ہلاک کرنے کو خریدا اور انہیں اس کے عوض جنت عطا فرمائے گا جب وہ ایسا کریں گے۔ اور یہ اتنا عظیم عوض اور بدلہ ہے کہ معوض (جس کا بدلہ دیا گیا) نہ اس کے قریب پہنچ سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پس اسے مجازاً ایسی شے میں جاری کر دیا جسے بیع اور شراء میں لوگ جانتے ہیں۔

پس بندے کی طرف سے اپنی جان اور مال کو حوالے کرنا ہے اور اللہ کریم کی جانب سے اجر و ثواب اور بخشش و عطا ہے پس اسے شراء کا نام دیا گیا ہے۔

اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک ہر نیکی کے اوپر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ بندہ اپنا خون بھی قربان کر دیتا ہے پس جب اس نے ایسا کر لیا تو پھر اس سے اوپر اور کوئی نیکی نہیں''۔ اور شاعر نے بر (نیکی) کے معنی میں کہا ہے:

الجود بالماء جود فیه مکرمة والجود بالنفس أقصی غایة الجود

پانی کے ساتھ سخاوت کرنا بھی سخاوت ہے اس میں عزت و تکریم ہے لیکن جان قربان کرنا سخاوت کی آخری حد ہے۔

اور اصمعی نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو کہا:

أُثَامِنُ بالنفس النفیسة ربَّها ولیس لها فی الخلق کلِّهِم ثَمَنُ

میں اس عمدہ اور نفیس جان کا سودا اس کے رب سے کروں گا اور اس کی ساری مخلوق میں اور کوئی قیمت نہیں۔

بها تُشْتَرَی الجناتُ، إن أنا بعتها بشیء سواها إن ذالکُم غَبَنُ

اس کے ساتھ جنتیں خریدی جا سکتی ہیں اگر میں اسے بیچوں اس کے سوا کسی شے کے عوض تمہیں خسارہ ہو گا۔

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1018 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 1019

لئن ذھبت نفسی بدنیا أصبتُھا   لقد ذھبت نفسی وقد ذھب الثمن

اگر میری جان دنیا کے عوض چلی جائے اور میں اسے (دنیا کو) پالوں تو تحقیق میری جان بھی گئی اور ثمن یعنی قیمت بھی ضائع ہوگئی۔

حسن نے بیان کیا ہے: ایک اعرابی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ تو اس نے عرض کی: یہ کس کا کلام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے''۔ اس نے کہا: قسم بخدا یہ بیع نفع بخش ہے ہم نہ اسے فسخ کریں گے اور نہ اسے توڑنے کا مطالبہ کریں گے۔ پس وہ ایک غزوہ کی طرف نکلا اور شہید کر دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے کہا ہے: جس طرح اللہ تعالیٰ نے بالغ اور مکلف مومنوں سے جانوں کو خرید لیا ہے اسی طرح اس نے بچوں سے بھی اسے خرید لیا ہے پس انہیں درد پہنچایا اور انہیں بیمار کر دیا، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہے اور اس میں بالغوں کا اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کسی چیز کے لاحق ہونے کے وقت زیادہ فائدہ اور نفع حاصل نہیں کرتے اور بچوں کے دکھ درد کے وقت ان کی طرف سے فساد بہت کم ہوتا ہے اور وہ بھی ہے جو کفالت کرنے والے والدین کو اس بارے میں اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے جو غم اور تکلیف میں سے انہیں پہنچتا ہے اور جو تربیت و کفالت میں سے ان کے متعلق ہوتا ہے (1)، پھر وہ رب کریم ان بچوں کو ایک عوض عطا فرماتا ہے جب وہ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اور ظاہر میں اس کی نظیر یہ ہے کہ تو ایک مزدور کرائے پر لیتا ہے تاکہ وہ عمارت بنائے اور مٹی منتقل کرے اور اس تمام کام میں اس کے لیے درد اور اذیت ہے، لیکن یہ جائز ہے کیونکہ اس کے عمل اور کام میں مصلحت اور فائدہ ہے اور اس لیے کہ اسے اس کی اجرت ملتی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ اس کا بیان ہے جس کے لیے اور جس کے خلاف وہ قتال کرتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَيُقْتَلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ نخعی، اعمش، حمزہ اور خلف نے مفعول کو فاعل پر مقدم پڑھا ہے (2)۔ اور اس سے امرئ القیس کا قول ہے

فإن تَقْتُلونا نُقَتِّلكم......

(پس اگر تم ہمیں قتل کرو گے تو ہم تمہارے ساتھ قتال کریں گے یعنی اگر تم نے ہمارے بعض کو قتل کیا تو ہمارے بعض تمہیں قتل کریں گے (ان تقتلوا بعضنا یقتلکم بعضنا) اور باقیوں نے مفعول پر فاعل کو مقدم کر کے پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جا رہی ہے کہ یہ ان کتب میں ہے اور جہاد اور دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنا اصلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ہے۔ اور وعدًا اور حقًّا دونوں مصدر ہیں اور تاکید کے لیے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ یعنی کوئی بھی نہیں ہے جو اپنا وعدہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر پورا

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1019   2۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 381

کرنے والا ہو اور وہ وعدے اور وعید دونوں کو پورا کرنے کا ضامن ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی وفا تمام کو متضمن نہیں ہوتی۔ پس جہاں تک اس کا وعدہ ہے تو وہ تمام کو شامل ہے (اور وہ اسے پورا کرتا ہے) اور رہی وعید تو وہ بعض گنہگاروں، بعض گناہوں اور بعض احوال کے ساتھ مخصوص ہے (1)۔ اور اس کی مفصل بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ یعنی تم اس پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرو۔ اور البشارۃ کا معنی پیشانی میں خوشی اور سرور کا اظہار کرنا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قسم بخدا! زمین پر کوئی مومن نہیں مگر وہ اس سودے میں داخل ہے، ہو سکتا ہے۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یعنی جنت حاصل کرنا اور اس میں ہمیشہ رہنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''توبہ کرنے والے (اللہ کی) عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور نگہبانی کرنے والے اللہ کی (مقررہ) حدوں کی (اے میرے رسول!) خوشخبری سنا دیجئے ان (کامل) مومنوں کو''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ، اَلتَّآئِبُوْنَ سے مراد وہ ہیں (2) جو اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں حالت مذموم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں حالت محمودہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور التائب سے مراد رجوع کرنے والا (3) اور لوٹنے والا ہے اور اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا (فقط) معصیت سے رجوع کرنے والے سے افضل و اعلیٰ ہے کیونکہ وہ دونوں امروں کو جمع کیے ہوتا ہے (یعنی معصیت سے پھر کر اطاعت کی طرف رجوع کرنا) الْعٰبِدُوْنَ یعنی وہ اطاعت کرنے والے جنہوں نے اپنی اطاعت سے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قصد و ارادہ کیا۔ الْحٰمِدُوْنَ یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے ساتھ راضی اور خوش ہونے والے ہیں اور اس کی نعمت و احسان کو اس کی اطاعت میں صرف اور خرچ کرنے والے ہیں (4)۔ اور وہ جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔

السَّآئِحُوْنَ روزے رکھنے والے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور دیگر سے مروی ہے۔ اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ (التحریم:5) (عبادت کرنے والیاں، روزہ دار) اور سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: بے شک صائم کو سائح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ کھانے پینے اور نکاح کی تمام لذات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور حضرت ابو طالب نے کہا ہے:

وبالسائحين لايذوقون قطرة لربهم والذاكرات العوامل

1۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1020
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 408
4۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 1020

اور قسم ہے ان روزے داروں کی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں چکھتے اور کام کے دوران اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والیوں کی۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

بَرًّا يصلِّي ليلَه و نهارَهُ يَظَلّ كثير الذكر لله سائحا

نیکوکار اپنے دن رات نمازیں پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر روزے دار کرتا ہے۔

اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: اس امت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے (1)۔ اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی سیاحت روزہ رکھنا ہے'' (2)۔ زجاج نے کہا ہے: حسن کا مذہب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فرض روزہ رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ روزے رکھتے رہتے ہیں۔ اور حضرت عطا نے کہا ہے: السَّآئِحُوْنَ سے مراد جہاد کرنے والے، مجاہدین ہیں۔ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیاحت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میری امت کی سیاحت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے'' (3)۔ اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سائحون سے مراد ہجرت کرنے والے، مہاجرین ہیں۔ یہ عبدالرحمن بن زید نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو حدیث اور علم کی طلب اور تلاش میں سفر کرتے ہیں۔ یہ عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے افکار کے ساتھ اپنے رب کی توحید اور اس کی بادشاہی میں غور وفکر کرتے ہیں اور ان چیزوں میں جو اس نے اپنی توحید اور تعظیم پر دلالت کرنے والی علامات اور نشانیاں تخلیق فرمائی ہیں۔ اسے نقاش نے بیان کیا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ بعض بندوں نے لوٹا پکڑا تاکہ وہ رات کی نماز کے لیے وضو کرے اور اپنی انگلی اس کے دستے میں داخل کی اور غور وفکر کرتے ہوئے بیٹھ گیا یہاں تک کہ فجر طلوع ہوگئی، تو اسے جب اس بارے میں کہا گیا تو اس نے جواب دیا: میں نے اپنی انگلی لوٹے کے دستے میں داخل کی تو مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آ گیا: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ (غافر: 71) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں) اور میں نے یہ یاد کیا میں کیسے اس طوق کو ملوں گا اور میری بقیہ ساری رات اسی میں گزر گئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ لفظ 'س ی ح' ان اقوال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ سیاحت کا اصل معنی سطح زمین پر چلنا ہے جیسے پانی بہتا ہے، پس روزے دار ان چیزوں کو چھوڑنے میں اطاعت وفرمانبرداری پر مسلسل قائم رہتا ہے جنہیں وہ طعام وغیرہ میں سے چھوڑ دیتا ہے، پس وہ سائح (سیاحت کرنے والے) کے قائم مقام ہی ہوگا۔ اور غور وفکر کرنے والوں کے دل ان چیزوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں جن کے بارے انہوں نے ذکر کیا ہے اور حدیث میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر طبری، جلد 11، صفحہ 48
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 1، صفحہ 407
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 336۔ ایضاً، حدیث نمبر 2127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے کچھ فرشتے کائنات میں سیاحت کرنے والے اور چلنے پھرنے والے ہیں وہ میری امت کا درود پاک مجھے پہنچاتے ہیں"(1)۔ اور یہ لفظ صاد کے ساتھ صیاحین بھی روایت کیا جاتا ہے۔ اور یہ الصیاح سے ماخوذ ہے۔ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ یعنی وہ فرض اور دوسری نماز میں رکوع و سجود کرنے والے ہیں۔ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی سنت کے بارے حکم دینے والے ہیں اور بعض نے کہا ہے: ایمان کے بارے حکم دینے والے۔ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بعض نے کہا ہے: وہ بدعت سے روکنے والے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ کفر سے روکنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ہر نیکی اور برائی کو شامل ہے۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ یعنی وہ اس پر قائم رہنے والے ہیں جس کے بارے اللہ کریم نے انہیں حکم دیا ہے اور اس سے باز رہتے ہیں جس سے اللہ کریم نے انہیں منع کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اہل تاویل نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ ماقبل آیت کے ساتھ متصل ہے یا منفصل؟ تو ایک جماعت نے کہا ہے: پہلی آیت بذات خود ایک مستقل آیت ہے اور اس سودے کے تحت ہر ایک موحد آتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اگرچہ وہ اس دوسری آیت میں مذکور صفات کے ساتھ یا ان سے زیادہ کے ساتھ متصف نہ ہو۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ اوصاف شرط کی جہت پر مذکور ہیں اور دونوں آیتیں باہم مرتبط ہیں، پس اس سودے کے تحت داخل نہیں ہوں گے مگر وہی مومنین جو ان اوصاف پر ہوں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرتے ہوں۔ یہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حرج میں مبتلا کرنے والا اور تنگی میں ڈالنے والا ہے اور آیت کا معنی اس بنا پر جس کا تقاضا علماء اور شریعت کے اقوال کرتے ہیں کہ یہ کامل مومنین کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کیا ہے تا کہ اہل توحید ان پر قائم اور برقرار رہیں یہاں تک کہ وہ اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو جائیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ مبتدا ہونے کی وجہ سے حالت رفعی میں ہیں۔ اور اس کی خبر مضمر ہے۔ یعنی اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ...... الی آخر الآیۃ...... لھم الجنۃ ایضا یعنی ان تمام کے لیے بھی جنت ہے، اگرچہ انہوں نے جہاد نہ بھی کیا، بشرطیکہ ان کی طرف سے عناد اور جہاد ترک کرنے کا قصد اور ارادہ نہ ہو، کیونکہ جہاد میں بعض مسلمان بعض کی طرف سے کافی ہوتے ہیں۔ اس قول کو علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ بہت اچھا ہے (ہٰذا حسن) کیونکہ اگر یہ صفت ان مومنوں کی ہو جن کا ذکر اس قول باری میں ہے: اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ تو پھر یہ وعدہ مجاہدین کے لیے خاص ہو جائے گا۔ اور حضرت عبد اللہ کے مصحف میں ہے: التائبین العابدین، اِلی آخرہا اور اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اتباع کے طریقہ پر یہ مومنین کی صفت ہے (لہٰذا حالت جری میں ہیں) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ مدح کی بنا پر حالت نصبی میں ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قول باری تعالیٰ: وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ میں واؤ کے بارے علماء کا اختلاف ہے پس کہا گیا ہے کہ یہ ناہین (روکنے والوں کی) صفت میں داخل ہے(3) جیسا کہ اس ارشاد میں داخل ہے: حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 8، صفحہ 595
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 88
3۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 382

الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (المومن) پس بعض کو واؤ کے ساتھ اور بعض کو بغیر واؤ کے ذکر کیا۔ اور یہ کلام میں جائز اور مروج ہے اور اس کی مثل کی نہ کوئی حکمت تلاش کی جائے گی اور نہ کوئی علت۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ برائی سے روکنے والے اور نیکی کا حکم دینے والے کی مصاحبت کے لیے داخل ہوئی ہے پس قریب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کا مفرد ذکر کیا جائے۔ اور اسی طرح قول باری تعالیٰ: ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (التحریم: 5) ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالْحٰفِظُوْنَ میں یہ اس کے معطوف کے قریب ہونے کی وجہ سے داخل ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ زائد ہے۔ اور یہ قول ضعیف ہے اس کا کوئی معنی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واؤ ثمانیہ ہے کیونکہ عربوں کے نزدیک سات صحیح اور کامل عدد ہے(1)۔ اور اسی طرح انہوں نے اس قول میں کہا ہے: ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ (التحریم: 5) اور اسی طرح جنت کے دروازوں کے بارے میں ارشاد ہے: وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 73) (اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے) اور قول باری تعالیٰ ہے: وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (الکہف: 22) (اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا)

اسے ابن خالویہ نے ابو علی فارسی کے ساتھ مناظرہ میں وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا (الزمر: 73) کے معنی میں ذکر کیا ہے اور ابو علی نے اس کا انکار کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ النحو ابو عبداللہ الکفیف المالقی سے مجھے بیان کیا ہے اور یہ ان میں سے تھے جو غرناطہ میں سکونت پذیر رہے اور ایک مدت تک وہاں ابن حبوس کے زمانہ میں پڑھایا کہ انہوں نے کہا: بعض عربوں کے نزدیک یہ لغت فصیحہ ہے۔ ان کا طریقہ اور ان کی عادت یہ ہے کہ جب وہ عدد گنتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں: واحد اثنان ثلاثۃ اربعۃ خمسۃ ستۃ سبعۃ و ثمانیۃ تسعۃ عشرۃ اسی طرح یہ ان کی لغت ہے۔ اور جب بھی ان کے کلام میں امر آٹھ تک پہنچتا ہے تو وہ واؤ داخل کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ قریش کی لغت ہے۔ اس کا بیان اور اس کا نقض عنقریب سورۃ الکہف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اور سورۂ زمر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت سے اس کا بیان آئے گا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

''درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے اگرچہ وہ مشرک ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں، جب کہ واضح ہو گیا ان پر کہ یہ دوزخی ہیں''۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب ابو طالب قریب المرگ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے (2) اور آپ نے ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ ابن مغیرہ کو ان کے پاس پایا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے چچا! کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس بارے تیری شہادت پیش کروں گا''۔ تو ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے

1۔ زاد المسیر، جلد 3، صفحہ 382 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 90-89

کہا: اے ابوطالب! کیا تو عبد المطلب کے دین سے اعراض کرے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسلسل وہ کلمہ ان پر پیش کرتے رہے اور اس قول کا ان کے لیے اعادہ کرتے رہے یہاں تک کہ آخر میں ابوطالب نے ان سے کلام کرتے ہوئے کہا: وہ عبد المطلب کے دین پر ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے انکار کر دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ”قسم بخدا! میں تمہارے لیے ضرور مغفرت طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے تم سے منع نہ کیا گیا“ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝ اور اللہ تعالیٰ نے ابو طالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرمایا: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ (القصص)(1) (بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں، البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو)

پس اس بنا پر یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے لیے ناسخ ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی موت کے بعد ان کے لیے مغفرت طلب کی جیسا کہ صحیح کے علاوہ دیگر کتب میں روایت موجود ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: یہ انتہائی بعید ہے، کیونکہ یہ سورت قرآن کریم میں سے آخر میں نازل ہونے والی (سورتوں) میں سے ہے اور ابوطالب نے عنفوان اسلام کے وقت وصال فرمایا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابھی مکہ مکرمہ میں تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت کفار کے ساتھ دوستی ختم کرنے کو متضمن ہے چاہے وہ زندہ ہوں یا مردہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اجازت نہیں دی کہ وہ مشرکوں کے لیے استغفار کریں۔ پس مشرک کے لیے مغفرت طلب کرنا ان امور میں سے ہے جو جائز نہیں۔ پھر اگر کہا جائے: تحقیق یہ بات صحیح ہے کہ غزوۂ احد کے دن جب کفار نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے والے دانت شہید کر دیئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ فرمایا: اللّٰھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (2) (اے اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے) تو یہ اس کلمہ کے ساتھ جمع کیسے ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مومنوں کو مشرکین کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع فرمایا ہے؟ تو یہ کہا جائے گا: بے شک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ قول سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی سے بر سبیل حکایت بیان ہوا ہے۔ اور اس پر دلیل وہ آیت ہے جسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: گویا میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طرف دیکھ رہا ہوں کہ آپ سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کے بارے بیان فرما رہے ہیں کہ اس کی قوم نے اسے مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ربّ اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (3) (اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)۔ اور بخاری میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے بارے خبر دینے لگے کہ اس نے یہ کہا: اللّٰھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (4) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے)

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 40
2۔ صحیح مسلم، غزوۂ احد، جلد 2، صفحہ 108
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 495

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ روایت اس بارے میں صریح ہے کہ یہ آپ سے قبل کسی اور نبی علیہ السلام کی جانب سے بطور حکایت ہے، نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ابتداء اپنی طرف سے ارشاد فرمایا جیسا کہ بعض کا گمان ہے۔ واللہ اعلم۔ اور وہ نبی علیہ السلام جن کی آپ نے حکایت بیان کی وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورت ہود میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں استغفار سے مراد نماز ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: میں نہیں ہوں کہ میں اہل قبلہ میں سے کسی پر نماز (جنازہ) پڑھنا چھوڑ دوں اگرچہ وہ حبشہ کی رہنے والی زنا سے حاملہ ہو، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کو نہیں سنا کہ اس نے مشرکین کے سوا کسی کی نماز سے روکا ہو، کیونکہ اس نے مشرکین کے بارے میں فرمایا ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ، الآیہ (1)۔

حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت مشرکوں پر نماز جنازہ پڑھنے سے روکنے کے بارے میں ہے۔ اور یہاں استغفار سے مراد صلوٰۃ (نماز جنازہ) ہی ہوگا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ زندوں کے لیے استغفار کرنا جائز ہے، کیونکہ ان کے ایمان لانے کی امید اور توقع ہو سکتی ہے اور اچھے اور خوبصورت قول کے ساتھ ان کی تالیف قلوب کرنا اور دین کی طرف انہیں راغب کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور بہت سے علماء نے کہا ہے کہ آدمی اپنے کافر والدین کے لیے دعا مانگے اور ان کے لیے بخشش طلب کرے جب تک وہ زندہ ہوں۔ اور رہا وہ جو فوت ہو گیا تو اس سے امید منقطع ہو گئی لہٰذا اس کے لیے دعا نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اپنے مردوں کے لیے مغفرت طلب کرتے تھے پھر یہ آیت نازل ہوئی، تو وہ استغفار کرنے سے رک گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں زندوں کے لیے مغفرت طلب کرنے سے منع نہیں کیا یہاں تک کہ مر جائیں (2) (یعنی مرنے کے بعد ان کے لیے مغفرت کی دعا نہیں ہے)

مسئلہ نمبر 3۔ اہل معانی نے کہا ہے: ما کان قرآن کریم میں دو صورتوں میں آتا ہے۔ ایک نفی کے معنی میں جیسے ارشاد گرامی ہے: مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا (النمل: 60) (تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگا سکتے ان کے درخت) اور وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران: 145) (اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے)

اور دوسرا نہی کے معنی میں آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) (اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو) اور مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (درست نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝

''اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا اور جب ظاہر ہو گئی آپ پر یہ بات کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو آپ بیزار ہو گئے اس سے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 90 2۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 1، صفحہ 52

بے شک بڑے ہی نرم دل (اور) بردبار تھے"۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ نسائی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے ایک آدمی کو اپنے والدین کے لیے استغفار کرتے ہوئے سنا حالانکہ وہ دونوں مشرک تھے، تو میں نے کہا: کیا تو ان دونوں کے لیے مغفرت طلب کر رہا ہے حالانکہ وہ دونوں مشرک ہیں؟ تو اس نے کہا: کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا نہیں کی؟ چنانچہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اس کا ذکر کیا تب یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ (1) اس کا معنی یہ ہے: اے مومنو! تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے باپ کے لیے استغفار کرنے میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ وہ فقط ایک وعدہ کو پورا کرنے کی وجہ سے تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے اور شرکاء کو چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب وہ کفر پر مر گیا تو آپ کو معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، تو آپ نے اس کے لیے دعا چھوڑ دی، کلام میں اِيَّاهُ کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے اور وعدہ کرنے والا آپ کا باپ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعدہ کرنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے اپنے باپ سے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب وہ حالت شرک میں ہی فوت ہو گیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے۔ اور اس وعدے پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (مریم: 47) (میں مغفرت طلب کروں گا تیرے لیے اپنے رب سے)

قاضی ابوبکر بن العربی نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے لیے استغفار کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ ہی تعلق قائم کیا: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (مریم: 47) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنے کی وجہ اس کا کفر ظاہر ہونے سے پہلے ایک وعدہ تھا، پس جب آپ کے لیے اس کی طرف سے کفر ظاہر ہو گیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے، تو اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے چچا کے لیے کیسے استغفار کر سکتے ہیں حالانکہ اس کی موت حالت کفر میں واقع ہو چکی ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ موت کے وقت آدمی کی ظاہر حالت کے مطابق اس پر حکم لگایا جائے گا، پس اگر کوئی حالت ایمان پر فوت ہوا تو اس کے لیے اس (ایمان) کا حکم لگایا جائے گا اور اگر حالت کفر پر فوت ہوا تو اس کے لیے اس کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔ اور اس کے باطن کی حالت تیرا رب بہتر جانتا ہے، مگر یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے اپنے چچا کو کسی شے کا نفع دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ اور وہ عذاب کی تخفیف کے بارے شفاعت اور سفارش ہے نہ کہ جہنم سے نکلنے کے بارے میں، جیسا کہ ہم نے اسے کتاب "التذکرہ" میں بیان کیا ہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 286۔ جامع ترمذی، باب فی سورۃ التوبہ، حدیث نمبر 3026، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 1023

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۔ الأواه کے بارے میں علماء کے پندرہ مختلف اقوال ہیں۔ (۱) کہ وہ ایسی دعا کرنے والے ہیں جو کثرت اور اصرار کے ساتھ ہو۔ یہ حضرت ابن مسعود اور عبید بن عمیر نے کہا ہے (۲) کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ انتہائی رحم کرنے والے ہیں۔ یہ حسن اور قتادہ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پہلا قول اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ یہ نحاس نے کہا ہے: (۳) کہ وہ یقین کرنے والے ہیں۔ یہ حضرت عطا اور عکرمہ نے کہا ہے اور اسے ابوظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ (۴) کہ وہ مومن ہیں، یہ لغت حبشہ کے مطابق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہ کہا ہے (1)۔ (۵) کہ وہ ایسی تسبیح کرنے والا ہے جو چٹیل اور وحشت ناک زمین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ یہ کلبی اور حضرت سعید بن مسیب نے کہا ہے (۶) کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے والا ہے۔ یہ عقبہ بن عامر نے کہا ہے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح بیان کرتا ہے تو آپ نے فرمایا: انه لأواه۔ (۷) کہ وہ وہ ہے جو کثرت سے قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اقوال ایک دوسرے میں داخل ہیں اور تلاوت قرآن ان تمام کو جامع ہے۔

(۸) کہ وہ آہ نکالنے والے ہیں۔ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے تھے: ''آتش جہنم سے آہ اس سے پہلے کہ آہ تجھے کوئی فائدہ نہ دے''۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایک آدمی بیت اللہ شریف کا طواف کثرت سے کرتا تھا اور اپنی دعا میں کہتا تھا: أوہ أوہ تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اسے چھوڑ کیونکہ وہ آہیں بھرنے والا ہے''۔ پس میں ایک رات نکلا تو اچانک دیکھا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی کو رات کے وقت دفن کر رہے ہیں اور آپ کے پاس چراغ بھی تھا (2) (۹) کہ وہ فقیہ ہیں۔ یہ حضرت مجاہد اور نخعی نے کہا ہے۔ (۱۰) کہ آپ بڑی عاجزی وانکساری اور خشوع کرنے والے ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ بن شداد بن الہاد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی شے کے بارے گفتگو کی، آپ نے اسے ناپسند کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے روک دیا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ اداھة ہے''۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم الأواھة کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الخاشعة (خشوع کرنے والی، ڈرنے والی) (۱۱) کہ یہ وہ ہے جب اس کے گناہوں کا ذکر کیا جائے تو یہ ان سے استغفار کرے یہ حضرت ابوایوب نے کہا ہے۔ (۱۲) کہ یہ گناہوں سے کثرت سے آہیں نکالنے والا ہے۔ یہ فراء نے کہا ہے۔ (۱۳) کہ یہ خیر کی علامت اور نشانی ہے۔ یہ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے (۱۴) کہ یہ شفیق ہے۔ یہ عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کی شفقت اور نرمی کی وجہ سے الأواہ کا نام دیا جاتا تھا (۱۵) کہ یہ ہر اس شے سے رجوع کرنے والا ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔ یہ حضرت عطا نے کہا ہے۔ اور اس کی اصل التأوہ سے ہے اور اس سے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 61 2۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 62

مراد سینے سے سنائی دینے والی وہ آواز ہے جو سانس اوپر چڑھنے کے سبب ہوتی ہے۔ حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام جب جہنم کا ذکر کرتے تو آہ نکالتے تھے۔ جوہری نے کہا ہے: شکایت اور تکلیف کے وقت ان کا قول أَوْهِ من كذا (واؤ ساکنہ کے ساتھ) بلاشبہ وہ درد کا اظہار کرنا ہی ہے۔ شاعر کا قول ہے:

فأَوْهِ لذكراها إذا ما ذكرتها ومن بُعد أرضٍ بيننا و سماء

اور بسا اوقات وہ واؤ کو الف سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں: آہ من کذا اور بسا اوقات واؤ کو شد اور کسرہ دیتے ہیں اور ہا کو ساکن کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: أَوِّهْ من كذا اور بسا اوقات انہوں نے تشدید کے ساتھ ہا کو حذف کر دیا ہے اور کہا ہے: أَوِّ من كذا اسے بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: آوَّهْ یعنی مد اور تشدید کے ساتھ اس میں واؤ پر فتحہ اور ہا ساکن ہے یعنی یہ لمبی آہ بھرنے کے لیے ہے۔ اور بسا اوقات وہ اس میں تا کو بھی داخل کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: أَوَّتاه وہ اسے مد کے ساتھ بھی اور بغیر مد کے بھی پڑھتے ہیں۔ تحقیق کہا جاتا ہے أَوَّهَ الرجل تأويها وتأوّه تأوّها جب کوئی أَوَّهْ (آ) کہے اور اس سے اسم الآهة مد کے ساتھ ہے۔ مثقب عبدی نے کہا ہے:

إذا ما قمتُ أرحَلُهَا بليلٍ تأوَّه آهةَ الرجلِ الحزين

اور الحلیم کا معنی بہت زیادہ حلم والا، برباد ہے۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جو گناہوں اور غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور تکلیفوں اور اذیتوں پر صبر کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ ہے جس نے کبھی بھی کسی کو سزا نہیں دی مگر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی میں اور کسی کی مدد نہیں کی مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی طرح تھے اور جب آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہوتے تو دو میل تک آپ کے دل کا اضطراب اور دھڑکن سنائی دیتی۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

"اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دستور کہ گمراہ کر دے کسی قوم کو اسے ہدایت دینے کے بعد یہاں تک کہ بیان کر دے ان کے لیے، وہ چیزیں جن سے انہیں بچنا چاہیے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے (ساری) بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی اور نہ کوئی مددگار"۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور نہیں ہے کہ وہ ان کے دلوں میں ہدایت کے بعد گمراہی اور ضلالت واقع کر دے یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں بیان کر دے جن سے انہیں بچنا چاہیے اور وہ ان سے نہ بچیں، تو اس وقت وہ گمراہ کرنے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں اس بات پر بہت واضح دلیل ہے کہ گناہوں کا جب ارتکاب ہو اور ان کے پردے

پھٹ جائیں تو یہ گمراہ اور ردی ہونے کا سبب بن جاتے ہیں اور رشد و ہدایت کو ترک کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے احسان سے ثبات، توفیق اور ہدایت کی التجا کرتے ہیں۔

ابو عمرو بن علاء نے قول باری تعالیٰ: حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ میں کہا ہے: یعنی یہاں تک کہ وہ اپنے امر کے ساتھ ان پر حجت قائم کردے، جیسا کہ فرمایا: وَ اِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا (الاسراء: 16) (اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کردیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں)

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ خاص کر مشرکین کے لیے استغفار نہ کریں اور وہ ان کے لیے طاعت اور معصیت عام طور پر ظاہر اور واضح کریں۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا اور اس میں سختی کی گئی تو انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو اس حال میں فوت ہوئے کہ وہ شراب پیتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اور یہ آیت معتزلہ اور ان کے علاوہ ان کا رد ہے جو اپنی ہدایت اور اپنے ایمان کے خلق کے بارے قول کرتے ہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۱۶﴾ کئی مقام پر اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾

''یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے پیروی کی تھی نبی کی مشکل گھڑی میں اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ٹیڑھے ہو جائیں دل ایک گروہ کے ان میں سے پھر رحمت سے توجہ فرمائی ان پر، بے شک وہ ان سے بہت شفقت کرنے والا رحم فرمانے والا ہے''۔

ترمذی نے روایت بیان کی ہے کہ عبد بن حمید نے ہمیں بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں عبدالرزاق نے بیان کیا (اس نے کہا) ہمیں معمر نے زہری سے، انہوں نے عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ہمیں خبر دی کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ تبوک تک جتنے غزوات لڑے ہیں میں سوائے بدر کے کسی غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا اور غزوۂ بدر سے جو پیچھے رہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی کو عتاب نہیں فرمایا۔ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے اور قریش اپنے قافلے کی مدد کے لیے نکلے تھے، پس بغیر کسی معین پروگرام کے فریقین کا آمنا سامنا ہو گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ مجھے میری عمر کی قسم! ابلا شبہ لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی جنگوں میں سب سے اشرف اور بلند مرتبہ جنگ بدر کا ہے اور میں یہ پسند کرتا تھا اے کاش! میں لیلۃ العقبہ کی بیعت کی جگہ میں اس میں حاضر ہوتا اس وقت ہم نے اسلام پر اعتماد اور یقین کیا تھا، پھر اس کے بعد میں کبھی بھی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا یہاں تک کہ غزوۂ تبوک ہو گیا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے آخری غزوہ تھا۔ اور حضور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان فرمایا، پھر آگے طویل حدیث ذکر کی۔ بیان کیا: پس میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں چل کر حاضر ہوا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور مسلمان آپ کے اردگرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم (کا چہرہ مقدس) چاند کے چمکنے کی طرح چمک رہا تھا (اور روشن تھا) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کام سے خوش اور مسرور ہوتے تو آپ کا رخ زیبا چمک اٹھتا۔ پس میں آیا اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: ''اے کعب بن مالک تجھے بشارت اور مبارک ہو اس خیر و برکت والے دن کی جو تجھ پر آیا (اور وہ ان تمام دنوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے) جب سے تیری ماں نے تجھے جنم دیا ہے''۔ تو میں نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے یا آپ کی جانب سے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ حتی کہ اس مقام تک پہنچ گئے...... اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ انہوں نے بیان کیا: اور ہمارے بارے میں یہ آیت بھی نازل کی گئی: اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ) اور آگے حدیث ذکر کی (1)۔ عنقریب صحیح مسلم کے حوالہ سے مکمل حدیث تین آدمیوں کے قصہ میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء نے اس توبہ اور توجہ کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار پر فرمائی اس کے بارے کئی اقوال ہیں۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: وہ توبہ جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت کی توجہ فرمائی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقوں کو بیٹھے رہنے کی اجازت دینے کی وجہ سے تھی۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (التوبہ: 43) (درگزر فرمایا ہے اللہ نے آپ سے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں) اور مومنین پر ان میں سے بعض کے دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے کی طرف میلان اور رغبت آنے کی وجہ سے تھی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت کی توجہ یہ تھی کہ انہیں تنگی کی شدت اور سختی سے بچا لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کی اذیت اور تکلیف سے خلاصی اور نجات دلانا ہے۔ اور اسے توبہ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس میں توبہ کا معنی موجود ہے اگرچہ یہ اس کی تعریف سے خارج ہے اور وہ پہلی حالت کی طرف لوٹنا اور رجوع کرنا ہے۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: بے شک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر توبہ میں کیا گیا ہے کیونکہ جب آپ ہی ان کی توبہ کا سبب ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کے ساتھ کیا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ (الانفال: 41) (تو اللہ تعالیٰ کے لیے

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 137-136

ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لیے)

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ یعنی جنہوں نے تنگی کے وقت میں آپ کی اتباع کی۔ اور مراد اس غزوہ کے تمام اوقات ہیں۔ اور اس سے اس کی معین ساعت مراد نہیں لی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سَاعَةِ الْعُسْرَةِ سے مراد وہ شدید ترین ساعت ہے جو اس غزوہ کے دوران ان پر گزری۔ اور العسرۃ سے مراد معاملے کی صعوبت اور شدت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ان پر سواریوں کی تنگی، زادراہ کی تنگی اور پانی کی تنگی یہ سب ان پر جمع ہو گئی تھیں (1)۔ حسن نے کہا ہے: مسلمانوں کی تنگی کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک اونٹ پر نکل رہے تھے جسے وہ اپنے درمیان رو کے ہوئے تھے۔ اور ان کا زادراہ گھن لگی کھجوریں، متغیر جو اور بدبودار چربی تھی اور کوئی گروہ نکل رہا ہے کہ ان کے پاس سوائے کھجوروں کے اور کچھ نہیں تھا اور جب ان میں سے کسی کو بھوک لگتی تو وہ کھجور کا ایک ٹکڑا لیتا یہاں تک کہ اس کا ذائقہ پالیتا، پھر وہ اسے اپنے ساتھی کو دے دیتا یہاں تک کہ وہ اس پر پانی کا گھونٹ پی لیتا اسی طرح وہ کرتے رہتے یہاں تک کہ وہ کھجور ان کے آخری ساتھی تک پہنچ جاتی اور کھجور میں سوائے گٹھلی کے کچھ باقی نہ بچتا۔ پس وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورے صدق و یقین کے ساتھ چلتے رہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سَاعَةِ الْعُسْرَةِ کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہم شدید گرمی میں نکلے اور ایک منزل پر جا اترے وہاں شدید پیاس نے ہمیں آلیا یہاں تک کہ ہمیں گمان ہونے لگا کہ ہماری گردنیں پیاس سے کٹ جائیں گی، یہاں تک کہ ایک آدمی اپنا اونٹ ذبح کرتا اور اس کے گوبر کو نچوڑتا اسے پیتا اور مابقی اپنے جگر پر رکھ لیتا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیر و برکت کی دعا کا عادی بنایا ہے سو آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟'' عرض کی: ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک اٹھائے اور انہیں واپس نہ لوٹایا یہاں تک کہ آسمان نے سایہ کر دیا اور پھر برسنے لگا۔ پس انہوں نے وہ سب برتن بھر لیے جو ان کے پاس تھے، پھر ہم اسے دیکھنے کے لیے گئے اور ہم نے اسے نہ پایا اور لشکر آگے گزر گیا۔ (2)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان کیا ہے: ہم غزوۂ تبوک میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے پس لوگوں کو بھوک نے آلیا اور انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ہمیں اجازت عطا فرمائیں تو ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کر لیں اور ہم انہیں کھائیں اور چکنائی حاصل کریں۔ (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کر لو'')۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آ گئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر انہوں نے ایسا کیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی، البتہ آپ انہیں ان کے فالتو زادراہ لانے کا کہیے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں برکت کی دعا فرمائیے شاید اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دے۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں''۔ پھر چمڑے کا ایک ٹکڑا منگایا اور اسے بچھا دیا گیا، پھر آپ نے بچا ہوا زادراہ لانے کی دعوت دی، پس ایک آدمی ایک مشت مکئی لا رہا ہے اور دوسرا ایک مشت کھجور لے کر آتا ہے اور ایک اور گوشت کا ٹکڑا لے کر آتا ہے یہاں تک کہ اس چمڑے کے ٹکڑے پر تھوڑی سی شی جمع ہو گئی۔

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 67
2۔ تفسیر طبری، زیر آیت ہذہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: پس میں نے اسے پھیلایا تو وہ بکریوں کے باڑے کی مقدار تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا: ”تم اپنے برتنوں میں ڈال لو“۔ پس انہوں نے اسے اپنے برتنوں میں ڈال لیا، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے! یہاں تک کہ لشکر میں کوئی برتن باقی نہ رہا مگر انہوں نے اسے بھر لیا اور قوم نے اسے کھایا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گئے۔ اور کچھ فالتو بھی بچ گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں جو بندہ بھی اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کے ساتھ ان میں شک کرتے ہوئے ملاقات کرے گا تو اسے جنت سے روک دیا جائے گا“ (1)۔ اسے مسلم نے اپنی صحیح میں انہی الفاظ اور معنی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور ابن عرفہ نے کہا ہے: جیش تبوک کو جیش عسرہ کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید گرمی میں لوگوں کو غزوہ کی دعوت دی۔ پس یہ ان پر انتہائی سخت اور تنگی کا باعث بنا اور پھلوں کا پکنا بھی ظاہر ہو چکا تھا۔ فرمایا: جیش عسرہ کے ساتھ مثال بیان کی گئی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل اتنی تعداد کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک نہیں ہوئے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد غزوۂ بدر میں تین سو، اس سے کچھ زائد تھی اور احد کے دن سات سو اور خیبر کے دن ایک ہزار پانچ سو فتح مکہ کے دن دس ہزار اور غزوۂ حنین میں تعداد بارہ ہزار تھی۔ اور غزوۂ تبوک میں آپ کا لشکر تیس ہزار سے زائد تھا اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجب میں نکلے اور تبوک میں شعبان اور رمضان کے کچھ دن قیام کیا اور اپنے دستے بھیجے اور کئی اقوام کے ساتھ جزیہ پر صلح کی۔ اور اس غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑا تو منافقوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے بغض کی وجہ سے پیچھے چھوڑا۔ پس وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نکلے اور آپ کو اس کی اطلاع دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أما ترضی أن تکون لی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ (2) (کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو میرے پیچھے اسی طرح ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے ہارون علیہ السلام تھے)

اور بیان فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کا بیٹھنا اجر میں آپ کے ساتھ نکلنے والے کے برابر ہے، کیونکہ اس کا دارومدار شارع کے حکم پر ہے۔ بے شک اس کو غزوۂ تبوک کہا گیا ہے کیونکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ تبوک کی دلدلی زمین میں پیالے لے کر داخل ہو رہے ہیں اور اسے حرکت دے رہے ہیں تاکہ پانی نکل آئے، تو آپ نے فرمایا: مازلتم تبوکونھا بوکا پس اسی وجہ سے اس غزوۂ کا نام غزوۂ تبوک رکھ دیا گیا۔ الحسی (کسرہ کے ساتھ) وہ دلدل (پانی) جسے ریتلی زمین جذب کر لیتی ہے، پس وہ صلابت (سخت زمین) تک پہنچ جائے تو وہ اسے روک لیتی ہے پس تو اس سے ریت کو کھود کر اسے نکال سکتا ہے اور یہی احتساء (کھودنا) ہے۔ یہ جوہری نے کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: مِنۡۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيۡغُ قُلُوۡبُ فَرِيۡقٍ مِّنۡهُمۡ۔ قلوب سیبویہ کے نزدیک تزیغ کے ساتھ مرفوع ہے اور کاد میں کان کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے الحدیث مضمر ہوگا، کیونکہ خبر اسے اسی طرح لازم ہوتی ہے جیسے کان کو لازم ہوتی ہے۔ اور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 42 2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 633

اگر تو چاہے تو کاد کے ساتھ اسے رفع دے، اور تقدیر عبارت ہوگی: من بعد ما کاد قلوب فریق منهم تزیغ اور اعمش، حمزہ اور حفص نے یا کے ساتھ یزیغ پڑھا ہے۔ اور ابو حاتم نے یہ گمان کیا ہے کہ جس نے یا کے ساتھ یزیغ پڑھا ہے تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قلوب کو کاد کے ساتھ رفع دے۔

نحاس نے کہا ہے: وہ جسے انہوں نے جائز نہیں کہا وہ دوسرے کے نزدیک تمام کو مذکر قرار دینے کی بنا پر جائز ہے۔ فراء نے بیان کیا ہے: رَحُبَ البلاد و أرحبت (یعنی اس میں مذکر و مونث دونوں جائز ہیں) اور رحبت اہل حجاز کی لغت ہے اور تزیغ کے معنی میں اختلاف ہے، پس کہا گیا ہے کہ تھکاوٹ، مشقت اور شدت کے ساتھ وہ (دل) ضائع ہو جائیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وہ ممانعت اور نصرت میں حق سے پھر جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے بعد کہ ان میں سے ایک فریق نے پیچھے بیٹھے رہنے اور نافرمانی کا قصد کیا پھر وہ آپ کے ساتھ مل گئے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے واپس پلٹنے کا قصد کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی توجہ فرمائی اور انہیں اس کے بارے حکم دیا۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کا ان پر توجہ فرمانا یہ ہے کہ اس نے ان کے دلوں کا تدارک کیا یہاں تک کہ وہ ٹیڑھے نہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء اور دوستوں کے ساتھ یہی سنت ہے جب وہ کسی ہلاکت پر جھانکنے لگیں اور وہ اپنے آپ کو ہلاکت پر ٹھہرا لیں تو وہ ان پر سخاوت کا بادل برساتا ہے اور ان کے دلوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

منك أرجو ولستُ أعرف رَبًّا　يُرْتَجى منه بعضَ مامنك أرجو

وإذا اشتدت الشدائد في الأرض　على الخلق فاستغاثوا و عجّوا

وابتليتَ العباد بالخوف والجوع　و صَرُّوا على الذنوب ولجُّوا

لم يكن لي سواك ربِّ ملاذ　فتيقَّنت أنني بك أنجو

اور اللہ تعالیٰ نے ثلاثہ (تین) کے حق میں فرمایا: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوْا (تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تاکہ وہ بھی رجوع کریں) پھر کہا گیا ہے: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق دی تاکہ وہ توبہ کر لیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تَابَ عَلَيْهِمْ کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں وسعت دے دی اور انہیں سزا دینے میں جلدی نہ کی تاکہ وہ توبہ کر لیں۔ اور یہ قول بھی ہے: ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تاکہ وہ توبہ پر ثابت قدم رہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تاکہ وہ ان سے حالت رضا کی طرف لوٹ آئیں۔ الحتصر یہ کہ اگر ان کے بارے میں پہلے اس کے علم میں نہ ہوتا کہ اس نے ان کے لیے توبہ کا فیصلہ کیا ہے تو وہ توبہ نہ کرتے۔ اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''تم عمل کرو پس ہر وہ کام آسان بنا دیا گیا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے (اعملوا فكلٌّ مُيَسَّرٌ لما خلق له)(1)

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ

1۔ صحیح مسلم، کتاب القدر، جلد 2، صفحہ 334

اللّٰہَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

"اوران تینوں پر بھی (نظر رحمت فرمائی) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ تعالیٰ سے مگر اسی کی ذات، تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تاکہ وہ بھی رجوع کریں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول فرمانے والا (اور) ہمیشہ رحم کرنے والا ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا کہا گیا ہے: اوران تینوں پر بھی نظر رحمت فرمائی جنہیں توبہ سے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ یہ حضرت مجاہد اور ابو مالک سے مروی ہے۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جو غزوۂ تبوک سے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ اور محمد بن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ خلفوا کا معنی ترکوا (چھوڑ دیئے گئے) ہے، کیونکہ خلفت فلانا کا معنی ہے ترکتہ (میں نے اسے چھوڑ دیا) وفارقتہ قاعدا عما نہضت فیہ (اور میں نے اسے بیٹھے ہوئے چھوڑا اس وقت جب میں اس سے اٹھا)۔ اور عکرمہ بن خالد نے خَلَفُوا پڑھا ہے، یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مقیم رہے۔ اور جعفر بن محمد سے روایت ہے کہ انہوں نے خالفوا پڑھا ہے (انہوں نے آپ کی مخالفت کی)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: خلفوا کا معنی ہے انہیں منافقین سے مؤخر کر دیا گیا اور ان کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اور وہ یہ کہ منافقین کی توبہ قبول نہیں کی گئی۔ اور کئی اقوام نے عذر پیش کیے تو آپ نے ان کے عذر قبول کر لیے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کا معاملہ موخر کر دیا یہاں تک کہ ان کے بارے میں قرآن کریم نازل ہوا۔ یہی صحیح ہے جسے بخاری ومسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ان لوگوں کے معاملے سے ہم تینوں کا فیصلہ ملتوی اور مؤخر کر دیا گیا ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر قبول کر لیے جب انہوں نے آپ کو حلف دے دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیعت لے لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرما دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ موخر کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے فیصلہ فرمادے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا اور جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے وہ اس میں سے نہیں ہے خُلِّفنا تَخَلُّفَنا عن الغزو (ہمارے غزوہ سے پیچھے رہنے کو مؤخر کر دیا گیا) بے شک یہ اس کا ہمیں پیچھے چھوڑنا اور اس کا ہمارے معاملہ کو موخر کرنا ہے ان سے جنہوں نے آپ کے سامنے قسم کھائی اور عذر پیش کیے پس آپ نے ان سے وہ عذر قبول کر لیے (1)۔ اس بارے میں یہ حدیث طویل ہے۔ یہ اس کا آخر ہے۔

اور وہ تین جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا وہ حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع عامری اور ہلال ابن امیہ الواقفی رضی اللہ عنہم ہیں اور یہ تمام انصار میں سے تھے۔ بخاری اور مسلم نے ان کی حدیث بیان کی ہے۔ پس مسلم نے حضرت کعب بن مالک سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے غزوات میں تشریف لے گئے میں کبھی بھی کسی غزوہ میں آپ سے پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے اور یہ کہ میں غزوۂ بدر میں پیچھے رہ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پیچھے رہنے والے کو عتاب نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 360

فرمایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان قریش کے قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر کسی مقررہ وعدہ کے اکٹھا کر دیا۔ اور تحقیق میں عقبہ کی رات رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا جس وقت ہم نے اسلام پر اعتماد اور وثوق کا اظہار کیا اور میرے لیے اس کے بدلے بدر کی حاضری زیادہ محبوب اور پسندیدہ نہ تھی، اگرچہ لوگوں میں بدر کا تذکرہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اور میرا امتحان اور آزمائش اس وقت تھی جب میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہا، کیونکہ میں کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوا اور نہ اس وقت کوئی مجھ سے زیادہ خوشحال تھا جس وقت میں اس غزوہ میں آپ ﷺ سے پیچھے رہ گیا، قسم بخدا! اس سے پہلے کبھی میں نے دو سواریاں جمع نہیں کیں حتیٰ کہ میں نے اس غزوہ میں دو جمع کیں، پس رسول اللہ ﷺ شدید گرمی میں اس غزوہ پر تشریف لے گئے اور آپ نے انتہائی دور اور جنگل کا سفر اختیار کیا اور آپ کا مقابلہ کثیر التعداد دشمن کے ساتھ تھا، پس آپ ﷺ نے مسلمانوں کے لیے ان کا معاملہ واضح کیا تا کہ وہ اپنے غزوے (جنگ) کی تیاری خوب اچھی طرح کریں اور آپ نے انہیں اس وجہ اور سبب کے بارے بتایا جو آپ ارادہ رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمان بھی کثیر تعداد میں تھے اور انہیں حافظ کی کتاب جامع نہیں اس سے مراد دیوان ہے حضرت کعب نے کہا: بہت کم ہی کوئی آدمی تھا جو غائب ہونے کا ارادہ رکھتا ہو، اس کا یہ گمان تھا کہ وہ اس وقت تک مخفی اور چھپا رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بارے میں وحی نازل نہ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ اس غزوہ پر اس وقت تشریف لے گئے جب پھل پکے ہوئے تھے اور سائے گھنے تھے۔ اور میں ان کی طرف زیادہ مائل تھا، پس رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمان اس کے لیے تیار ہو گئے اور میں صبح کے وقت نکلتا تا کہ میں ان کے ساتھ تیار ہو جاؤں پھر لوٹ آتا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتا اور اپنے دل میں کہتا: جب میں نے ارادہ کر لیا تو میں اس کی طاقت اور قدرت رکھتا ہوں۔ پس اسی طرح مسلسل مجھ سے دیر ہوتی رہی اور لوگوں نے تیاری جاری رکھی پس ایک صبح رسول اللہ ﷺ اور آپ کی معیت میں مسلمان غزوہ کے لیے چل پڑے اور میں نے اپنی تیاری کے بارے کوئی فیصلہ نہ کیا۔ پھر میں صبح کے وقت گیا اور لوٹ آیا اور کوئی فیصلہ نہ کیا۔ پس اسی طرح مجھ سے دیر ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ غزوہ کی طرف آگے بڑھ گئے، پس میں نے کوچ کرنے کا ارادہ کیا کہ میں انہیں پا لوں گا، اے کاش میں ایسا کرتا! پھر مجھے وہ قدرت نہ دی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب بھی میں لوگوں میں باہر نکلتا تو مجھے غم اور پریشانی لاحق ہو جاتی کہ میں اپنے لیے کوئی اسوہ اور نمونہ نہیں دیکھتا مگر ایسا آدمی جس پر نفاق کا طعن کیا گیا ہے یا ایسا آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے ضعفاء میں سے معذور قرار دیا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مجھے یاد نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ تبوک پہنچ گئے پس آپ نے تبوک میں ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے فرمایا: ''کعب بن مالک نے کیا کیا ہے''؟ تو بنی سلمہ کے ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! ﷺ اسے اس کی خوشحالی اور اپنی ذات میں اترانے نے روک لیا ہے۔ تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: کتنا برا ہے جو تو نے کہا ہے! قسم بخدا! یا رسول اللہ ﷺ ہم اس کے بارے میں سوائے خیر کے کچھ نہیں جانتے۔ پس رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔

پس اس اثنا میں کہ آپ اسی حال پر تھے کہ آپ نے سفید لباس میں ایک آدمی کو دیکھا جس کے ساتھ سراب چل رہا ہے، تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوخیثمہ ہو''، تو وہ حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ ہی نکلے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے ایک صاع کھجوریں صدقہ کیں یہاں تک کہ منافقوں نے آپ پر عیب لگایا اور طعنہ دیا۔ پس کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس چل پڑے ہیں تو مجھے غم اور پریشانی لاحق ہوگئی۔ تو میں نے جھوٹ گھڑنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگا: میں کس کے سبب کل آپ کی ناراضگی سے بچ سکتا ہوں اور میں اپنے گھر والوں میں سے ہر صاحب رائے سے اس پر (مشاورت کے ذریعہ) مدد لینے لگا۔ پس جب مجھے بتایا گیا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے ہیں تو مجھ سے باطل زائل ہو گیا یہاں تک کہ میں نے جان لیا کہ میں ہرگز کبھی بھی آپ سے کسی شے کے سبب نہیں بچ سکوں گا، چنانچہ میں نے سچائی اور صدق کو جمع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت قدم رنجہ فرما ہوئے اور جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور اس میں دو رکعت نماز ادا فرماتے پھر لوگوں کے لیے تشریف رکھتے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو پیچھے رہنے والے آپ کے پاس حاضر ہوئے اور وہ آپ کے پاس عذر پیش کرنے لگے اور آپ کو حلف دینے لگے اور وہ اسی سے کچھ زائد لوگ تھے، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے ان کے ظاہر اعلان (عذر) کو قبول فرمایا اور ان سے بیعت لی اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ان کے باطن (یعنی مخفی امر اور راز) کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، یہاں تک کہ میں حاضر ہوا پس جب میں نے سلام عرض کیا تو آپ نے اسی طرح تبسم فرمایا جیسے اس پر تبسم کیا جاتا ہے جس پر غصہ اور ناراضگی ہو۔ پھر فرمایا: ''آؤ'' پس میں آگے چلتا آیا یہاں تک کہ آپ کے سامنے بیٹھ گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''تجھے کس چیز نے پیچھے چھوڑ دیا، کیا تو نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ قسم بخدا! اگر میں آپ کے سوا اہل دنیا میں سے کسی اور کے پاس بیٹھا ہوتا تو مجھے یقین ہوتا کہ میں عذر کے سبب اس کی ناراضگی سے نکل جاؤں گا۔ تحقیق مجھے فصاحت اور قوت کلام عطا کی گئی ہے، لیکن قسم بخدا! میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے آج آپ کے ساتھ جھوٹی بات کر بھی دی اور اس کے ساتھ آپ مجھ سے راضی ہو بھی جائیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ پر ناراض کر دے گا۔ اور اگر میں نے سچی بات آپ سے کر دی تو آپ اس میں مجھ پر ناراض ہوں گے تو بلاشبہ میں اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اچھے انجام کی امید رکھتا ہوں۔ قسم بخدا! میرے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ قسم بخدا! میں کبھی بھی اتنا طاقتور نہیں ہوا اور نہ اس وقت کوئی مجھ سے زیادہ خوشحال تھا جس وقت میں آپ سے پیچھے رہ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں تک اس کی بات کا تعلق ہے تو اس نے بالکل سچ کہا ہے پس تو اٹھ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تیرے بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے''۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بنی سلمہ کے لوگ جھپٹ پڑے اور میرے پیچھے ہو گئے انہوں نے مجھے کہا: قسم بخدا! ہمیں تیرے بارے میں یقین ہے کہ تو نے اس سے پہلے کوئی گناہ اور غلطی نہیں کی! تحقیق تو اس بارے میں عاجز آ گیا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس طرح کا کوئی عذر پیش نہیں کیا جس طرح پیچھے رہنے والوں نے آپ کے پاس عذر پیش کیے۔ پس تیرے گناہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیرے لیے استغفار کرنا ہی کافی تھا۔ وہ کہتے ہیں: قسم بخدا! وہ مجھے لگاتار اور مسلسل تنبیہ کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ جاؤں اور اپنے آپ کو جھٹلا دوں۔

پھر میں نے ان کو کہا: کیا اس میں میرے ساتھ کوئی اور بھی ملا ہے؟ انہوں نے بتایا: ہاں تیرے ساتھ دو اور آدمی بھی اس میں شامل ہیں ان دونوں نے بھی اسی طرح کہا ہے جیسے تو نے کہا ہے۔ تو انہیں بھی اسی طرح کہا گیا ہے جیسے تجھے کہا گیا، میں نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ انہوں نے بتایا: مرارہ بن ربیعہ عامری اور ہلال بن امیہ واقفی۔ کعب کہتے ہیں: پس انہوں نے میرے سامنے دو نیک اور صالح آدمیوں کا ذکر کیا۔ تحقیق یہ دونوں غزوۂ بدر میں حاضر تھے اور یہ دونوں قابل تقلید اور اسوہ تھے۔ پس میں بھی ڈٹ گیا جس وقت انہوں نے میرے سامنے ان دونوں کا ذکر کیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہم تینوں سے کلام کرنے سے منع کر دیا۔ ان میں سے جو آپ ﷺ سے پیچھے رہے۔ پس لوگوں نے ہم سے اجتناب کر لیا اور وہ ہمارے لیے بدل گئے یہاں تک کہ زمین بھی میرے لیے اجنبی ہوگئی اور اس زمین میں کوئی شے نہ تھی جسے میں پہچانتا، پس ہم پچاس راتیں اسی حالت پر رہے۔ پس رہے میرے دونوں ساتھی تو انہوں نے عاجزی اور اطاعت اختیار کی اور اپنے گھروں میں بیٹھے رونے لگے اور میں قوم کا جوان اور مضبوط آدمی تھا، لہٰذا میں باہر نکلتا رہا پس میں نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں چکر لگاتا لیکن کوئی آدمی مجھ سے کلام نہ کرتا اور میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کو سلام عرض کرتا درآنحالیکہ آپ نماز کے بعد اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے۔ تو میں دل میں کہتا: کیا آپ ﷺ نے سلام کے جواب کے ساتھ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی ہے یا نہیں؟ پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھنے لگتا اور نظر بچا کر آپ کی طرف دیکھتا، پس جب میں اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ ﷺ میری طرف دیکھتے اور جب میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ ﷺ مجھ سے اعراض فرما لیتے، یہاں تک کہ جب مجھ پر مسلمانوں کی زیادتی طویل ہوگئی، بڑھ گئی تو میں چل پڑا یہاں تک کہ میں ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور وہ میرے چچا کا بیٹا تھا اور مجھے تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب تھا میں نے اسے سلام کیا، بخدا اس نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا۔ تو میں نے اسے کہا: اے ابوقتادہ میں تجھے اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کیا تو جانتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ سے محبت کرتا ہوں؟ کعب کہتے ہیں: پس وہ خاموش رہا تو میں نے دوبارہ اسے کہا اور میں نے اسے قسم دی لیکن وہ خاموش رہا، میں نے پھر کہا اور اسے پکارا تو اس نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول معظم ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں، تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں پیٹھ پھیر کر چل پڑا یہاں تک کہ میں دیوار کو پھلانگ آیا، پس اس اثنا میں کہ میں مدینہ طیبہ کے بازار میں چل رہا تھا تو اہل شام کے ان نبطیوں میں سے ایک نبطی سامنے آیا جو اناج لاتے تھے اور مدینہ طیبہ میں بیچتے تھے۔

وہ کہہ رہا تھا: کون کعب بن مالک پر میری رہنمائی کرے گا؟ آپ کہتے ہیں: پس لوگ اس کے لیے میری طرف اشارے کرنے لگے حتی کہ وہ میرے پاس آ گیا اور اس نے شاہ غسان کا ایک خط مجھے دیا، میں خود کاتب تھا پس میں نے اسے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا: اما بعد! چونکہ میرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تیرے صاحب نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے کوئی کھلا یا تنگ گھر تیرے لیے نہیں بنایا، پس تو ہمارے ساتھ مل جا ہم تیری غمگساری کریں گے۔ پس جونہی میں نے اسے پڑھا تو کہا: یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ پس میں اسے لے کر تنور پر آیا اور اسے اس میں جلا دیا، یہاں تک کہ جب پچاس

میں سے چالیس دن گزر گئے اور وحی رکی رہی تب رسول اللہ ﷺ کا قاصد میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ تجھے حکم دے رہے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جا۔ تو میں نے پوچھا: کیا میں اس کو طلاق دے دوں یا کیا کروں؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس سے علیحدگی اختیار کر لے اور اس کے قریب نہ جا۔ کعب کہتے ہیں: پس آپ ﷺ نے میرے دونوں ساتھیوں کی جانب بھی اسی طرح کا پیغام بھیجا۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو کہا: تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا اور انہیں کے پاس رہ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے۔

آپ کہتے ہیں: ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ بے شک ہلال بن امیہ بوڑھا اور ناکارہ آدمی ہے اس کے پاس کوئی خادم نہیں ہے، تو کیا آپ ناپسند کرتے ہیں کہ میں اس کی خدمت کروں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں لیکن وہ تیرے قریب نہ آئے''۔ تو اس نے کہا: قسم بخدا! بلاشبہ اس میں کوئی حرکت نہیں ہے! اور قسم بخدا! جب سے اس کا معاملہ ہوا ہے وہ اس دن سے آج دن تک مسلسل رو رہا ہے۔ کعب کہتے ہیں: تو میرے بعض گھر والوں نے کہا: اگر تو بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیوی کے بارے میں اجازت مانگ لے، تحقیق آپ نے ہلال بن امیہ کو اجازت عطا فرما دی ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے۔ تو میں نے کہا: میں اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب نہیں کروں گا اور مجھے کیا معلوم کہ رسول اللہ ﷺ کیا فرمائیں گے جب میں اس بارے اجازت طلب کروں اور میں جوان آدمی ہوں؟ کعب کہتے ہیں: پس اسی طرح دس راتیں گزر گئیں۔ اور ہمارے لیے اس وقت سے پچاس راتیں مکمل ہو گئیں جب سے ہمارے ساتھ کلام کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ فرمایا: پھر میں نے پچاسویں رات کی صبح کو اپنے گھروں میں سے ایک مکان کی چھت پر فجر کی نماز پڑھی، پس اس اثنا میں کہ میں اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں کیا ہے کہ میری جان مجھ پر بوجھ ہے اور زمین وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہے میں نے ایک آواز دینے والے کی آواز سنی جو سلع پہاڑ پر چڑھا ہوا تھا وہ اپنی بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے کعب بن مالک! تجھے بشارت اور مبارک ہو۔ آپ فرماتے ہیں: پس میں سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ وسعت آ گئی ہے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ہماری توبہ قبول کرنے کے بارے لوگوں میں اعلان کیا۔ جس وقت آپ نماز فجر پڑھ چکے، تو لوگ ہمیں مبارکباد دینے چل پڑے اور میرے ساتھیوں کی جانب بھی بشارت اور خوشخبری دینے کے لیے گئے۔ اور ایک آدمی گھوڑا دوڑاتے ہوئے میری طرف آیا اور ایک دوڑنے والا بنی اسلم میں سے میری جانب دوڑا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ پس آواز گھوڑے سے زیادہ تیز تھی۔ جب وہ میرے پاس آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی وہ مجھے خوشخبری سنا رہا تھا تو میں نے اس کے لیے اپنے کپڑے اتار دیئے اور میں نے اس کی بشارت کے عوض وہ اسے پہنا دیئے۔ قسم بخدا! میں اس دن ان کے سوا کسی شی کا مالک نہ تھا اور میں نے دو کپڑے عاریۃً لیے اور انہیں خود پہنا پھر میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ کا قصد کرتے ہوئے چل پڑا۔ اور لوگ گروہ در گروہ مجھے ملے اور وہ مجھے توبہ کی قبولیت پر مبارکباد دینے لگے، وہ کہتے: تجھے مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے رحمت کی توجہ تجھ پر فرمائی ہے، یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے اردگرد لوگ جمع تھے۔ پس طلحہ بن

عبید اللہ رضی اللہ عنہ اٹھے، دوڑتے ہوئے آئے یہاں تک کہ مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی۔ قسم بخدا! ان کے سوا مہاجرین میں سے کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔ فرمایا: پس کعب ہے کہ وہ طلحہ کے اس عمل کو نہیں بھولے گا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مقدس فرحت و سرور سے چمک رہا تھا اور آپ نے فرمایا: ''تجھے وہ خیر و برکت والا دن مبارک ہو جو تجھ پر گزرا ہے اس وقت سے جب سے تیری ماں نے تجھے جنم دیا ہے''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے یا آپ کی جانب سے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے''۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا ایسے لگتا گویا آپ کا چہرہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ آپ کہتے ہیں: اور ہم یہ جانتے تھے۔ پس جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی توجہ میں سے یہ ہے کہ میں اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں صدقہ کر دوں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اپنے لیے اپنا بعض مال روک لے یہ تیرے لیے بہتر ہے''۔ تو میں نے عرض کی: میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔ پھر میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے سچ کے ساتھ نجات عطا فرمائی ہے۔ اور بلاشبہ میری توبہ میں سے یہ ہے کہ میں جب تک باقی رہا سچ کے سوا کوئی بات نہیں کروں گا۔ فرماتے ہیں: قسم بخدا! میں مسلمانوں میں سے کسی کو نہیں جانتا جسے اللہ تعالیٰ نے بات کی سچائی میں آزمایا ہو اس وقت سے لے کر میرے آج تک جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا وہ احسن (اور عمدہ) ہو اس سے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے آزمایا، قسم بخدا! میں نے آج تک جھوٹ کا قصد نہیں کیا۔ جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عرض کیا، اور بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ باقی عمر میں بھی میری حفاظت فرمائے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ۝ وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: قسم بخدا! جب اللہ تعالیٰ نے مجھے دین اسلام کی ہدایت عطا فرمائی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کبھی کوئی احسان اور انعام نہیں فرمایا جو میرے خیال کے مطابق میرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچ بولنے سے بڑا اور عظیم ہو، کیونکہ اگر میں آپ کے پاس جھوٹ بولتا تو ہلاک کر دیا جاتا جیسا کہ وہ ہلاک ہوئے جنہوں نے جھوٹ بولا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے کہا جنہوں نے جھوٹ بولا جس وقت اس نے وحی نازل فرمائی جو اس کی نسبت شر اور برا ہے جو کچھ اس نے کسی کو کہا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ) (قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی

طرف تاکہ تم معاف کردو انہیں سو منہ پھیر لو ان سے یقیناً وہ ناپاک ہیں۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لیے تاکہ تم خوش ہو جاؤ ان سے، سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہم تینوں کا معاملہ ان کے معاملے سے مؤخر کیا گیا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر قبول فرما لیے جس وقت انہوں نے قسمیں کھالیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لے لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمادی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ مؤخر کر دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بارے فیصلہ فرمادے۔ پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ اور جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا وہ اس میں سے نہیں ہے کہ غزوے سے ہمارے پیچھے رہنے کے سبب ہم چھوڑ دیئے گئے، بے شک وہ اس کا ہمیں پیچھے چھوڑنا اور اس کا ہمارے معاملے کو مؤخر کرنا ہے ان سے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قسم کھائی اور آپ کے پاس عذر پیش کیا اور آپ نے اسے قبول فرمالیا(1)۔

قولہ تعالیٰ: ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ یعنی ان پر زمین تنگ ہو گئی وسیع ہونے کے باوجود، کہا جاتا ہے: منزل رحب و رحیب و رحاب (وسیع منزل) اور ما مصدر یہ ہے ای ضاقت علیہم الأرض برحبها کیونکہ وہ چھوڑ دیئے گئے تھے نہ ان کے ساتھ معاملات کیے جاتے تھے اور نہ کلام کی جاتی تھی۔ اور اس میں گناہوں اور معصیت کا ارتکاب کرنے والوں کو چھوڑ دینے پر دلیل موجود ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں۔۔

قولہ تعالیٰ: وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ یعنی ان کے سینے غم اور وحشت کے ساتھ تنگ ہو گئے اور اس بدسلوکی کے سبب (ان کے سینے بوجھل ہو گئے) جسے انہوں نے صحابہ کرام سے پایا۔ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ یعنی انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی جائے پناہ نہیں جہاں وہ پناہ لے سکیں ان سے درگزر فرمائے جانے اور ان کی توبہ قبول ہو جانے کی صورت میں مگر اسی کی ذات (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں) ابوبکر الوراق نے کہا ہے: التوبة النصوح (خالص توبہ) یہ ہے کہ توبہ کرنے والے پر زمین وسیع ہونے کے باوجود تنگ ہو جائے اور اس پر اس کی جان بوجھل ہو جائے، جیسا کہ حضرت کعب اور ان کے ساتھیوں کی توبہ رضی اللہ عنہم۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ پس اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ کا آغاز ہوا۔ ابوزید نے کہا ہے: میں نے چار چیزوں میں غلطی کی ہے (اور وہ) اللہ تعالیٰ سے ابتداء ہونے کے بارے میں ہیں، میں نے گمان کیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ: 54) (محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے) اور میرا گمان تھا کہ میں اس سے راضی ہوتا ہوں تب وہ مجھ سے راضی ہوتا ہے۔ (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (المائدہ: 119) (راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ تعالیٰ سے)

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 63-360

اور میں نے گمان کیا کہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں تب وہ میرا ذکر کرتا ہے، (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (العنکبوت: 45) (اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے) اور میں نے گمان یہ کیا کہ میں توبہ کروں گا تب وہ میری طرف رحمت کی توجہ فرمائے گا، (لیکن) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اور کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے پھر ان پر رحمت کی توجہ فرمائی تا کہ وہ توبہ پر ثابت قدم رہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (النساء: 136)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ان کو وسعت دے دی اور ان کی سزا میں جلدی نہ کی جیسا کہ اس نے ان کے سوا کے ساتھ کیا۔ اللہ جل وعز نے ارشاد فرمایا: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء: 160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کردیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لیے)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1 ۔ قولہ تعالیٰ: وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یہ اہل صدق کے ساتھ ہونے کے بارے امر ہے اور تین کے قصے کے بعد بہت اچھا ہے جنہیں سچ نے نفع پہنچایا اور انہیں منافقوں کے مراتب سے دور ہٹا دیا گیا۔ مطرف نے کہا ہے: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہتے ہوئے سنا ہے: جب بھی کوئی آدمی سچ بولتا ہے اور وہ جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی عقل سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ بڑھاپے سے فساد عقل میں سے اس حد تک نہیں پہنچتا جہاں تک کوئی دوسرا پہنچ جاتا ہے (یعنی بڑھاپے اور فساد کے سبب اس کی عقل مختل اور ماؤف نہیں ہوتی)

یہاں مومنین اور صادقین سے جو مراد ہیں ان کے بارے مختلف اقوال ہیں، پس کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان کو ہے جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ خطاب تمام مومنین کو ہے، یعنی تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے بچو۔ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی تم ان کے ساتھ ہو جاؤ جو حضور نبی مکرم ﷺ کی معیت میں نکلے نہ کہ منافقین کے ساتھ، یعنی تم سچ بولنے والوں کے مذہب اور ان کے راستے پر ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں، یعنی تم اعمال صالحہ کر کے جنت میں ان کے ساتھ ہو جاؤ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد وہ ہیں جن کا ذکر اس قول میں ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ... الآیہ تا قولہ ...... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (البقرہ: 177) (نیکی (بس یہ) نہیں کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ ...... یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں)

اور یہ قول بھی ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے وعدہ کو پورا کرنے والے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب: 23) (ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد مہاجرین ہیں، کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیفہ کے دن کہا تھا: بے

شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں صادقین کا نام دیا ہے پس فرمایا: لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ، الآیہ (الحشر: 8) (نیز وہ مال) نادار مہاجرین کے لیے ہے) پھر اس نے تمہیں مفلحین کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ، الآیہ (الحشر: 9) (اور (اس مال میں) ان کا بھی حکم ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن کے ظاہر اور باطن برابر ہیں، ایک جیسے ہیں۔ علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قول ہی حقیقت ہے اور یہی وہ غایت ہے جس پر انتہا ہوتی ہے، کیونکہ یہی صفت ہے جس کے ساتھ عقیدے سے نفاق اور فعل اور عمل سے مخالفت اٹھ جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے اور اس صفت والے کو صدیق کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اور جو مراتب اور زمانے میں ان سے کم اور ادنیٰ ہیں (1)۔ اور رہے وہ جنہوں نے کہا: بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو آیۃ البقرہ سے مراد ہیں تو وہ انتہائی اعلیٰ اور عظیم صدق ہے اور بہت کم لوگ اس کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور یہی آیت احزاب کا معنی ہے۔ اور رہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تفسیر تو وہ وہی ہے جو تمام اقوال کو شامل ہے، کیونکہ ان میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس کا حق ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے عقل و فہم حاصل کی کہ وہ اقوال میں سچ، اعمال میں اخلاص اور احوال میں صفا اور درستی کو لازم پکڑے، پس جو اس طرح ہوا وہ ابرار (نیکوکار لوگوں) کے ساتھ مل گیا اور غفار (بہت زیادہ مغفرت والا فرمانے) کی رضا اور خوشنودی تک پہنچ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم پر سچ کو اختیار کرنا لازم ہے، کیونکہ سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور بے شک نیکی جنت کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور آدمی مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور سچ تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صدیق لکھ دیا جاتا ہے'' (2)۔ اور جھوٹ اس کی ضد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فجور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور فجور جہنم کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور آدمی مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کذاب لکھ دیا جاتا ہے'' (3)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

پس کذب (جھوٹ) عار اور شرم ہے اور جھوٹ بولنے والوں سے شہادت (گواہی) کا حق چھین لیا گیا ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جھوٹ میں آدمی کی شہادت رد کر دی جو اس نے بولا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے: میں نہیں جانتا کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جھوٹ بولا یا لوگوں میں سے کسی کے بارے میں جھوٹ بولا؟

اور شریک بن عبداللہ سے پوچھا گیا: اے ابوعبداللہ! ایسا آدمی جس کے بارے میں نے سنا ہو کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے کیا میں اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہوں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک جھوٹ کے بارے کوئی صلح نہیں ہو سکتی نہ سنجیدگی کے ساتھ اور نہ استہزا اور تمسخر کے ساتھ۔ اور نہ اس کی کہ تم میں سے کوئی کسی شے کا وعدہ کرے پھر اسے پورا نہ کرے، اگر چاہو تو یہ پڑھ لو: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کیا تم کذب میں کوئی رخصت دیکھتے ہو؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں کی بات میں جھوٹ بولنے کی خبر

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 1027
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، جلد 2، صفحہ 326
3۔ ایضاً

قبول نہیں کی جائے گی اگر چہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سچ بولے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: اس کی حدیث قبول کی جائے گی۔ اور صحیح یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے کی شہادت اور اس کی خبر قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا ہے، کیونکہ قبول عظیم مرتبہ ہے اور ولایت شریفہ ہے لہٰذا یہ حاصل نہیں ہو سکتی مگر اس کو جس کی خصلتیں کامل ہوں اور جھوٹ سے بڑھ کر بری خصلت کوئی نہیں پس یہ ولایت سے معزول کر دیتی ہے اور شہادتوں کو باطل کر دیتی ہے(1)۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''نہیں مناسب تھا مدینہ والوں کے لیے اور جو ان کے اردگرد دیہاتی لوگ ہیں کہ پیچھے بیٹھ رہتے اللہ کے رسول پاک سے اور نہ یہ کہ متوجہ ہوتے اپنے نفسوں کی طرف ان سے بے فکر ہو کر، یہ اس لیے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس اور نہ کوئی تکلیف اور نہ بھوک راہ خدا میں اور نہ وہ چلتے ہیں کسی چلنے کی جگہ جس سے کافروں کو غصہ آئے اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ مگر یہ کہ لکھا جاتا ہے ان کے لیے ان (تمام تکلیفوں) کے عوض نیک عمل، بے شک اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکیوں کا اجر۔ اور وہ (مجاہدین) نہیں خرچ کرتے تھوڑا اور نہ زیادہ اور نہ طے کرتے ہیں کسی وادی کو مگر یہ کہ لکھ لیا جاتا ہے ان کے لیے تاکہ صلہ دے اللہ تعالیٰ بہترین ان کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے''۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ یہ کلام ظاہر کے اعتبار سے خبر ہے لیکن اس کا معنی ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب: 53) (اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا یہ محل رفع میں کان کا اسم ہے۔ اور یہ عتاب اور جھڑک ہے ان مومنین کے لیے جو اہل یثرب میں سے تھے اور اس کے پڑوس میں رہنے والے عرب قبائل سے تھے، جیسا کہ مزینہ، جہینہ، اشجع، غفار اور اسلم جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے بیٹھے رہے تھے۔ اور اس کا معنی ہے: ان مذکورہ لوگوں کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ پیچھے بیٹھے رہتے، کیونکہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1028

جنگ کے لیے کوچ ان میں ہوا، بخلاف ان کے علاوہ کے کیونکہ انہیں جنگ کے لیے جمع کیا ہی نہیں گیا، یہ ان میں سے بعض کے قول کے مطابق ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ جنگ کے لیے کوچ کرنے کا مطالبہ ہر مسلم کے لیے ہو اور ان کے قرب و جوار میں ہونے کی وجہ سے انہیں عتاب کے ساتھ خاص کیا گیا اور یہ کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ یعنی نہ یہ کہ وہ راضی ہوئے اپنے نفسوں کے لیے آسودگی اور راحت کے ساتھ اس حال میں کہ رسول اللہ ﷺ مشقت میں ہوں۔ کہا جاتا ہے: رغبت عن کذا یعنی میں نے اسے اپنی برتری جتائی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ یہ اس لیے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس (اس میں ظمأ کا معنی پیاس ہے) عبید ابن عمیر نے ظماء مد کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً خطأ و خطاء، ولا نصب یہ ماقبل پر معطوف ہے، یعنی تکلیف، تھکاوٹ اور اس میں لا تاکید کے لیے زائدہ ہے۔ اور اسی طرح ولا مخمصة اور نہ بھوک۔ اس کا اصل معنی بطن کی کمزوری ہے۔ اور اسی سے رجل خمیص اور امراۃ خُمصانۃ (نحیف مرد اور نحیف عورت) ہے اور پہلے گزر چکا ہے۔

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا یعنی وہ کسی زمین کو طے نہیں کرتے)۔ يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ یعنی ان کے اسے طے کرنے کے ساتھ کافروں کو غصہ آئے۔ اور یہ محل نصب میں ہے، کیونکہ یہ موطئا کی صفت ہے بمعنی غائظا، وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن سے کچھ یعنی قتل یا ہزیمت۔ اس کی اصل نلتُ الشیٔ أنال سے ہے یعنی میں نے اسے پالیا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ ان کے اس قول سے ہے أمر منیل منه (وہ امر جو اس سے پایا گیا) یہ التناول سے نہیں ہے، کیونکہ التناول نلته العطیة (میں نے اسے عطیہ دیا) سے ہے۔ کسی دوسرے نے کہا ہے: نلت أنول من العطیة (میں نے عطیہ پایا) یہ واوی ہے اور النیل یہ یائی ہے۔ تو کہتا ہے: نلته فأنا نائل یعنی میں نے اسے پالیا (ای أدرکته) وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا عرب کہتے ہیں: واد و اودیة یہ خطاب قیاس ہے۔ نحاس نے کہا ہے: جو میں جانتا ہوں اس میں اس کے سوا فاعل اور افعلة معروف نہیں۔ اور قیاس یہ ہے کہ جمع دوادی بنائی جاتی، پس انہوں نے دو واووں کے اجتماع کو ثقیل سمجھا حالانکہ وہ کبھی ایک واؤ کو بھی ثقیل جانتے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے وُقِتَتْ میں أُقتت کہا ہے۔ اور خلیل اور سیبویہ نے واصل جو کہ آدمی کا نام ہے کی تصغیر میں أویصل بیان کیا ہے اور وہ اس کے سوا میں یہ نہیں کہتے اور فراء نے واد کی جمع أدواء بیان کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی جمع أدواۃ بنائی جاتی ہے جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

عرفت بِبُرْقَة الأوداةِ رَسْمًا　مُحِيلا طَالَ عَهْدُكَ مِنْ رُسُومِ

اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر خوف اور ڈر کے عوض ستر ہزار نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور صحیح روایت میں ہے: "گھوڑے تین قسم کے ہیں۔۔۔ اس روایت میں ہے رہا وہ گھوڑا جو اس کے لیے اجر ہے کہ آدمی نے اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اہل اسلام کے لیے چراگاہ یا باغ میں باندھ رکھا ہو پس اس نے اس چراگاہ یا باغ میں سے جو بھی کھایا اس کی تعداد کے مطابق اس کی نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کی لید اور بول کی تعداد

کے بدلے بھی اس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی''۔ الحدیث۔ یہ تو وہ ہے جو ان کے لیے اپنی جگہوں میں ہے تو پھر کیا حالت ہوگی جب وہ اس کے دشمن کی زمین میں داخل ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مال غنیمت میں استحقاق دشمن کی زمین میں داخل ہونے اور ان کے شہروں میں پہنچنے سے ثابت ہو جاتا ہے، پس اگر وہ اس کے بعد فوت بھی ہو جائے تب بھی اس کے لیے مال غنیمت میں سے حصہ ہوگا، یہ قول اشہب اور عبد الملک کا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور امام مالک اور ابن القاسم رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: اس کے لیے کوئی شے نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اجر کا ذکر کیا ہے اور سہم (مال غنیمت کا حصہ) کا ذکر نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے علاقوں کو روندنے، ان کے اموال پانے اور انہیں ان کے گھروں سے نکالنے کے لیے اس کو اجر و ثواب قرار دیا ہے اور یہی چیز انہیں غصہ دلاتی ہے اور ان پر ذلت و رسوائی داخل کرتی ہے، پس یہی مال غنیمت پانے اور قتل کرنے اور قیدی بنانے کے قائم مقام ہوا۔ اور جب معاملہ اس طرح ہے تو پھر غنیمت کا استحقاق ان کی زمین میں داخل ہونے سے ثابت ہو جاتا ہے نہ کہ فقط اونٹ ہانکنے سے، اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو قوم بھی اپنے گھروں کے درمیان میں روندی گئی وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ منسوخ ہے: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے) اور یہ کہ اس کا حکم اس وقت تھا جب مسلمان قلیل تھے، جب زیادہ ہو گئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے جو پیچھے رہنا چاہے اس کے لیے اسے مباح قرار دیا۔ یہ ابن زید نے کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت دیہاتیوں کی طرف بھیجی تاکہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ ڈر گئے اور واپس لوٹ آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، جب آپ بذات خود جنگ کے لیے تشریف لے جائیں تو پھر کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ بغیر عذر کے آپ سے پیچھے بیٹھا رہے۔ اور رہے آپ کے سوا دیگر ائمہ اور حکمران! تو جو چاہے مسلمانوں میں سے اس سے پیچھے رہ جائے بشرطیکہ اسے لوگوں کی اشد حاجت اور ضرورت نہ ہو۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ ولید بن مسلم نے کہا ہے: میں نے اوزاعی، ابن مبارک، فزاری، سبیعی اور سعید بن عبد العزیز کو اس آیت کے بارے یہ کہتے ہوئے سنا ہے: بے شک یہ آیت اس امت کے پہلوں کے لیے بھی ہے اور آخر کے لیے بھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قتادہ کا قول اچھا ہے اور اس کی دلیل تبوک کے غزاۃ ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ ابو داؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق تم نے مدینہ طیبہ میں ایسی اقوام چھوڑی ہیں جو کہ تم کچھ بھی نہیں چلے اور نہ تم نے کچھ خرچ کیا ہے اور نہ تم نے کوئی وادی

طے کی ہے مگر وہ اس میں تمہارے ساتھ رہے"۔ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیسے ہمارے ساتھ ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ طیبہ میں ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں عذر نے روک لیا ہے" (1)۔

مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہم غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو آپ نے فرمایا: "بے شک مدینہ طیبہ میں ایسے لوگ ہیں کہ تم کچھ بھی نہیں چلے اور نہ تم نے کسی وادی کو طے کیا مگر وہ تمہارے ساتھ تھے (کیونکہ) انہیں مرض نے روک لیا ہے" (2)۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذور کو اسی کی مثل اجر عطا کیا جتنا آپ نے طاقتور عمل کرنے والے کو اجر عطا فرمایا۔ اور بعض لوگوں نے کہا: بے شک معذور کے لیے اجر دوگنا کیے بغیر ہوتا ہے اور بذات خود کام کرنے والے کے لیے اجر دوگنا کر دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ تو اللہ تعالیٰ پر اپنی مرضی اور رائے کو ٹھونسنا ہے اور اس کی رحمت کی وسعت کو تنگ کرنا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے عیب قرار دیا ہے اور کہا ہے: بے شک انہیں قطعی طور پر دوگنا ثواب دیا جائے گا اور ہم کسی بھی جگہ دوگنا ہونے کے بارے قطعیت کا قول نہیں کرتے، کیونکہ اس کا دارومدار نیتوں کی مقدار پر ہے اور یہ ایک مخفی اور پوشیدہ امر ہے اور وہ جس کے ساتھ یقین کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ وہاں تضعیف ہے اور تیرا رب اس کے بارے خوب جانتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: احادیث اور آیات میں سے ظاہر یہ ہے کہ اجر میں مساوات اور یکسانیت ہے۔ ان میں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: "جس نے خیر اور نیکی پر راہنمائی کی تو اس کے لیے نیکی کرنے والے کے اجر کی مثل اجر ہوگا" (4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس نے وضو کیا اور نماز کی طرف نکلا پھر اس نے لوگوں کو پایا کہ وہ نماز پڑھ چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مثل اجر عطا فرمائے گا جس نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور اس میں حاضر ہوا" (5)۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ظاہر ہے: وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (النساء: 100) (اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف پھر آلے اس کو (راہ میں) موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ)

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ سچی نیت ہی اصل اعمال ہے، پس جب فعل طاعت میں نیت صحیح ہوئی اور پھر کسی مانع کے سبب اسے کرنے والا اس سے عاجز آ گیا تو اس عاجز کے اجر اور قدرت رکھنے والے فاعل کے اجر کے مساوی اور برابر ہونے میں کوئی بعد اور دوری نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے"۔ واللہ اعلم

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۠

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 340
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 141
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1029
4۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 137
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 83۔ ایضاً، حدیث نمبر 447، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

"اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے، تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی تاکہ تفقہ حاصل کر سکیں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ (نافرمانیوں سے) بچیں"۔

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ بات یہ ہے کہ جہاد فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ سارے کے سارے مومن نکل کھڑے ہوں) کیونکہ اگر تمام نکل پڑیں تو ان کے پیچھے اہل و عیال ضائع ہو جائیں، ہلاک ہو جائیں، پس چاہیے کہ ان میں سے ایک فریق جہاد کے لیے نکلے اور ایک فریق مقیم رہے تاکہ وہ دین میں تفقہ حاصل کریں اور وہ حرام کی ہوئی اشیاء کو خوب یاد کریں، یہاں تک کہ جب جہاد پر جانے والے لوٹ کر آئیں تو مقیم رہنے والے انہیں وہ بتائیں جو احکام شرع میں سے انہوں نے سیکھیں ہیں اور وہ جن کا نزول حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تازہ ہوا ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے قول الا تنفروا اور اس سے پہلی آیت کے لیے ناسخ ہے۔ یہ حضرت مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی بناء پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت طلب علم کے واجب ہونے میں اصل ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سارے کے سارے مومن نکل کھڑے ہوں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہیں اور آپ نہ نکلیں پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ دیں۔ فَلَوْلَا نَفَرَ یہ جاننے کے بعد کہ تمام کے نکلنے کی وسعت نہیں ہے پھر کیوں نہ نکلے۔ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ہر قبیلہ سے چند آدمی۔ اور ان کے باقی ماندہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقی رہیں تاکہ وہ آپ سے دین کا علم حاصل کریں اور اس میں تفقہ حاصل کریں، پھر جب جہاد پر جانے والے ان کی طرف لوٹ کر آئیں تو یہ انہیں وہ سب بتائیں جو انہوں نے سنا اور جس کا علم حاصل کیا۔ اس میں کتاب و سنت میں تفقہ کے واجب ہونے کا ذکر ہے۔ اور یہ کہ یہ کفایہ ہے عین نہیں ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل) (پس دریافت کر لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے) پس اس میں ہر وہ داخل ہے جو کتاب و سنت کو نہیں جانتا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَلَوْلَا نَفَرَ اخفش نے کہا ہے: یہ فهلا نفر کے معنی میں ہے پس کیوں نہ نکلے۔ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لغت میں طائفہ سے مراد جماعت ہے اور کبھی اس کا اطلاق اس سے کم پر ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ آدمیوں تک پہنچ جاتا ہے اور ایک کے لیے اس کا اطلاق نفس طائفہ کے معنی میں ہوتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً (التوبہ: 66) میں طائفہ سے مراد ایک آدمی ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں مراد جماعت ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک عقلی وجہ ہے اور دوسری لغوی۔ عقلی وجہ یہ ہے کہ امر غالب یہ ہے کہ فرد واحد کے ساتھ علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور رہی لغوی وجہ تو قول باری تعالیٰ: لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ جمع کی ضمیر کے ساتھ مذکور ہے۔

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قاضی ابوبکر اور ان سے پہلے شیخ ابوالحسن کی رائے ہے کہ یہاں طائفہ سے مراد واحد (ایک) ہے اور اس میں وہ اس دلیل سے قوت حاصل کرتے ہیں کہ خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور یہ صحیح ہے اس جہت سے نہیں کہ طائفہ کا اطلاق واحد پر ہوتا ہے بلکہ اس جہت سے کہ ایک شخص یا کئی اشخاص کی خبر خبر واحد ہے (1) اور یہ کہ خبر واحد کے مقابل خبر متواتر ہے جو غیر محصور ہوتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کیا ایسی نص ہے جس سے اس پر استدلال کیا جا سکتا ہو کہ واحد کو طائفہ کہا جا سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا (الحجرات:9) یعنی نفسین (دو نفس)۔ اگر مومنین میں سے دو آدمی لڑ پڑیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ (الحجرات:10) (پس صلح کرا دو اپنے دو بھائیوں کے درمیان) پس یہ لفظ تثنیہ کے ساتھ مذکور ہے اور اقتتلوا میں ضمیر اگرچہ جمع کی ہے، پس اور جمع کا اقل فرد دو ہے یہ علماء کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لِیَتَفَقَّهُوْا، لِیَتَفَقَّهُوْا اور لِیُنْذِرُوْا میں ضمیر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقیم رہنے والوں کے لیے ہے۔ یہ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ دونوں ضمیریں جہاد پر نکلنے والے گروہ کے لیے ہیں۔ علامہ طبری نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ کا معنی ہے تا کہ وہ بصیرت اور یقین حاصل کریں اس کے ساتھ جو اللہ کریم انہیں مشرکوں پر غلبے اور نصرت دین میں سے دکھائے۔ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اور تا کہ وہ کفار میں سے اپنی قوم کو ڈرائیں۔ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ جب وہ ان کی طرف جہاد سے لوٹ کر آئیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی اس مدد و نصرت کے بارے انہیں مطلع کریں جو اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی فرمائی۔ اور یہ کہ ان کے لیے ان کے ساتھ قتال کرنے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قتال کرنے کی طاقت نہیں ہے، پس وہ ان پر وہ کچھ نازل کرتا ہے جو اس نے ان کافر ساتھیوں پر نازل نہیں کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ کا قول زیادہ بین اور واضح ہے، یعنی تا کہ وہ طائفہ تفقہ حاصل کرے جو سرایا میں کوچ کرنے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیچھے رہا۔ اور یہ علم کی طلب پر ابھارنے اور اس کے مندوب ہونے کا (متقاضی ہے) نہ کہ وجوب اور لازم ہونے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ کلام کی قوت میں نہیں ہے، بلاشبہ علم کو اس کے ادلہ کے ساتھ طلب کرنا لازم ہے۔ یہ ابوبکر بن عربی نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علم کی طلب، دو قسموں میں منقسم ہوتی ہے: فرض عین، مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی میں حدیث طیبہ موجود ہے: "بے شک علم طلب کرنا فرض ہے"۔ عبدالقدوس بن حبیب نے روایت کیا ہے۔ ابوسعید الوحاظی نے حماد بن ابی سلیمان سے اور انہوں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1031

ہے: ''علم طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے'' (1)۔ ابراہیم نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوائے اس حدیث کے اور کوئی نہیں سنی۔

علم طلب کرنا فرض کفایہ ہے، جیسے حقوق حاصل کرنا، حدود قائم کرنا اور جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کرنا وغیرہ۔ جب یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام لوگ اسے سیکھیں کیونکہ اس سے ان کے احوال اور ان کے سرایا کے احوال فاسد اور ضائع ہو جائیں گے۔ اور ان کے معاملات معاش میں نقصان ہوگا یا وہ باطل ہو جائیں گے، پس دونوں حالوں کے درمیان متعین یہ ہوا کہ بغیر کسی تعیین کے بعض اس فریضہ کو ادا کریں اور یہ اس اعتبار سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے بندوں کے لیے آسان فرما دے اور اسے ان کے درمیان اپنی رحمت اور حکمت سے سابقہ قدرت اور کلام کے ساتھ تقسیم فرما دے۔

مسئلہ نمبر 6۔ علم کی طلب عظیم فضیلت ہے اور ایک شریف اور عالی شان مرتبہ ہے کوئی عمل اس کے مساوی نہیں ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو بندہ کسی راستے پر چلا وہ اس میں علم تلاش کرنے لگا تو اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کے راستے پر گامزن کر دیا اور بلاشبہ ملائکہ طالب علم کی خوشنودی اور رضا کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور بے شک عالم کے لیے زمین و آسمان میں رہنے والے استغفار کرتے ہیں اور پانی میں رہنے والی مچھلیاں بھی۔ اور بے شک عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے۔ اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بے شک انبیاء علیہم السلام نے بطور میراث دینار و درہم نہیں چھوڑے بلکہ انہوں نے علم کو میراث قرار دیا ہے پس جس نے اسے حاصل کیا تو اس نے حظ وافر حاصل کر لیا'' (2)۔

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ ہمیں ابو المغیرہ نے بیان کیا (انہوں نے کہا) ہمیں امام اوزاعی نے حسن سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو آدمیوں کے بارے میں پوچھا گیا وہ دونوں بنی اسرائیل میں سے تھے، ان میں سے ایک عالم تھا وہ فرض نماز پڑھتا پھر بیٹھ جاتا اور لوگوں کو خیر اور نیکی کی تعلیم دیتا۔ اور دوسرا دن کو روزہ رکھتا اور رات کو قیام کرتا تھا، ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس عالم کی فضیلت جو فرض نماز پڑھتا ہے پھر بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کو خیر اور نیکی کی تعلیم دیتا ہے اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے اس طرح ہے جیسے تم میں سے ادنیٰ پر مجھے فضیلت حاصل ہے'' (3)۔ اسے ابو عمر نے کتاب (بیان العلم) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مسند ذکر کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جیسے میری فضیلت میری امت پر ہے'' (4)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: افضل جہاد اس کا ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، المقدمہ باب فضل العلماء، جلد 1، صفحہ 20　　2۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93

3۔ سنن دارمی، کتاب العلم، جلد 1، صفحہ 82۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، حدیث نمبر 2609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93

جس نے مسجد بنائی اور اس میں قرآن، فقہ اور سنت کی تعلیم دیتا ہو۔ (افضل الجهاد من بنى مسجدا يعلم فيه القرآن والفقه والسنة) اسے شریک نے لیث بن ابی سلیم سے، انہوں نے یحیٰی بن ابی کثیر سے اور انہوں نے علی ازدی سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھے فرمایا: کیا میں تیری اس پر رہنمائی نہ کروں جو تیرے لیے جہاد سے بہتر ہے؟ تو مسجد میں آ اور اس میں قرآن کریم پڑھا اور اس میں فقہ کی تعلیم دے۔ اور ربیع نے کہا ہے میں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: علم حاصل کرنا نفلی نماز پڑھنے سے زیادہ واجب اور بہتر ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں'' (1)۔ یہ حدیث دو وجہوں کا احتمال رکھتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ وہ اس پر مہربان اور شفیق ہوتے ہیں اور اس پر رحم فرماتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر فرمایا ہے جہاں اس نے اولاد کو والدین کے ساتھ احسان کرنے کی نصیحت کی ہے فرمایا: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (الاسراء: 24) (اور جھکا دو ان کے لیے تواضع اور انکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے) یعنی ان دونوں کے ساتھ تواضع سے پیش آ۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پر رکھنے سے مراد انہیں بچھانا ہو، کیونکہ بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں: وان الملائكة تفرش أجنحتها یعنی بے شک ملائکہ جب کسی طالب علم کو دیکھیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے اسے حاصل کر رہا ہے اور اس کے تمام احوال طلب علم کے موافق ہوں تو وہ اس کے لیے اس کے سفر میں اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور اسے ان پر اٹھا لیتے ہیں۔ پس جو وہاں محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ ننگے پاؤں نہیں رہتا اگر وہ چلتا ہے اور نہ وہ تھکتا ہے اور اس کے لیے دور کا راستہ قریب ہو جاتا ہے اور مختلف انواع کا ضرر اور تکلیف جو کسی اور مسافر کو پہنچتی ہے وہ اسے نہیں پہنچتی، جیسا کہ مرض، مال کا ضائع ہو جانا اور راستے سے بھٹک جانا۔ اور ان میں سے کچھ چیزیں سورۂ آل عمران میں قول باری تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ، آیہ (آل عمران: 18) کے تحت گزر چکی ہیں۔

عمران بن حصین نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری امت سے ایک گروہ مسلسل حق پر قائم اور ثابت رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی'' (2)۔ یزید بن ہارون نے کہا ہے: اگر وہ اصحاب الحدیث نہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں؟

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی تاویل میں یہ عبدالرزاق کا قول ہے، بے شک وہ اصحاب حدیث ہی ہیں۔ اسے ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے شیخ الاستاذ المقری النحوی المحدث ابو جعفر احمد بن محمد بن محمد القیسی القرطبی المعروف با بن ابی حجہ رحمہ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی تاویل میں کہتے ہیں: لا يزال أهل الغرب ظاهرين على الحق حتى تقوم الساعة (3) (اہل غرب حق پر غالب رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے) کہ بلاشبہ وہ علماء ہیں۔ انہوں نے کہا: وہ اس لیے کہ الغرب لفظ مشترک ہے اس کا اطلاق بڑے ڈول پر بھی کیا جاتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کی سمت پر بھی اور اس کا اطلاق آنسو بہنے پر بھی کیا جاتا ہے، پس لا يزال أهل الغرب کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنسو بہانے

1۔ جامع ترمذی، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 93 2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 143 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 144

والے اس کا اور اس کے احکام کا علم رکھنے کے سبب ہمیشہ غالب رہیں گے۔ الحدیث۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (فاطر: 28) (اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد جو صحیح مسلم میں ہے تقویت دیتا ہے: ''جس کے بارے اللہ تعالیٰ خیر اور بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرماتا ہے اور مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر قتال کرتی رہے گی یوم قیامت تک ان پر غالب آتے ہوئے جوان سے لڑے'' (1)۔ اس بیان کا ظاہر یہ ہے کہ اس کا اول اس کے آخر کے ساتھ مربوط ہے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَكُمۡ مِّنَ الۡكُفَّارِ وَلۡیَجِدُوۡا فِیۡكُمۡ غِلۡظَةً ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ۝

''اے ایمان والو! جنگ کرو ان کافروں سے جو آس پاس ہیں تمہارے اور چاہیے کہ وہ پائیں تم میں سختی اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں جہاد کی کیفیت سے آگاہ فرمایا اور یہ کہ ابتداء قریبی دشمن سے ہو پھر جو اس کے بعد قریبی ہو، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز عرب سے کیا اور جب ان سے فارغ ہوئے تو روم کا قصد کیا اور وہ شام میں تھے۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے قتال کا حکم دیئے جانے سے پہلے نازل ہوئی۔ پس یہ اس تدریج میں سے ہے جو قبل از اسلام تھی۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اس آیت سے اس کے نازل ہونے کے وقت مراد عرب تھے، پس جب آپ ان سے فارغ ہوئے تو پھر روم وغیرہم کے بارے میں قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ (التوبہ: 29) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر) نازل ہوئی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس سے دیلم مراد لیے گئے ہیں۔ اور مروی ہے کہ ان سے پوچھا گیا: کس سے ابتدا کی جائے گی روم یا دیلم سے؟ تو انہوں نے فرمایا: روم سے۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ دیلم، ترک اور روم سے جنگ کرنا ہے (2)۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ الاقرب فالاقرب اور الادنی فالادنی (قریب تر پھر اس کے بعد قریب الخ) کے قتال میں آیت اپنے عموم پر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی آیت کا ظاہر ہے۔ اور ابن عربی نے یہ اختیار کیا ہے کہ دیلم سے پہلے روم سے ابتدا کی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس کی تین وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں، پس ان پر حجت زیادہ اور پختہ کرنے والی ہے۔ دوسری یہ ہے کہ وہ ہمارے یعنی اہل مدینہ کے زیادہ قریب ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے شہران کے شہروں میں زیادہ ہیں پس ان کو ان سے بچانا زیادہ واجب

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارہ، جلد 2، صفحہ 144　2۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 84، ملہوم

اور ضروری ہے (1)۔ واللہ اعلم

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً اور چاہیے کہ وہ تم میں شدت، قوت اور حمیت پائیں۔ اور فضل نے اعمش سے اور انہوں نے عاصم سے غلظة غین کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز اور بنی اسد کی لغت غین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور بنی تمیم کی لغت غلظة غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

"اور جب کبھی نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعض ان میں سے وہ ہیں جو (شرارتاً) کہتے ہیں کہ کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا ہے اس سورت نے ایمان، تو وہ (سن لیں) ایمان والوں کے ایمان میں اس سورت نے اضافہ کر دیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں"۔

اس میں مسئلہ ہے اور مراد منافقین ہیں۔ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ اور سورت کا معنی بھی مقدمۃ الکتاب میں گزر چکا ہے، پس اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور حسن نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف لکھا: "بے شک ایمان کے فرائض اور سنتیں ہیں جس نے انہیں مکمل کیا تحقیق اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس نے انہیں مکمل نہ کیا اس نے ایمان کو مکمل نہ کیا"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا: "اگر میں زندہ رہا تو میں تمہارے لیے ان کی وضاحت کر دوں گا اور اگر میں فوت ہو گیا تو پھر میں تمہاری صحبت پر حریص نہیں ہوں" (2)۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن المبارک نے کہا ہے: میں نے اس سے کوئی چارہ نہ پایا کہ میں ایمان کی زیادتی کے بارے قول کروں، ورنہ میں قرآن کو رد کر دیتا۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو بڑھا دی اس سورت نے ان میں اور پلیدی ان کی (سابقہ) پلیدی پر اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یعنی جن کے دلوں میں شک، ریب اور نفاق ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ یعنی اس سورت نے ان کے سابقہ شک پر شک کا اور سابقہ کفر پر کفر کا اضافہ کر دیا۔ اور مقاتل نے کہا ہے: ان کے سابقہ گناہ پر گناہ کو بڑھا دیا۔ تمام معنی باہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَ لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1032

2۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 6

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک بار یا دو بار پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ عام قرات یا کے ساتھ ہے اور یہ منافقین کے بارے خبر ہے۔ اور یہ حمزہ اور یعقوب نے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ان کے بارے خبر ہے اور خطاب مومنین کو ہے۔ اور اعمش نے أولم یروا پڑھا ہے۔ اور طلحہ بن مصرف نے أولا ترى قراءت کی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے اور یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔

اور یُفْتَنُوْنَ علامہ طبری نے کہا: اس کا معنی ہے وہ آزمائے جاتے ہیں (1)۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قحط اور شدت کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔ اور عطیہ نے کہا ہے: وہ آزمائے جاتے ہیں بیماریوں اور بھوک کے ساتھ (2)۔ اور یہ موت کی علامات اور جاسوس ہیں۔ اور حضرت قتادہ، حسن اور مجاہد نے کہا ہے: وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد اور جنگ کرنے کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مدد و نصرت کا جو وعدہ فرما رکھا ہے وہ اسے دیکھتے ہیں۔

ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ پھر بھی وہ اس کے لیے توبہ نہیں کرتے۔ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ اور نہ وہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ۝۱۲۷

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو دیکھنے لگتے ہیں ایک دوسرے کی طرف کیا دیکھ تو نہیں رہا تمہیں کوئی پھر چل دیتے ہیں، پھیر دیئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کیونکہ یہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ اس میں ما صلہ ہے اور مراد منافقین ہیں، یعنی جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں اس حال میں کہ آپ قرآن کریم پڑھ رہے ہوں جس میں ان کی فضیحت و رسوائی یا ان میں سے کسی ایک کی فضیحت و رسوائی نازل کی گئی ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف علی جہۃ التقریر خوف کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: کیا کوئی تمہیں دیکھتا ہے جب تم اس بارے گفتگو کرتے ہو کہ وہ اسے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے ان کی جہالت ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب میں سے جس پر چاہتا ہے آپ کو مطلع کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اس آیت میں نظر بمعنی انبا (خبر دینا) ہے۔ اور علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس آیت میں نظر، قال کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ انْصَرَفُوْا یعنی ہدایت کے راستے سے پھر جاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ جس وقت ان کے لیے ان کے اسرار و رموز کھول کر بیان کر دیئے اور ان کے مخفی اور غیبی امور پر انہیں آگاہ کر دیا تو لامحالہ انہیں تعجب، توقف اور نظر و فکر لاحق ہوئی پس اگر وہ ہدایت پا لیتے تو یقیناً وہی وقت ان کے ایمان پائے جانے کا محل تھا، لیکن وہ جب کفر پر مصمم ارادہ رکھتے تھے اور اسی کا

1۔ تفسیر طبری، سورۂ توبہ، جلد 11، صفحہ 87 2۔ معالم التنزیل، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 132

ارتکاب کرتے تھے تو گویا وہ اس حالت سے پھر گئے جو نظر صحیح اور ہدایت کے پائے جانے کی حالت تھی۔ اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی قراءت کو اس کے سامع کی طرح نہیں سنا جو اس کی آیات میں تدبر اور غور و فکر کرتا ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (الانفال) (بے شک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد) (کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں)

قولہ تعالیٰ: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یہ ان کے لیے بددعا ہے، یعنی تم ان کے لیے یہ کہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دلوں کو خیر اور نیکی سے پھرنے کے بارے خبر ہو۔ ان کے عمل پر یہ جزا دی گئی ہو۔ اور یہ ایسا کلمہ ہے جس کے ساتھ دعا کی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ (التوبہ: 30) (اللہ انہیں قتل کرے) اور بأنهم میں با صرف کا صلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: یہ مکروہ ہے کہ اس طرح کہا جائے: انصرفنا من الصلوٰة (ہم نماز سے پھر گئے) کیونکہ قوم جب پھر جائے تو اللہ تعالیٰ ان کے دل پھیر دیتا ہے البتہ تم یہ کہو: قضینا الصلوٰة (1) (ہم نے نماز پوری کر لی)۔ علامہ طبری نے آپ سے اسے مسند ذکر کیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ محل نظر ہے اور میں اسے صحیح گمان نہیں کرتا، کیونکہ نظم کلام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کہا جاتا: کوئی یہ نہ کہے ہم نماز سے پھر گئے (لا يقل أحد انصرفنا من الصلوٰة) کیونکہ ایک قوم کے بارے میں یہ کہا گیا ہے: ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (التوبہ: 127) (2) (پھر وہ پھر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پھیر دیئے)

محمد بن عبدالملک القیسی الواعظ نے ہمیں خبر دی ہے (انہوں نے کہا) ابوالفضل جوہری نے اس سے یہ سنتے ہوئے ہمیں بتایا جو کہتا ہے: ہم ایک جنازہ میں تھے تو اس سے ڈرانے والے نے کہا: انصرفوا رحمکم اللہ (پھر جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے) تو اس نے کہا: کوئی یہ نہ کہے: انصرفوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت میں کہا ہے: ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بلکہ تم یہ کہو انقلبوا رحمکم اللہ (تم پلٹ جاؤ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مدح میں یہ کہا ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (آل عمران: 174) (کہ واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے)

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہی دلوں کو پھیرنے اور تبدیل کرنے والا ہے اور وہی انہیں پلٹنے اور الٹنے والا ہے۔ یہ قدریہ کا رد ہے۔ ان کے اعتقاد میں یہ ہے کہ مخلوق کے دل ان کے اپنے ہاتھوں میں ہیں اور ان کے اعضاء ان کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق تصرف کرتے ہیں اور اپنے ارادے اور اختیار کے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1033
2۔ ایضاً

مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کہا ہے جسے ان سے اشہب نے روایت کیا ہے: قدریہ کے رد میں یہ کتنا واضح اور بین ارشاد ہے: لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ (التوبہ: 110) (ان کی وہ عمارت جو انہوں نے اپنے دلوں میں شک کی بنا پر بنائی وہ مسلسل رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل کٹ جائیں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ہے: أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ (ہود: 36) (کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے) پس یہ نہ ہمیشہ ہو سکتا ہے اور نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے اور نہ یہ زائل ہو سکتا ہے(1)۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾

''بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے گراں گزرتا ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا بہت ہی خواہش مند ہے تمہاری بھلائی کا مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔ (اے حبیب!) پھر اگر منہ موڑ لیں تو آپ فرما دیں کافی ہے مجھے اللہ، نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے''۔

حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ دونوں آیتیں از روئے عہد کے آسمان سے زیادہ قریب ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر کے قول میں ہے: قرآن کریم میں سے جو آیت آخر میں نازل ہوئی وہ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (البقرہ: 281) ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے قول میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس ارشاد: وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ کے بعد یہ دونوں آیتیں عہد کے اعتبار سے آسمان سے زیادہ قریب ہیں۔ واللہ اعلم

جمہور کے نزدیک یہ خطاب عربوں کو ہے اور یہ ان پر احسانات اور نعمتیں شمار کرنے کی جہت پر ہے، کیونکہ آپ ان کی زبان میں وہ لے کر آئے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں اور آپ کے ساتھ بقیہ ایام میں شرف و عظمت عطا کی گئی۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہ خطاب تمام عالم کو ہے اور معنی یہ ہے: لقد جاء کم رسول من البشر (تحقیق تمہارے پاس انسانوں میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا)۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: عرب کا کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنم دیا ہے، تو گویا یہ فرمایا: اے گروہ عرب! تحقیق تمہارے پاس بنی اسماعیل میں سے ایک برگزیدہ رسول تشریف لایا۔ اور دوسرا قول حجت کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لیے ہے، یعنی وہ تمہاری مثل بشر ہیں تا کہ تم ان سے (احکام) سمجھ سکو اور آپ کی اقتدا اور پیروی کر سکو۔

قولہ تعالیٰ: مِّنْ أَنفُسِكُمْ یہ ارشاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور یہ کہ آپ خالص اور پکے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 2، صفحہ 1033

عرب تھے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو چنا ہے اور کنانہ میں سے قریش کو چنا ہے اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب کیا ہے اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا ہے“ (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”بلاشبہ میں نکاح سے (پیدا ہوا) ہوں اور میں زنا سے نہیں ہوں“۔ اس کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک اس میں ولادت نکاح سے ہوئی ہے، اس میں زنا نہیں ہوا۔

اور عبداللہ بن قسیط المکی نے مِّنْ اَنْفَسِكُمْ فا کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ نفاسۃ سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کی گئی ہے (2)، یعنی جاء کم رسول من أشرفکم و أفضلکم (تم میں سے زیادہ شرف و فضل والا رسول تمہارے پاس تشریف لایا) یہ تیرے اس قول سے ہے: شئ نفیس جب وہ شی مرغوب فیہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: من أنفسکم یعنی تم میں سے بہت زیادہ اطاعت کرنے والا (رسول تمہارے پاس تشریف لایا)

قولہ تعالیٰ: عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ یعنی تمہاری مشقت آپ پر گراں گزرتی ہے۔ اور العنت کا معنی مشقت ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: اَكَمَةٌ عَنُوتٌ جب ٹیلہ مشقت آمیز اور مہلک ہو۔ اور ابن انباری نے کہا ہے: تعنت میں اصل معنی تشدد کرنا، تکلیف پہنچانا ہے پس جب عرب کہیں: فلان یتعنت فلانا و یُعنته تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں اس پر تشدد کر رہا ہے اور اسے ایسی شے کے ساتھ لازم کر رہا ہے جس کی ادائیگی اس پر مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ اس کا ذکر سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور مَا عَنِتُّمْ میں ما مصدریہ ہے، اور یہ مبتدا ہے اور عزیز خبر مقدم ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مَا عَنِتُّمْ عزیز کے ساتھ فاعل ہو۔ اور عزیز، رسول کی صفت ہو، اور زیادہ صحیح ہے۔ اور اسی طرح حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ اور رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں۔ فراء نے کہا ہے: اور اگر عزیزا علیہ ما عنتم حریصا رؤفا رحیما پڑھا جائے تو یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہوں گے اور یہ جائز ہے۔

ابو جعفر نحاس نے کہا ہے: اس کے معنی میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے احسن جو کلام عرب سے موافقت رکھتا ہے وہ ہے کہ احمد بن محمد الازدی نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا عبداللہ بن محمد خزاعی نے ہمیں بیان کیا اس نے کہا میں نے عمرو بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عبداللہ بن داود خریبی کو رب کریم کے اس ارشاد میں یہ کہتے ہوئے سنا: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ فرمایا (ان پر گراں گزرتا ہے) کہ تم جہنم میں داخل ہو۔ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ فرمایا (وہ تمہارے بارے میں بہت خواہشمند ہیں) کہ تم جنت میں داخل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں بہت خواہش مند ہیں کہ تم ایمان لاؤ۔ اور فراء نے کہا ہے: وہ بخیل ہیں اس بارے کہ تم جہنم میں داخل ہو۔ اور الحرص علی الشئ کا معنی ہے الشح علیہ أن یضیع و یتلف (اس پر بخل کرنا کہ وہ اسے ضائع کرے اور تلف کرے)

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ، الرءوف کا معنی ہے، بہت زیادہ نرمی اور شفقت کرنے والا۔ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کا مکمل

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 245
2۔ المحرر الوجیز، سورۂ توبہ، جلد 3، صفحہ 100

معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں سے دو اسم انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کے لیے بھی سوائے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمع نہیں فرمائے، پس اس نے ارشاد فرمایا: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اور فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝ (بقرہ) اور عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا ہے: نظم آیت لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ سے مقصود تمہاری شان اور حالت ہے اور وہ تمہارے لیے شفاعت قائم کرنے والا ہے، پس تم مَا عَنِتُّمْ سے ان کا قصد نہ کرو جو تمہیں ان کی سنت پر قائم رکھیں کیونکہ تمہارا جنت میں داخل ہونا ہی انہیں راضی اور خوش کر سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر کفار اعراض کریں ان نعمتوں کے بعد بھی جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے تو پھر کہو حَسْبِيَ اللّٰهُ! اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ نہیں کوئی معبود بجز اس کے میں نے اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا، اور اپنے تمام امور میں نے اسی کے سپرد کر دیئے۔ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ عرش کو خاص کیا، کیونکہ وہ اعظم المخلوقات ہے جب اس کا ذکر کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر شے اس میں داخل ہو جائے گی۔ اور قراءت عامہ کے مطابق العظیم مجرور ہے کیونکہ وہ عرش کی صفت ہے اور رب کی صفت بناتے ہوئے اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

یہ قراءت ابن کثیر سے مروی ہے اور یہی قراءت ابن محیصن کی ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: جس نے صبح و شام سات مرتبہ پڑھا حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۝ تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہے اس کام میں جس کا اس نے ارادہ اور قصد کیا چاہے وہ اس میں سچا ہو یا جھوٹا اور "نوادر الاصول" (1) میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے ہر نماز کے بعد دس کلمات کہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو ان کے پاس کافی اور جزا دینے والا پائے گا۔ ان میں سے پانچ دنیا کے لیے ہے اور پانچ آخرت کے لیے حسبی اللہ لدینی (اللہ تعالیٰ میرے دین کے لیے مجھے کافی ہے) حسبی اللہ لدنیای (اللہ تعالیٰ میری دنیا کے لیے مجھے کافی ہے) حسبی اللہ لما أهمنی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس شے کے لیے جو مجھے غم میں ڈال دے) حسبی اللہ لمن بغی علیّ (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو مجھ پر زیادتی کرے) حسبی اللہ لمن حسدنی (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو میرے ساتھ حسد کرے) حسبی اللہ لمن کادنی بسوء (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے لیے جو برائی کے ساتھ میرے قریب ہو) حسبی اللہ عند الموت (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے موت کے وقت) حسبی اللہ عند المسألة فی القبر (اللہ تعالیٰ قبر میں سوال کے وقت مجھے کافی ہے) حسبی اللہ عند المیزان (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے میزان کے پاس) حسبی اللہ عند الصراط (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے پل صراط کے پاس) حسبی اللہ لا إله إلا هو علیه توکلت وإلیه أنیب (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی پر میں نے اعتماد کیا ہے اور اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے)

1۔ نوادر الاصول، الکلمات العشر بعد الصلوۃ، جلد 1، صفحہ 217

نقاش نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: عہد کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے قریب ترین قرآن کی یہ دو آیتیں ہیں: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ سے آخر سورت تک ہم اسے بیان کر چکے ہیں۔ اور یوسف بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ قرآن کریم میں سے جو آخر میں نازل ہوئی: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اور یہ آیت ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(1)۔ اور ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف ذکر کیا ہے، جیسا کہ ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا پہلے نزول مکہ مکرمہ میں ہوا تھا۔ اس میں بعد ہے، کیونکہ یہ سورۃ مدنی ہے۔ واللہ اعلم

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ مصحف میں کوئی آیت ثبت نہ فرماتے تھے یہاں تک کہ اس پر دو آدمی شہادت دے دیں، پس انصار میں سے ایک آدمی سورت براءت کی آخری دو آیتیں لے کر آیا۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! میں تجھ سے ان پر کوئی بینہ (گواہ) طلب نہیں کروں گا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تھے، پس آپ نے ان دونوں کو لکھوا دیا۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: وہ آدمی حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، بلاشبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو اکیلے آپ کی شہادت کے ساتھ لکھوا دیا، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں اس کے صحیح ہونے پر دلیل قائم تھی، پس یہی قرینہ ہے جس نے دوسرے گواہ کی طلب سے مستغنی کر دیا، بخلاف سورۂ احزاب کی آیت کے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب:23)

کیونکہ یہ آیت حضرت زید اور حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہما کی شہادت کے ساتھ ثابت ہوئی کہ ان دونوں نے اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ یہ بحث مقدمۃ الکتاب میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ

تمت بالخیر

سورۃ توبہ کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ توبہ، جلد 2، صفحہ 419